PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

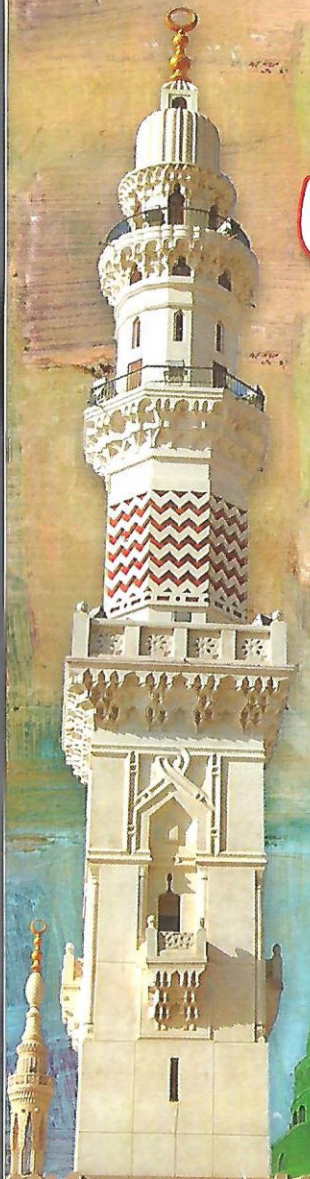

اُردو ڈائجسٹ

نومبر 2020ء
ربیع الاول/ربیع الثانی 1442ھ
جلد نمبر 60 شمارہ نمبر 11

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدرِ مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیرِ اعلیٰ: الطاف حسن قریشی

ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر

مجلسِ تحریر: سیّد عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان

مہتممِ طباعت: فاروق اعجاز قریشی

انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی

ڈیزائنر و کمپوزر: رانا محمد سلیم

سرورق: کاشف شہزاد

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk

شعبۂ اشتہارات: 0320-4437564

کاشرہ کرم: 0307-0060707

سالانہ خریداری 740 روپے ڈاک خرچ سمیت

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk

فون: +92-42-35290707

پاکستان 2115 کے بجائے 1375 روپے میں

بیرونِ ملک 120 امریکی ڈالر اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

اندرون و بیرونِ ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ

درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325,G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731

ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 130 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

پاکستان اپنے میگنا کارٹا کی تلاش میں

یہ ۲۰۱۵ء کی بات ہے، امریکی صدر بارک اُوباما ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئے۔ سوچ میں غرق تھے، اِس لیے راہ میں کھڑے فوجی کے سیلوٹ کا جواب دینا بھول گئے۔ جب یاد آیا، تو واپس اترے، فوجی کے پاس پہنچے، اُسے سیلوٹ کیا اور کچھ باتیں بھی کرتے رہے۔ باہمی احترام و چاہت پر مبنی بظاہر یہ معمولی واقعہ امریکا کے نظامِ حکومت کی سب سے بڑی خاصیت یہ عیاں کرتا ہے کہ امریکی نظام میں سیاسی راہنماؤں، فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ کے حقوق و فرائض متعین ہو چکے۔ حکومت کے یہ چاروں ستون عارضی ٹکراؤ سے قطع نظر کارِ مملکت مل جل کر، باہمی مشاورت اور ہم آہنگی سے چلاتے ہیں۔ یہی مشاورتی طریقِ کار امریکا کی ترقی و خوشحالی کا پیغام بھی بن گیا۔

اہلِ امریکا کو دنیاوی کامیابیاں عطا کرنے والا یہ حکومتی نظام مگر چند عشروں میں وضع نہیں ہوا، بلکہ اسے تخلیق کرتے ہوئے کئی صدیوں کا طویل صبر آزما اور جنگ و جدل سے بھرپور عرصہ لگا۔ تبھی یہ حکومتی نظام میٹھا پھل دینا شروع ہوا۔ امریکی، برطانوی اور دیگر بہت سی مغربی اقوام نے کانٹوں اور گڑھوں سے پُر راستے پر سفر کر کے ہی سیکھا کہ جرنیلوں، سیاست دانوں، سرکاری افسروں اور ججوں نے طاقت و اختیارات کو آپس میں کیونکر ایسے تقسیم کرنا ہے۔ یہ حکومتی نظام صدیوں کی جدوجہد کا ثمر ہے۔

مطالعۂ تاریخ آشکارا کرتا ہے کہ دس بارہ ہزار سال قبل جب انسانی بستیوں کا ظہور ہوا، تو وہاں جنگی سردار (War Lords) طاقت کا منبع تھے۔ جب شہری ریاستیں وجود میں آئیں، تو یہی جنگی سردار وہاں کے حاکم بن گئے۔ یہ حکمران فوج کے سپہ سالار بھی تھے اور عموماً قانون سے بالاتر ہوتے۔ اِن کا حکم ہی قانون کا درجہ رکھتا۔ یونان کی شہری ریاست، ایتھنز کا فوجی حاکم، قلیستھانس (Cleisthenes) پہلا حکمران ہے جس نے حکومتی نظام میں متوسط طبقے کو بھی شریک کیا

اور یوں جمہوریت کو متعارف کرایا۔ یہ ۵۰۷ قبل مسیح میں ایتھنز کے شاہی خاندان میں پیدا ہوا اور آمروں سے لڑتا ہوا ڈھیر عمری میں آخر ایتھنز کا حکمران بن گیا۔

یونانی ریاست کا شاہی خاندان چار قبائل پر مشتمل تھا۔ اس نے ان کی طاقت ختم کرنے کی خاطر انھیں دس قبائل میں تقسیم کر دیا۔ نیز اپنے رشتے داروں اور افرادِ شاہی خاندان کے بجائے عام شہریوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح عام آدمی بھی حکومتی نظام کا حصّہ بن گیا۔ آنے والے حکمران بھی قلیستھانس کے نقشِ قدم پر چلے اور عوام کو بتدریج نظامِ حکومت میں شریک کرتے رہے۔ ایتھنز میں رائج حکومتی نظام اسی لیے ''ایتھنی جمہوریت'' کہلاتا ہے۔ اس ماڈل کو رومیوں نے بھی اپنایا، مگر یہ خام جمہوریت تھی۔ وجہ یہ کہ اس جمہوری نظام میں صرف عام مرد ہی شامل ہو سکتے تھے۔ خواتین، غلام اور زمین ندر کھنے والے شہری جمہوری حقوق اور مراعات سے محروم رہتے۔

حقیقی معنی میں جمہوریت سیرتِ نبوی ﷺ میں نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ رسول اللہ ہونے کے باوجود اہم معاملات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشاورت فرماتے تھے۔ آپؐ نے اکثر مواقع پر صحابہؓ کے مشورے پر عمل فرمایا۔ غزوہ خندق اور صلح حدیبیہ نمایاں مثالیں ہیں۔ خلفائے راشدینؓ نے بھی آپؐ کی تقلید فرمائی اور مجلسِ شوریٰ کی بنیاد رکھی۔ خلفا تمام اہم فیصلے صحابہ کرامؓ کی مشاورت سے کرتے تھے۔ یہی نہیں، سچی جمہوریت کے مصداق کوئی بھی عام شخص سرِ عام خلیفۂ وقت پر تنقید کر سکتا تھا۔ یہ شاندار حکومتی نظام مگر چند عشروں بعد موروثی شہنشاہیت سے ملتے جلتے سسٹم میں بدل گیا۔

ایک ہزار سال قبل دنیا کے تقریباً سبھی حکمران جرنیل اور طاقت و اختیار کا سرچشمہ تھے۔ وہ وزراء و مشیران سے مشاورت ضرور کرتے، مگر قطعی فیصلہ ان کا اپنا ہی ہوتا جس سے سرتابی کی گنجائش نہیں تھی۔ مغرب میں بھی اسی قسم کا نظامِ حکومت رائج تھا جس میں فوجی حکمران المعروف بہ بادشاہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ وہ جب چاہتا، کسی بے گناہ کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیتا اور کوئی چوں بھی نہ کرتا۔ آخر اوائل گیارہویں صدی برطانیہ میں ایک انقلاب برپا ہوا۔

اِس عظیم تبدیلی کا اہم کردار جان تھا۔ وہ شاہ برطانیہ، ہنری دوم کا چوتھا اور آخری بیٹا تھا۔ ۱۱۶۶ء میں پیدا ہوا۔ باپ اسے عالم بنانا چاہتا تھا، اس لیے اُسے حکومت میں سے بھی کوئی حصّہ نہ دیا گیا، مگر تقدیرِ الٰہی کی کتاب میں کچھ اور ہی درج تھا۔ دو بھائی باپ سے بغاوت کر کے مارے گئے۔ تیسرا بھائی صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے مدِ مقابل آنے والا رچرڈ شیر دل تھا۔ وہ ۱۱۹۹ء میں ایک حادثے کا شکار ہو کر چل بسا، تو جان نیا برطانوی بادشاہ اور سپہ سالار فوج بن گیا۔

قدرت اِس پر مہربان تھی، مگر جان ظالم اور نااہل بادشاہ ثابت ہوا۔ وہ شاید اذیت پسند تھا لہٰذا معمولی باتوں پر رعایا کو سخت اذیتیں دے کر قتل کرا دیتا۔ پھر اس نے فرانس سے طویل جنگ چھیڑ دی۔ بڑھتے جنگی اخراجات پورے کرنے کی خاطر جاگیرداروں پر بھاری ٹیکس لگا دیے۔ تب صنعت کار اور کاروباری طبقے عنقا تھے۔ اس لیے جاگیردار ہی ٹیکسوں کا نشانہ بنے۔ جان فوجی حکمران تھا، اس باعث موصوف کی مطلق العنانیت عروج پر تھی۔

جاگیردار مگر فوجی سردار بھی ہوتے تھے۔ وہ حالتِ جنگ میں اپنے حاکم کو سپاہی مہیا کرتے۔ جب جان کا ظلم حد سے بڑھ گیا، تو جاگیرداروں نے اُن کے خلاف بغاوت کر دی۔ تمام فوجی حکمرانوں کی طرح جان نے بھی طاقت کے ذریعے یہ بغاوت کچلنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۱۲۱۵ء میں باغیوں نے لندن پر قبضہ کر لیا۔ اب جان باغی جاگیرداروں سے گفت و شنید کرنے پر مجبور ہو گیا۔ نتیجے میں ایک امن معاہدہ وجود میں آیا جسے ''میگنا کارٹا'' (عظیم معاہدہ) کہتے ہیں۔

میگنا کارٹا ۶۳ نکات پر مبنی تھا، مگر ان میں سے تین نکتے اہم قرار پائے۔ انھوں نے مغربی دنیا میں جامع حکومتی نظام، جمہوریت اور انسانی حقوق کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ تین نکات یہ ہیں:

۱۔ قانون سے کوئی بالاتر نہیں، بادشاہ بھی اس کے تابع ہے۔ یوں قانون سلطنت میں سب سے بڑی طاقت بن گیا۔

۲۔ ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ مقدمہ چلانے کے بعد اُسے مجرم یا بے گناہ قرار دیا جائے۔ اس نکتے کی رُو سے ہر شہری کو انصاف

کی قیمتی ترین دولت میسر آئی۔

۳۔ ایک عام آدمی بھی حقوق رکھتا ہے، گویا فوجی حکمران نے تحریری اقرار کیا کہ وہ بلامقدمہ کسی کو قتل نہیں کرا سکتا۔ یوں انسانی حقوق کی داغ بیل پڑ گئی۔

میگنا کارٹا بنیادی طور پر فوجی حکمران اور طبقۂ اشرافیہ (ایلیٹ) کے مابین معاہدہ تھا۔ اور انوکھی بات یہ کہ کچھ عرصے بعد ہی کالعدم کر دیا گیا۔ اِس نے مگر یورپ میں تبدیلی کی ہوا ضرور چلا دی۔ رفتہ رفتہ برطانیہ سمیت دیگر مغربی ممالک میں فوجی حکمرانوں کو قانون و انصاف کے دائرۂ کار میں لایا جانے لگا۔ حکمرانوں نے سخت مزاحمت کی۔ اسی دوران کئی ممالک میں خانہ جنگیاں بھی ہوئیں، مگر میگنا کارٹا سے پھوٹی تبدیلی کی لہر جاری و ساری رہی۔ اِسی لہر نے مختلف ممالک میں سیاست دانوں اَور سیاسی جماعتوں کو جنم دیا۔ یوں ایک نیا ایلیٹ طبقہ سامنے آیا جو خود کو عوام کا نمائندہ قرار دینے لگا۔

ساڑھے سات سو برس تک زیادہ طاقت و اختیار پانے کی کشمکش فوجی حکمرانوں اور دیگر ایلیٹ طبقوں کے مابین جاری رہی۔ اس کھیل کا کلائمیکس بیسویں صدی میں آیا جب عالمی قوتوں کے مابین یکے بعد دیگرے دو خوفناک جنگیں ہوئی۔ آگ اور خون کے ان طوفانوں سے گزر کر ہی خصوصاً دنیائے مغرب میں وہ حکومتی نظام وضع ہوا جو آج مغربی ممالک میں مروج ہے۔ اس نظام میں طاقت و اختیارات چار قوتوں (سول، فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ) میں تقسیم کر دیے گئے اور انھیں پابند بنایا گیا کہ وہ کاروبارِ مملکت باہمی مشاورت سے انجام دیں۔ یہ حکومتی نظام خامیوں سے سو فی صد مبرا نہیں۔ مثلاً امریکا میں نسلی تعصب ختم نہ ہو سکا اور سرمایہ داری کی وجہ سے آمدن میں عدم توازن ملتا ہے، تاہم بیشتر ممالک میں دیگر نظاموں کی نسبت یہ ایلیٹ طبقات کے لیے سود مند ثابت ہوا۔

اس حکومتی نظام کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ اُس کے ذریعے عوام کو بھی زیادہ حقوق میسر آئے اور آزادی و خودمختاری نصیب ہوئی۔ انھیں آگے بڑھنے کے مواقع ملے۔ چنانچہ ایک یتیم بچہ، بارک اوباما امریکا کا صدر بن گیا۔ جبکہ ایک سب انسپکٹر کی بیٹی اور ریستوران میں ویٹرس رہنے والی جیسنڈا آرڈن وزیرِاعظم نیوزی لینڈ بننے میں کامیاب رہی۔

گویا ایلیٹ طبقات کے پروردہ اِس نظامِ حکومت میں دولت و اثر و رسوخ سے عاری عام آدمی بھی طاقت و اختیار پا سکتا ہے، مگر ہر ایک کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ جرنیلوں کا بنیادی کام دفاعِ وطن کرنا ہے۔ سیاست دان اَور بیوروکریسی انتظامِ حکومت چلاتے اور عدلیہ آئین و قانون کی تشریح کرتی ہے۔ دورِ حاضر میں میڈیا بھی اس نظام کا ایک ستون بن چکا جس کی ذمے داری عوام کے سامنے سچ اور جھوٹ لانا ہے۔

پاکستان بھی اپنے میگنا کارٹا کی تلاش میں ہے..... ایک ایسا نظامِ حکومت جس میں مقتدر قوتیں محاذ آرائی اور تصادم سے گریز کرتے ہوئے طاقت اور اختیارات کی باہمی تقسیم کر لیں اور پھر اپنے فرائض انجام دیں۔ یہ حکومتی نظام ملک و قوم کی سلامتی، ترقی اور خوش حالی کا ضامن بھی بن جائے گا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ماضی کی غلطیاں اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کی روش پسِ پشت ڈال کر مستقبل کو سنوارا جائے۔ باہمی لڑائیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، محبت و دوستی کے بجائے نفرت و دشمنی ہی بڑھتی ہے۔ ہمارے اربابِ بست و کشاد کیا تاریخ سے سبق سیکھ پائیں گے؟

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

فہرست

نومبر ۲۰۲۰ء

کچھ اپنی زبان میں

قوم کے علم ودانش کا ارتقاء......قوم کے اندر یکجہتی پیدا کرنے میں زبان کلیدی کردار ادا کرتی ہے — الطاف حسن قریشی — 10

ہم کہاں کھڑے ہیں

گرجتے بادلوں سے رحمتوں کی بارش تک......اُبھرتے ہوئے منظر نامے کا تجزیہ — الطاف حسن قریشی — 14

سیرتِ رسول ﷺ

رؤف ورحیم، ہمارے حضورؐ......رسول اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کا پُرنُور و دلنشیں تذکرہ — مولانا امیر حمزہ — 25

اسلامی تاریخ

انطاکیہ سے بیت المقدس کا خونیں سفر......جب یورپی درندوں نے خونریزی کا ریکارڈ قائم کر دیا — محسن فارانی — 33

معاشیات

عالمی بینک......دورِ حاضر میں بین الاقوامی بینکاری نظام لُوٹ مار کے پیسے کا گڑھ بن چکا — ابو صائمہ — 41

اقوامِ عالم

چین جو میں نے دیکھا......پاکستانی سفارتکار کے چین میں تعیناتی کے دوران مشاہدے و تجربات — مدثر تیپو — 47

عالم تمام

افغانستان کی تقدیر چھے ہاتھوں میں......تین مختلف ممالک کے راہنما مگر تعلیمی ادارے ایک — عبدالہادی خان — 51

"بابری مسجد کے نیچے مندر نہیں مساجد تھیں" — 57

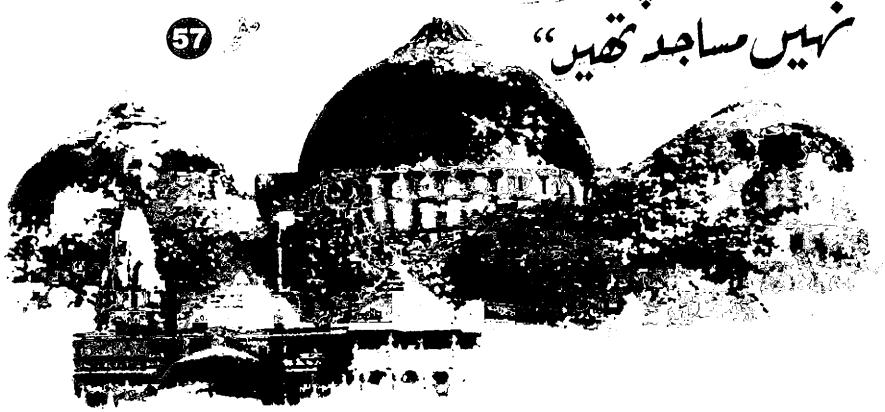

شمعیں ہیں فروزاں!
صفحہ 92

علامہ محمد اقبالؒ
صفحہ 89

انکشافات

بابری مسجد کے نیچے مندر نہیں مساجد تھیں...... سنگھ پریوار کی مکّاری عیاں کرتا سنسنی خیز تذکرہ — سید عاصم محمود 57

اقبالیات

روشن ضمیر، مردِ مومن...... شاعرِ مشرق کی فکران کی نثری تصانیف کی روشنی میں — جسٹس (ر) سید افضل حیدر 89

کشمیریات

شمعیں ہیں فروزاں...... تحریکِ آزادی میں عزم و ہمت کی پیکر یہ مائیں، بہنیں، بیٹیاں — بیگم تنویر لطیف (تمغۂ امتیاز) 92

طب و صحت

۵۰ سال تک جوان رہیں...... مثبت طرزِ زندگی آپ کی عمر کو کئی سال پیچھے دھکیل سکتا ہے — سید عاصم محمود 73
گڈ بائے شوگر...... سارا کھیل قوتِ مدافعت اور مستقل مزاجی کا ہے اور کچھ مشکل نہیں — ایڈووکیٹ زاہد عرفان 105
آؤ تمہیں سانس دوں...... بچوں میں استھما کی بیماری حساس مگر قابلِ گرفت ہے — شیخ عبدالحمید عابد 132

آپ بیتی

کیوں نگری نگری پھرا مسافر؟...... جب قدریں بے قدر ہو جائیں تو قومیں ذلیل و خوار ہو جاتی ہیں — ڈاکٹر انیس الرحمن 121

افسانے/کہانیاں

وَلی...... اُس نے سنا تھا کہ مُرشد بھی رزق کی طرح ملتا ہے، سو وہ نکل کھڑا ہوا — مہ جبین رشید 69
زرد ماضی...... بچپن کے دوست تمام عمر انسان کی طاقت بن کر اس کے ساتھ چلتے ہیں — منیر احمد شیخ 85
کردار سازی...... وقت ایسا 'جج' ہے جو سب کچھ لکھا جاتا ہے اور باقیات تک نہیں مانتیں — اسماعیل رضا 147
سوہنا آلو...... وہ سرکاری افسر اور گاؤں کا چودھری تھا مگر بگڑے نام نے پیچھا نہ چھوڑا — شاہدہ لطیف 153
معمہ...... نوجوانی کا عشق انسان کو اندھا، گونگا اور بہرہ بنا دیتا ہے، مگر پچھتاوا مقدر بننا ضرور ہے — نعیم اقبال 165
پیاس...... ایک قیامت خدا بخش کے تعاقب میں تھی اور وہ بھاگ رہا تھا مگر پھر...... — مریم جاب 178

41 غریب ممالک سے لوٹی دولت کہاں جاتی ہے؟

پہاڑوں کی لڑکی

188

سُرخ آنکھیں

116

فخرِ پاکستان

پہاڑوں کی لڑکی..... اپنے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دیتی کرشمہ علی چترال کا غرور ہے — ارم ناز — 116

طنز و مزاح

تاریخی ہستیاں..... اُن شخصیات کا پُرلطف تذکرہ جو مشہور بھی ہیں اور دلچسپ بھی — محمد خالد اختر — 137

مولوی گڈو..... ایسے نام نہاد صاحب کا قہقہہ بار تذکرہ جو کھانے کی اشیاء دیکھتے ہی پہنچ جاتے — ڈاکٹر صفدر محمود — 169

غیر ملکی ادب

پہچان..... بلاشبہ وہ جنگل کا درندہ تھا مگر آج بھی اپنے محسن کو نہیں بھولا تھا — عذرا فردوس — 103

شکاریات

سُرخ آنکھیں..... خوفناک مگر مچھ کی اپنے پانچ ساتھیوں کا بدلہ لینے کی روح فرسا داستان — ڈیوڈ ہیرو — 188

گوشۂ خواتین

جانی دشمن..... صحت کو کھا جانے والے خفیہ ہتھیار آپ ہی کے باورچی خانے میں براجمان ہیں — ڈاکٹر اختر احمد — 198

معلومات

آیئے آگ لگائیں..... دیا سلائی سے پہلے انسان کیا کرتا تھا؟ ماچس کی دلچسپ کہانی — رانا محمد شاہد — 144

سماجیات

خواتین میں بڑھاپا ناممکن!..... ایسی عادات فوری ترک کر دیں جو آپ کی عمر کم کر رہی ہیں — فضل ربی — 175

تاریخ لاہور

کوس مینار..... وطنِ عزیز میں تاریخی مقامات کی بے قدری کے باوجود جو زندہ رہ گیا — محمد حسنات حمید — 185

حیوانیات

ہاتھی میرے ساتھی..... کیا یہ لحیم و جسیم جانور واقعی چیونٹی اور چوہے سے ڈرتا ہے؟ — اسد شریف — 160

مستقل سلسلے شعر و سخن 201 تبصرہ کتب 205 چمنِ خیال 212 مسکراہٹیں 215

تاریخی ہستیاں

صفحہ 137

50 سالِ مبارک ہو!

صفحہ 73

عام مینوئل کنواں 200,000/-

سولر پینل کنواں 300,000/-

گرین تھر فارم 350,000/-

تھر میں مسجد 100,0000/-

ہینڈ پمپ 20,000/-

بڑا ہینڈ پمپ 80,000/-

تھر میں سکول 250,000/-

بکری پال اسکیم 20,000/-

- پانی پلانا بہترین صدقہ جاریہ ہے
- آیئے تھر کے صحرا کو سرسبز بنائیں
- اپنے پیاروں کے ایصالِ ثواب اور صدقہ جاریہ کے لیے میٹھے پانی کے کنوئیں بنوائیں

علاج خدمت

ہیڈ آفس 449۔ جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

اسلام آباد آفس: المعراج حبیب ٹرسٹ ہسپتال 13 سپرنگ ویلی، بارہ کہو، اسلام آباد

Hepacol Corona Plus:

A product of natural herbs to control bacterial & viral infections including infection caused by Corona Virus. It can also be used to control acute & chronic cough. And chest infections.

Precautions:

- Avoid grease, spicy and sourish foods.
- Use fresh fruit and salad.
- Always use hot water.
- Do not take with other medicines.

خوراک

YUMNA

کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی

Customs Health Care Society

www.customshealthcaresociety.org.pk

اپنے عطیات کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کے آن لائن اکاؤنٹ میں جمع کروائیں

National Bank of Pakistan, Moon Market Branch, Allama Iqbal Town, Lahore!

Swift Code: NBPAPKKA02L

IBAN: PK76NBPA1887004011311614

Account #: (1887)4011311614

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

آدابِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کیا کرو
اور نہ بلند آواز سے رسول سے بات کیا کرو جیسا کہ تم ایک دوسرے سے کیا کرتے ہو
کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

(الحجرات 49:2)

☆☆☆

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اُس شخص کا ایمان اُس وقت تک کامل ہی نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی آدمی اپنی جان، اپنے مال، اپنے عزیز و اقارب، اپنے بہن بھائی، اپنے والدین، اپنے بال بچوں، اپنے خویش قبیلوں اور ہر چیز سے بڑھ کر میری ذات سے محبت نہیں کرتا۔

(بخاری، کتاب الایمان، سنن النسائی)

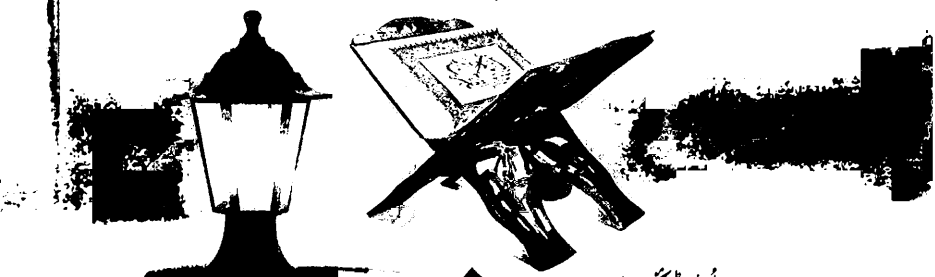

قومی علم و دانش کا ارتقا

اقوامِ عالم کی ذہنی اور مادی ترقی میں نظامِ تعلیم نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ صدیوں پر محیط تحقیق، مشاہدے اور تجربے نے یہ راز بھی فاش کیا ہے کہ جن ملکوں نے اپنی قومی زبان میں تعلیم دینے کا اہتمام کیا ہے، اُن کی ذہنی استعداد اور وحدتِ فکر میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ تحریکِ پاکستان میں اُردو زبان قوتِ متحرکہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اِسی بنیاد پر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اعلان فرمایا تھا کہ اُردو، صرف اُردو ریاست کی زبان ہوگی، مگر اُن کی یہ آرزو عملی حقیقت میں نہ ڈھل سکی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد مسٹر بھٹو نے جو متفقہ دستور دیا، اُس میں طے پایا تھا کہ اُردو کو عملی طور پر سرکاری اور مملکت کی زبان کا درجہ دینے کے لیے دس برسوں کے اندر اندر تمام انتظامات کیے جائیں گے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا اور دفتروں، عدالتوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں انگریزی کی حکمرانی قائم رہی۔ اِس پر ۲۰۱۵ء میں سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس جناب جواد ایس خواجہ کی سربراہی میں بینچ نے فیصلہ دیا کہ فوری طور پر اُردو کو سرکاری دفتروں میں رائج کیا جائے۔ اِس فیصلے پر بھی پانچ سال گزر چکے ہیں اور کوئی پیش رفت نظر نہیں آئی جس کے باعث قوم کی ذہنی اور تخلیقی نشوونما رکی ہوئی ہے۔

آج ہماری بدبختی کا عالم یہ ہے کہ شہروں اور قصبوں میں انگلش میڈیم اسکول بڑے پیمانے پر کھلتے جا رہے ہیں اور جو طلبہ اور طالبات اُن میں تعلیم پا رہے ہیں، وہ اُردو زبان سے یکسر نابلد ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انٹرنیٹ کے ذریعے انگریزی ہمارے گھروں، اداروں اور دفتروں کا ایک ناگزیر حصہ بن گئی ہے۔ ہماری عدالتوں میں جو قانونی بحثیں ہوتی ہیں اور وہاں جو فیصلے صادر ہوتے ہیں، اُنھیں عوام سمجھنے سے اِس لیے قاصر ہیں کہ وہ انگریزی میں ہیں۔ بیشتر جج صاحبان انگریزی میں فیصلے لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ دُوسروں کے محتاج رہتے ہیں جس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایک مصنوعی عدالتی نظام بڑی مدت سے رائج ہے جو تیزی سے انصاف کے تقاضے پورے کرنے سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ اِسی طرح سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں خط کتابت بھی انگریزی میں ہوتی ہے اور فائلوں پر فیصلے بھی اِسی زبان میں ہوتے ہیں۔ اہل کاروں اور اَفسروں کی زبان پر جوں جوں گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے، وہ مکھی پر مکھی مارنے کی پالیسی سے چمٹے ہوئے ہیں اور اپنا ذہن استعمال کرنے کی استعداد سے محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ گورننس کا پورا انفراسٹرکچر بیٹھتا جارہا ہے اور عوام در دَر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں۔

صدیوں کے تجربات اِس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ بچے سب سے زیادہ اُس زبان میں سیکھتے ہیں جسے وہ اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ بدقسمتی سے ہم نے سرکاری اسکولوں میں بھی ابتدائی جماعتوں سے انگریزی نافذ کردی ہے جبکہ اِس زبان کو پڑھانے والے اساتذہ مطلوبہ تعداد میں دستیاب ہی نہیں۔ بلاشبہ زیادہ تر بچے بیک وقت کئی زبانیں سیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، مگر اِن کی اِس خداداد صلاحیت کے صحیح طور پر استعمال کے انتظامات نہایت معیاری ہونے چاہئیں۔ سرکاری تعلیمی ادارے ہوں یا بہت مہنگے نجی اسکول، اِن سب میں رَٹا چلتا ہے۔ بچے فرفر انگریزی بولنا سیکھ لیتے ہیں، مگر وہ الفاظ کی معنویت تک پہنچ پاتے ہیں نہ تخلیقی عمل سے گزر سکتے ہیں۔ دراصل کسی تصور (concept) کو آپ اپنی زبان ہی میں گرفت میں لاکر اِس میں جدت بھی پیدا کرسکتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں انگریزی کا رواج بہت زیادہ بڑھ جانے سے ہمارے اندر اَچھے سائنس دان، ریاضی دان، انجینئر، فلسفی اور بلند پایہ محقق شاذونادر ہی پیدا ہورہے ہیں۔ ہمارے مایہ ناز اَیٹمی سائنس دان جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اِس حقیقت کا بار بار اِظہار کرتے پائے گئے ہیں کہ مَیں نے بھوپال کے عام اسکول میں جو اُردو زَبان سیکھی تھی، اِس کی بدولت سائنس کے تصورات اَپنی گرفت میں لے آیا تھا اور پھر مَیں نے اُن کی عملی صورت گری میں نئے نئے طریقے ایجاد کیے تھے۔

ہماری تعلیم گاہوں اور تمام قومی اداروں میں انگریزی زبان کے حاوی ہونے کے بڑے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ایک طرف طبقات کی اجارہ داری قائم ہوگئی ہے اور دُوسری طرف ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اپنے مذہب و ثقافت سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں۔ اُردو زَبان کے علاوہ ہماری علاقائی زبانوں میں قدیم علوم وفنون اور تہذیب و ثقافت کے جو بیش بہا خزینے ہیں، اُن سے فیض یاب ہونے کا عمل بڑی حد تک سست پڑ گیا ہے اور کہیں کہیں بالکل بند ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نئی نسل اپنی تہذیبی میراث سے کٹتی جارہی ہے اور مغربی اطوار کو اپنانے میں غیر معمولی فخر محسوس کرنے لگی ہے۔ یہ ہمارا بہت بڑا قومی نقصان ہے جو روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے۔ سب سے زیادہ دُکھ کی بات یہ ہے کہ چار سُو ایک ہی صدا سننے میں آرہی ہے کہ صرف انگریزی زبان کامیابی کی کلید ہے، چنانچہ اِسے فرفر بولنے کی سرتوڑ کوششیں جاری ہیں جو تخلیقی خوشبو سے محروم ہیں۔

قوم کے اندر یک جہتی پیدا کرنے میں قومی زبان کلیدی کردار اَدا کرتی ہے۔ ہم اب تک اُردو زَبان کو قومی زبان کا درجہ دینے میں بری طرح ناکام رہے ہیں اور علاقائی زبانوں کی نشوونما سے بھی لاتعلق نظر آتے ہیں۔ اِس کوتاہی کے باعث ہمارے ملک میں طرح طرح کے نظام ہائے تعلیم رائج ہیں اور یوں تقسیم در تقسیم کا عمل گنجلک ہوتا جارہا ہے۔ اِس تلخ حقیقت کے باوجود کہ ہمارے اسّی فی صد طلبہ انگریزی میں فیل ہوجانے کے سبب تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے نہیں کر پاتے، ہم انگریزی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے پر مُصر ہیں۔ اعلیٰ سول سروس کے امتحانات میں ناکامی کی

شرح آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے جو اُمیدوار کامیاب ہوتے ہیں، وہ عوام کے مزاج، اُن کی مشکلات اور اُن کے معاشرتی رویوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ذمے داری کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں، تو حکمرانوں کی طرح فیصلے کرتے اور اُن پر اجنبیوں کی طرح عمل درآمد کرتے ہیں۔ اگر اعلیٰ سول سروس کے امتحانات اُردو زبان میں لیے جائیں، تو انتظامی مشینری میں ایک زبردست انقلاب آجائے گا اور ذہنی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ ہمارے اعلیٰ افسر بھی لکیر کے فقیر ہیں اور عوامی حقیقتوں سے یکسر بے خبر۔ ہمارے نظامِ حکومت کی بنیادوں میں عوام سے فاصلہ رکھنے اور انھیں مسائل میں الجھائے رکھنے کے ڈائنامائٹ بچھے ہوئے ہیں۔

اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی راہ میں بعض دشواریوں کا ذکر ہم عرصۂ دراز سے سنتے آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو میں قانون کی کتابیں دستیاب ہیں نہ دفتری اصطلاحات کا خزینہ میسر ہے۔ سائنسی مضامین کی نصابی کتب بھی بازار سے نہیں ملتیں۔ اِن کے علاوہ اُردو زبان میں انجینئرنگ اور میڈیکل کے مضامین پڑھانے والے اساتذہ بھی کم یاب ہیں۔ ہمارے خیال میں فیصلہ کُن عامل طلب اور رسد (Demand & Supply) کا ہے۔ اگر ہم قومی سطح پر فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم صرف اُردو زبان میں دیں گے، تو کتابوں اور اساتذہ کی تیاری کا عمل ازخود بڑی تیزی سے شروع ہو جائے گا۔ ایک زمانے میں دفتری اصطلاحات اور ایف ایس سی تک سائنسی مضامین کی کتابیں دستیاب تھیں اور سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں ایسے ادارے قائم تھے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے اُردو زبان میں کتابیں تیار کر پا رہے تھے۔ پھر وہ طبقۂ فکر غالب آ گیا جو انگریزی زبان کو ہر بلندی تک پہنچنے کا پروانہ سمجھتا ہے، چنانچہ اُردو یا مقامی زبان میں تعلیم دینے کا سلسلہ ہر سطح پر رک گیا ہے۔ آج تو والدین بھی اُردو زبان میں تعلیم دینے کے عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اِن کی اولاد انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کر کے ہی زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکے گی۔

دراصل مختلف طبقوں کے کاروباری اور بعض دوسرے مفادات نے اِس تاثر کو عام کیا ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے تعلقات مستحکم کرنے کے لیے انگریزی میں تعلیم کا حصول ناگزیر ہو گیا ہے۔ انگریزی اور دُوسری غیر ملکی زبانوں کی اہمیت سے انکار نہیں، مگر اِن میں اچھی مہارت حاصل کرنے کے لیے بھی اپنی قومی زبان پر دسترس ازبس ضروری ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ جو طلبہ اپنی قومی زبان پر عبور رکھتے ہیں، وہ غیر ملکی زبان جلد سیکھ لیتے اور اِن میں بیان کردہ تصورات اور خیالات کو بہتر انداز میں سمجھنے اور گرفت میں لینے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اِس امر کا اہتمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر کیا جانا چاہیے کہ جو طلبہ اور اساتذہ باہر کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم و تحقیق کے حصول کے خواہش مند ہوں، اُنھیں انگریزی میں اعلیٰ معیار کے خصوصی کورسز سے گزارا جائے۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے انگریزی تعلیم کا معیار اِس قدر پست ہے کہ بالعموم اساتذہ انگریزی کے مطالب اُردو زبان میں سمجھاتے ہیں اور

طلبہ اِن کا رٹا لگا لیتے ہیں۔ انگریزی کا اختیاری مضمون پڑھانے کے لیے بہت قابل اساتذہ تیار کیے جائیں جو طلبہ میں اِس زبان کی وسعت اور گہرائی کا صحیح شعور دے سکیں اور صدیوں پر محیط لسانی تجربات سے حقیقی معنوں میں فیض یاب ہو سکیں۔

قومی علم و دانش کی صحیح خطوط پر نشوونما کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اُردو زبان کا مقامی زبانوں کے ساتھ رشتہ بہت مضبوط کیا جائے۔ جب تحریکِ پاکستان پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی، اُس وقت اُردو زبان زیادہ تر گنگا جمنی آب و ہوا سے متاثر تھی۔ مسلمانوں کی آزاد مملکت وجود میں آنے کے بعد اُردو زبان کو پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور مشرقی بنگال میں ایک نیا تہذیبی ماحول میسر آیا، اِس لیے فطری ارتقا کے طور پر اِس میں علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل ہونے چاہئیں تھے اور اِسے اِس علاقے کے ادب اور لوک کہانیوں سے اپنا دامن بھر لینا چاہیے تھا۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ اب ہمیں اِس کی تلافی کرنے کے لیے قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے درمیان قربتیں بڑھانے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اُردو زبان میں مسلمانوں کا جو علمی، دینی، ثقافتی اور تاریخی گراں قدر سرمایہ ہے، اِسے علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کا قومی سطح پر اہتمام ازبس ضروری ہے۔ اِس عمل سے علاقائی زبانوں میں پایا جانے والا قیمتی خزینہ اُردو زبان میں منتقل کیا جائے۔ اِس طرح قوم کو یک جان بنا دینے کا عمل تیز تر ہوگا اور علمی استعداد میں زبردست اضافہ ہوگا، ذہنوں اور دِلوں میں کشادگی پیدا ہوگی، قومی رویوں میں تہذیبی رنگ نمایاں ہوگا اور اَپنائیت اور یگانگت فروغ پائے گی جو تعمیر و ترقی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

ہمارے بچے قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں، اِس لیے والدین کو اُن کی فطری نشوونما میں غیر معمولی دلچسپی لینا چاہیے۔ غلط اور گمراہ کُن خیالات میں بھٹکتے رہنے کے بجائے اُنھیں عالمی تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزی کے بجائے اپنی قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر پوری توجہ مرکوز کر دینا ہوگی کہ اِس تبدیلی سے ایسے نوجوان تیار ہوں گے جن میں خود اعتمادی ہوگی اور وہ تخلیقی اپج اور پیداواری صلاحیت سے بہرہ ور ہوں گے۔ یہ پُراعتماد نوجوان معاشرے میں پژمردگی اور مایوسی پھیلانے کے بجائے، اِس میں ایک نیا جوش اور ایک نئی روح پھونک دیں گے۔ یہ تو ہمارے سامنے کی مثال ہے کہ چین، ایران اور ترکی نے انگریزی کے بجائے اپنی قومی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی بدولت ترقی کی ہے۔ ہمیں اِس امر کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ ہمارا خطہ کن کن زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ چین ابھرتی ہوئی سپر پاور ہے جس کے ساتھ ہمارے تعلقات غیر معمولی نوعیت کے ہیں، چنانچہ ہمارے نظامِ تعلیم کے اندر چینی زبان سیکھنے کے اَن گنت اور پُرکشش مواقع ہونے چاہئیں۔ اِسی طرح عربی، فارسی اور ترکی زبان کا فروغ بھی ہمارے عظیم تر قومی مفاد میں ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں اِن زبانوں کی تعلیم کے خصوصی انتظامات کیے جائیں اور بنگلہ زبان پر بھی توجہ دی جائے کہ ایک روز پاکستان اور بنگلہ دیش کو پھر سے ہم سفر بننا ہے۔ (ان شاءاللہ)

الطاف حسن قریشی

گرجتے بادلوں سے رحمت کی بارش تک

حکومت اور اپوزیشن کے مابین الفاظ کی گھن گرج کے ساتھ جو اعصاب شکن جنگ شروع ہوئی تھی، اِس میں اب خرمن کو خاکستر کر دینے والی بجلیاں کوند رہی ہیں جبکہ یہ رحمتوں کی بارشوں کا مہینہ بھی ہے۔

اُبھرتے ہوئے منظرنامے کا تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

۔۔۔ سیاسی کلچر میں سنجیدگی اور متانت کا عنصر بالعموم کم رہا ہے۔ پاکستان بنا، تو وزیرِاعظم لیاقت علی خاں اور جناب حسین شہید سہروردی کے درمیان سیاسی کش مکش دیکھنے میں آئی جس سے ہماری قومی سیاست بڑی متاثر ہوئی۔ مشرقی بنگال میں وزیرِاعلیٰ خواجہ ناظم الدین اور سہروردی ایک دوسرے کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوتے گئے۔ پنجاب میں وزیرِاعلیٰ اِفتخار حسین ممدوٹ اور میاں ممتاز دَولتانہ شدید مخالفت پر اتر آئے جس نے سیاسی ماحول میں کشیدگی پیدا کی اور سیاسی جماعتوں میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوا۔ سندھ کا صوبہ بھی آغاز ہی سے سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کی آماجگاہ بنا رہا۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالقیوم خاں کی جابرانہ طرزِ حکومت کے خلاف پیر مانکی شریف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بلوچستان میں بھی سیاسی آویزش کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ نئی مملکت میں سیاسی کھچاؤ کا دَر آنا صاحبانِ فکرونظر کے لیے بڑی تشویش کا باعث تھا۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں اور گفتگوؤں میں اربابِ سیاست کو اِن کی روش سے پیدا ہونے والے خطرات سے بار بار آگاہ کیا، وارننگ بھی دی، مگر اقتدار کی ہوس جمہوری عمل پر منفی اثرات مرتب کرتی رہی جس کے باعث سول اور ملٹری بیوروکریسی اختیارات کی مالک بنتی گئی جسے اعلیٰ ترین عدلیہ کے سربراہ کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اِس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں گورنر جنرل ملک غلام محمد نے پہلی دستور ساز اسمبلی اُس وقت تحلیل کی جب وہ وزیرِاعظم محمد علی بوگرا کی قیادت میں ایک انتہائی متوازن دستور منظور کر چکی تھی۔ وہ ایک ایسا دستور تھا جس میں دو اَیوان تجویز کیے گئے تھے۔ ایوانِ زیریں میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی گئی تھی اور مشرقی بنگال کے حصّے میں ۵۶ فی صد نشستیں آتی تھیں۔ ایوانِ بالا میں مغربی پاکستان میں واقع چار صوبوں کو اکثریت حاصل تھی۔ یہ منصفانہ بندوبست مغربی پاکستان کی سیاسی اور غیرسیاسی طاقتوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دستور ساز اسمبلی ۱۹۵۴ء کے دستور پر بحث کر رہی تھی، تو اُس وقت فوج کے کمانڈر اِن چیف جنرل محمد ایوب خاں لندن کے ایک ہوٹل میں ایک نیا دستوری خاکہ ترتیب دے رہے تھے۔

حالات ایک ایسا رخ اختیار کر گئے جس میں سب سے پہلے دستور ساز اسمبلی فارغ کر دی گئی جس نے قومی اسمبلی میں مشرقی بنگال کی اکثریت قائم کی تھی۔ فیڈرل کورٹ کے فل بینچ نے چیف جسٹس محمد منیر کی سربراہی میں گورنر جنرل کے اِس اقدام کو جائز قرار دیتے ہوئے نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کا مشورہ دیا۔ اِس نئی دستور ساز اسمبلی نے وہی دستور منظور کر لیا جس کا بنیادی خاکہ کمانڈر اِن چیف جنرل ایوب خاں نے تیار کیا تھا۔ اُس وقت جنرل ایوب خاں وزیرِ دفاع کی حیثیت سے ہنرمندوں کی کابینہ میں شامل کر لیے گئے۔ اُن کی ملازمت میں چار سال کی توسیع بھی ہو گئی تھی۔ کایاں میجر جنرل (ر) اسکندر مرزا مفلوج غلام محمد کو گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر صدرِ مملکت کے منصب پر فائز ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اُنھوں نے سیاسی ساز باز کے ذریعے چار وُزرائے اعظم فارغ کیے، اِقتدار کے نشے میں ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات مارشل لا نافذ کر دیا اور وہ آئین توڑ ڈالا جو پاکستان کے منتخب عوامی نمائندوں نے غیر معمولی سیاسی مفاہمت کے بعد منظور کیا تھا۔ دونوں بازوؤں کے درمیان سمجھوتہ کرانے میں جناب حسین شہید سہروردی، جناب اے کے فضل الحق اور چودھری محمد علی نے بہت فعال کردار اَدا کیا تھا۔ قوم نے اِس کے نفاذ پر غیر معمولی جوش و خروش اور فرحت و انبساط کا مظاہرہ کیا کہ اِن کا ملک تاجِ برطانیہ سے مکمل طور پر آزاد ہو گیا ہے اور اِسلامی جمہوریہ پاکستان کے قالب میں ڈھل گیا ہے۔ جنرل ایوب خاں جنہیں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا تھا، اُنھوں نے بیس روز بعد صدر اسکندر مرزا کو صدارت کے منصب سے فارغ کر کے لندن روانہ کر دیا۔ وہاں وہ ایک ہوٹل میں ملازمت کرتے اور اَپنے کیے کی سزا بھگتتے رہے۔ اُنھیں پاکستان میں دفن کرنے کی بھی اجازت نہیں ملی تھی۔

☆☆☆

مارشل لا کے نفاذ کی دوسری شام چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خاں نے قوم سے خطاب کیا۔ مَیں اُن دنوں رحمٰن پورہ، لاہور میں رہائش پزیر اور ایم اے علمِ سیاست کا طالبِ علم تھا۔ مَیں نے اہلِ محلہ کے ساتھ اُن کی تقریر سنی جس میں سیاست دانوں کو ملکی پس ماندگی، رشوت خوری، انتظامی بدنظمی اور اسمگلنگ کا ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔ اُن کا ارشاد تھا کہ پارلیمانی نظام نے سیاسی عدم استحکام پیدا کیا ہے، اِس لیے صدارتی نظام رائج کیا جائے گا۔ یہ مژدہ بھی سنایا کہ جمہوریت ہمارے عوام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی، چنانچہ ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ ہو گیا ہے اور سیاسی جماعتیں غیر قانونی قرار دے دی گئی ہیں۔ ملک میں صفائی اور ستھرائی کی فضا قائم کرنے کے لیے حکم صادر ہوا کہ دکانوں پر جالیاں لگانا لازمی ہو گا اور کسی قسم کی ملاوٹ برداشت نہیں کی جائے گی۔ اہلِ محلہ اِس تقریر سے بہت خوش ہوئے جبکہ میرا دِل شدتِ غم سے بیٹھا جا رہا تھا۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ اِس عمل کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو جائے گا کیونکہ وہ بنیاد ڈھا دی گئی ہے جس پر اہلِ سیاست نے ایک ساتھ رہنے کی عمارت اٹھائی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ صدارتی نظام علیحدگی کے عمل میں بڑی تیزی لے آئے گا اور فوجی حکومت آخرکار ایک خوفناک تصادم کو جنم دے گی۔ اہلِ محلہ مجھ سے بہت ناراض ہوئے اور مجھے سنکی سمجھ بیٹھے۔

مَیں یہی تاثرات اَپنے ہم جماعتوں سے بھی بیان کرتا رہا۔ کچھ اتفاق کرتے جبکہ زیادہ تر مارشل لا کی خوبیاں گنواتے اور سیاست دانوں کی نااہلیوں کو ہدفِ تنقید بناتے۔ یہی کچھ معاملہ صدارتی نظام کی اچھائیوں اور خامیوں پر بحث کے حوالے سے تھا۔ میرے بعض ہم جماعت دلیل دیتے کہ امریکا نے صدارتی نظام کے تحت ہی حیرت انگیز ترقی

کی ہے اور سپر پاور کا بلند ترین مقام حاصل کیا ہے۔ میں اُن سے کہتا کہ پاکستان کا جغرافیہ صدارتی نظام کے سراسر خلاف ہے۔ اِس کے دونوں بازو ایک ہزار میل کی دوری پر واقع ہیں۔ ایک بازو کی آبادی زیادہ ہے جبکہ دوسرے بازو کا معاشی اور دفاعی بیس (base) بہت مستحکم ہے۔ جنرل ایوب خاں کم از کم بیس برس کی حکمرانی کا منصوبہ لے کر آئے ہیں جو بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر قائم ہوگا جس پر سول بیوروکریسی حاوی ہوگی۔ یہ اشارے بھی مل رہے ہیں کہ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان ہی اسمبلیوں اور صدر کو منتخب کریں گے۔ حکومت کے لیے اُن کے ووٹ حاصل کر لینا بہت سہل ہوگا۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ مسلح افواج کا بیس مغربی پاکستان ہے اور اِس کی بیوروکریسی مشرقی پاکستان میں بڑے عہدوں پر فائز ہے۔ اقتصادی سرگرمیاں بھی زیادہ تر مغربی پاکستان میں نظر آتی ہیں۔ صدارتی نظام کے اندر زیادہ تر اختیارات صدر کی ذات میں مرکوز ہوتے ہیں اور اگر جنرل ایوب خاں لمبے عرصے کے لیے صدارت کے منصب پر فائز رہتے ہیں، تو اِس کا مطلب ہوگا کہ تمام اختیارات مغربی پاکستان سے استعمال کیے جائیں گے اور مشرقی پاکستان اپنے آپ کو مغربی پاکستان کی کالونی سمجھنے پر مجبور ہوگا۔ وہاں کے عوام شدید احساسِ محرومی کا شکار ہو کر علیحدگی کے راستے تلاش کریں گے جس میں بھارت بہت مددگار ثابت ہوگا۔

☆☆☆

جون ۱۹۵۹ء میں ایم اے فائنل کے امتحانات ہونے والے تھے۔ دوسرے پرچے کا تعلق مطالعۂ پاکستان سے تھا جس میں پاس ہونا لازمی تھا۔ جب مَیں نے امتحانی پرچہ پڑھنا شروع کیا، تو پہلا سوال ہی یہ تھا کہ آپ پاکستان کے لیے صدارتی نظام بہتر سمجھتے ہیں یا پارلیمانی نظام؟ مَیں نے جواب کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اگر پارلیمانی نظام کے حق میں لکھتا ہوں، تو امتحان میں فیل ہو جاؤں گا اور زندگی میں آگے بڑھنے کا دیرینہ خواب چکنا چُور ہو جائے گا۔ مَیں یونیورسٹی تک پہنچنے کے لیے تین تین ملازمتیں کرتا آیا تھا۔ سخت گیر مارشل لا میں کسی ممتحن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ پیپر کی مارکنگ آزادی اَور علمی دیانت سے کرے گا۔ اِن تمام خدشات کے باوجود مَیں نے اپنے ضمیر کا ساتھ دیا اور پارلیمانی نظام کو دلائل کے ساتھ پاکستان کے لیے بہت موزوں قرار دیا۔ کمرۂ امتحان سے باہر نکلا، تو ہم جماعتوں نے حسبِ عادت پوچھا کہ پہلے سوال کا کیا جواب لکھا ہے؟ مَیں نے کہا پارلیمانی نظام کے حق میں لکھ آیا ہوں۔ وہ سب کہنے لگے کہ اِس پرچے میں تو تمہارا فیل ہو جانا یقینی ہے۔ ڈیڑھ ماہ بعد نتیجہ آیا، تو مَیں نے اپنے ہم جماعت آغا ناصر کے ساتھ یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور میرے اِس اِعتماد کو بڑی تقویت پہنچی تھی کہ حالات کتنے ہی مشکل اور ناموافق کیوں نہ ہوں، صحیح بات ہی کہنی چاہیے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے اِس پیپر کے بیرونی ممتحن ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ علم السیاست کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر جی ڈبلیو چودھری تھے۔ اُنھوں نے پچاس کی دھائی میں پاکستان کے آئین اور سیاسی نشیب و فراز پر بہت عمدہ تحقیقی کتاب لکھی تھی جس کا مَیں نے بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور اَپنے امتحانی پرچے میں اُس کتاب سے متعدد حوالے دیے تھے۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے نفاذ سے میرے ذہن میں مشرقی پاکستان کے حوالے سے جو خدشات پیدا ہوئے تھے، وہ بدقسمتی سے ایک ایک کر کے درست ثابت ہوئے۔ مشرقی بازو کے اندر شدید احساسِ محرومی کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے چھے نکاتی فارمولا پیش کیا جو سیاسی ہلچل پیدا کرتا گیا۔ مغربی پاکستان میں طلبہ اور سیاسی جماعتیں احتجاج پر

کمر بستہ ہوگئیں۔ ۱۹۶۸ء کے آخری مہینوں میں ڈیک (ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی) نواب زادہ نصراللہ خاں کی قیادت میں قائم ہو چکی تھی اور حالات میں شدید محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ایوب خاں نے نواب زادہ نصراللہ کو گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ اگر یہی دعوت ایک سال پہلے دی جاتی، تو مذاکرات کی کامیابی کے امکانات بہت روشن تھے۔ دراصل سیاسی معاملات میں بروقت اور دُرست فیصلے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ گول میز کانفرنس کا انعقاد ۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء کی صبح راولپنڈی میں ہوا اور اِس دوران منفی قوتیں پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو چکی تھیں اور اُنھوں نے راؤنڈ ٹیبل کا بائیکاٹ کیا جس میں مسٹر بھٹو پیش پیش تھے۔ صدر ایوب خاں نے ڈیک کے دونوں مطالبات منظور کر لیے کہ پارلیمانی نظام بحال کر دیا جائے گا اور آئندہ انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے، مگر اُس وقت حالات اِن مطالبات سے کہیں آگے نکل چکے تھے۔ ایوب خاں کے جانے کے بعد جنرل آغا یحییٰ خاں نے ملک میں دوسری بار مارشل لا نافذ کر دیا، ۱۹۶۲ء کا دستور منسوخ کر ڈالا اور آگے چل کر دستور بنانے کے لیے قومی اسمبلی کے انتخاب کا طریقہ کار رائج کر دیا۔

☆☆☆

گزرے ہوئے سیاسی حالات، آج کی غیر یقینی صورتِ حال سے بہت گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ اِس لیے اِن کو ٹھیک طور پر سمجھنا اور اِن سے سبق سیکھنا ازبس ضروری ہے۔ آغا یحییٰ کے مارشل لا میں قومی سیاست شیخ مجیب الرحمٰن اور ذُوالفقار علی بھٹو کے گرد گھومتی رہی۔ جنرل یحییٰ کی شراب نوشی اور عیاشی بھری زندگی نے اُن سے بروقت اور صائب فیصلے کرنے کی صلاحیت ساقط کر دی تھی اور اِن کی غیر حقیقت پسندانہ اور شاطرانہ پالیسیوں نے مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو کو حد سے زیادہ خودسر بنا یا تھا۔ ایک سال پر محیط انتخابی مہم نے حکومت کی رِٹ مسمار کر دی تھی۔ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ قومیت کا زہر پھیلا دیا تھا اور اَپنے تمام سیاسی حریفوں کو فسطائی ہتھکنڈوں سے انتخابی میدان سے نکال باہر کیا تھا۔ جماعتِ اسلامی اور پی ڈی پی انتخابی جلسے منعقد کر سکتی تھیں نہ پولنگ اسٹیشن تک اُن کے ووٹروں کو جانے کی اجازت تھی۔ کچھ یہی صورتِ حال مغربی پاکستان میں تھی جہاں مسٹر بھٹو نے عوام کو روٹی، کپڑا اَور مکان کا جھانسہ دے رکھا تھا اور جعلی ووٹنگ کی مکمل آزادی تھی۔ اِس پورے انتخابی عمل پر سب سے بڑا خطرہ یہ منڈلا رہا تھا کہ یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے علاقوں کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور دِسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان سیاسی طور پر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

سیاسی طور پر دونوں بازوؤں کی علیحدگی منظرِ عام پر آجانے کے بعد دانش مندی اَور دُور بینی کا تقاضا یہی تھا کہ مذاکرات کے ذریعے ایک ڈھیلے ڈھالے آئینی ڈھانچے پر اتفاق کر لیا جاتا، یعنی کنفیڈریشن وجود میں آتا، مگر ذوالفقار علی بھٹو کسی سمجھوتے پر تیار نہیں ہوئے اور فوج کو آپریشن کرنا پڑا۔ فوجی ایکشن پر بھٹو صاحب نے بیان دیا کہ اللہ کا شکر ہے ملک بچ گیا ہے، حالانکہ پاکستان خانہ جنگی، عالمی رسوائی اور بدترین شکست کے منطقے میں داخل ہو گیا تھا۔ بہت زیادہ خون خرابے، قتل و غارت اَور بھارت کی مداخلت کے نتیجے میں ہماری فوج کو ڈھاکا میں ہتھیار ڈالنا پڑے اور مشرقی پاکستان بالآخر بنگلہ دیش بن گیا۔ ثابت ہوا کہ جب فوج عوام کے خلاف طاقت استعمال کرتی ہے، تو ملک ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

☆☆☆

بھٹو صاحب اپنے مقاصد میں کامیاب رہے، اُنھیں مغربی پاکستان میں اقتدار مل گیا اور وہ کچھ عرصے سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی رہے۔ اُن کی تنگ مزاجی کا یہ عالم دیکھنے میں آیا کہ مشرقی پاکستان میں اُن کے منفی کردار پر تبصرہ کرنے والے پانچ ایڈیٹر اور پبلشر زاپریل ۱۹۷۲ء میں گرفتار کر لیے گئے۔ اُن کے جرائد کے ڈیکلریشن منسوخ اور پریس ضبط کر لیے گئے۔ گرفتار شدگان میں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، الطاف حسن قریشی، مجیب الرحمٰن شامی، حسین نقی اور مظفر قادر شامل تھے۔ اُنھوں نے مارشل لا کی عدالت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور عدالت کے اندر مارشل لا مردہ باد کے نعرے لگائے تھے۔ عدالت نے اُنھیں سخت سزا سنائی جو لاہور ہائی کورٹ میں کالعدم قرار پائی تھی۔ اپوزیشن کے قائدین بھی گرفتار کر لیے گئے۔ بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت برطرف کر دی گئی اور لیاقت باغ، راولپنڈی میں یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کے جلسۂ عام پر گولیاں برسائی گئی تھیں۔ بعد ازاں صدر بھٹو نے اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ کسی قدر مفاہمانہ رویہ اختیار کیا اور اُن کے تعاون سے ایک متفقہ دستور قومی اسمبلی سے منظور کرایا۔ اِس انتہائی غیر انسانی اور غیر جمہوری طرزِ تعمل کے باوجود اپوزیشن کی جماعتوں نے آئین کی منظوری میں حصّہ لیا تاکہ جمہوری اور دستوری بنیادیں مضبوط ہوں اور سیاسی مفاہمت فروغ پائے۔ آئین کے نفاذ کے بعد بھٹو صاحب وزیرِ اعظم منتخب ہوئے، تو پہلا کام یہ کیا کہ ایمرجنسی کے تحت بنیادی حقوق معطل کر ڈالے اور شہر شہر سیاسی مخالفوں کے خلاف مقدمات درج ہونے لگے۔ اِس انتقامی ذہنیت کا یہ نقطۂ عروج سامنے آیا کہ نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی اور اِس کی چوٹی کی قیادت کے پچاس سے زائد افراد کے خلاف سٹین بغاوت (ہائی ڈویژن) کے مقدمات بنائے گئے جس کی سزا قانون کے مطابق موت تھی اور اُنھیں حیدر آباد جیل منتقل کر دیا گیا۔ جناب عبدالولی خاں نے اپنے دفاع کے لیے پنجاب سے تین وکلا یعنی میاں محمود علی قصوری، عابد حسن منٹو اور اِحسان وائیں کے نام دیے۔ قابلِ ذکر بات یہ کہ جناب خان عبدالولی خاں قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر تھے۔

مسٹر بھٹو تاریخ کا نہایت عمدہ شعور رکھنے کے باوجود اَپنے وڈیرانہ مزاج کے سامنے سرنگوں ہو رہے۔ اُنھوں نے بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے اہلِ وطن کو متفقہ دستور دینے کے علاوہ پاکستان کے لیے ایٹمی طاقت کا انفراسٹرکچر تعمیر کیا اور دُوسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کر کے مسلم دنیا میں ایک نیا ولولہ اور ایک نیا ویژن پیدا کیا، مگر داخلی محاذ پر اُنھوں نے اَن گنت دشمن بنا لیے۔ شریف اور عزت دار لوگ اُن کے ظلم سے نجات پانے کی دامن اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگنے لگے تھے۔ اُن دنوں اشتراکی تحریک دنیا میں زوروں پر تھی اور بھٹو صاحب اُس سے بہت متاثر تھے۔ اُنھوں نے روٹی، کپڑا اَور مکان کے نعرے پر عوام کے اندر مقبولیت حاصل کی تھی، چنانچہ وہ سرمایہ داروں، صنعت کاروں اَور کاروباری حلقوں کے خلاف نتائج سے بے پروا ہو کر اقدامات کرتے چلے گئے۔ تمام بینک، صنعتیں، انشورنس کمپنیاں اور تعلیمی ادارے قومیا لیے گئے۔ بعد ازاں آٹا پیسنے والی چکیاں اور چاول چھڑنے والے چھوٹے چھوٹے کارخانے بھی قومی تحویل میں لے لیے گئے اور اُن پر سرکاری افسر یا سیاسی چہیتے مسلط کر دیے گئے۔ چند ہی برسوں کے اندر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اقتصادی نشوونما جو ایوب خاں کے عہد میں دس فی صد کے لگ بھگ رہی تھی، گر کر تین یا چار فی صد پر آ گئی۔ 'لیٹر انٹری' (Later Entry) کے باعث انتظامی مشینری خلفشار سے دوچار ہوئی۔ جبر کے عہد کی ستم رانیوں نے اُس

وقت ایک نئی جہت اختیار کی جب بھٹو صاحب نے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کے انتظامات کیے اور نو جماعتوں پر مشتمل پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) نے اُن کے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ خرابیٔ بسیار کے بعد وزیرِ اعظم بھٹو مذاکرات پر آمادہ ہوئے اور اُصولی طور پر اِس امر پر اتفاق ہو گیا کہ ازسرِ نو انتخابات کرائے جائیں گے۔

☆☆☆

اپوزیشن کے ساتھ ظالمانہ رویے کے باعث بھٹو صاحب سیاسی حلقوں میں اپنا اعتماد کھو بیٹھے، چنانچہ اِس حساس معاملے نے سر اُٹھایا کہ نئے انتخابات کو شفاف رکھنے کے قابلِ اعتماد انتظامات کیا ہوں گے۔ اِس کا تسلی بخش جواب دینے کے بجائے جناب وزیرِ اعظم شرقِ اوسط کے دورے پر چلے گئے۔ اِس دوران یہ افواہیں گردش کرتی رہیں کہ بھٹو صاحب نے اپنی پارٹی کے جیالوں کو بڑے پیمانے پر اسلحہ فراہمی کی مہم جناب غلام مصطفیٰ کھر کے سپرد کر دی ہے جو دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ اپوزیشن جماعتوں کی احتجاجی تحریک میں جو کوئی چار ماہ جاری رہی، طلبہ، وکلا، سیاسی کارکن اور خواتین بہت سرگرم رہیں۔ حکومت نے فوج طلب کی، مگر تین بریگیڈیئروں نے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ بھٹو صاحب اقتدار سے گئے اور جان سے بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ وزیرِ اعظم عمران خاں کے آئیڈیل مسٹر بھٹو ہیں، اِسی لیے وہ اُنھی کے انداز میں تقریر کرتے، اپوزیشن کو للکارتے، سیاست دانوں کو مقدمات میں اُلجھائے رکھتے اور اُنھیں برے برے ناموں سے پکارتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو ایک بار پھر دہرا رہی ہے۔ بدقسمتی سے ۱۹۷۷ء والا منظر پھر اُبھرنے لگا ہے۔ اُس وقت نو سیاسی جماعتوں کا اتحاد قائم ہوا تھا، اِس بار پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ میں گیارہ جماعتیں شامل ہیں۔ یہ مماثلت بڑی حیرت انگیز ہے کہ پاکستان قومی اتحاد کی سربراہی مولانا مفتی محمود کو سونپی گئی تھی اور آج پی ڈی ایم کی قیادت اُن کے انتہائی زیرک صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن فرما رہے ہیں۔ دراصل پاکستان تحریکِ انصاف اور دُوسری سیاسی جماعتوں کے درمیان محاذ آرائی ۲۰۱۴ء سے پوری شدت کے ساتھ چلی آ رہی ہے جب اِس کے چیئرمین جناب عمران خاں نے نواز شریف حکومت کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا تھا اور اسلام آباد کا چار ماہ سے زائد محاصرہ جاری رکھا تھا۔ تب ایمپائر نے اُنگلی اٹھانے سے اجتناب کیا اور تمام پارلیمانی جماعتوں نے منتخب حکومت کا ساتھ دیا، چنانچہ نواز شریف برسرِ اقتدار رہے، مگر تین سال بعد وہ پاناما کے جال میں پھنستے گئے۔ تاریخ کے شناساؤں کو ۱۹۵۴ء کا وہ زمانہ بھی یاد آ رہا ہے جب ایگزیکٹو، عدلیہ اور فوجی قیادت میں گٹھ جوڑ ہوا تھا اور عدلیہ نے گورنر جنرل کے دستور ساز اَسمبلی توڑنے کا اقدام جائز قرار دیا تھا اور جنرل ایوب خاں اور میجر جنرل (ر) اسکندر مرزا کابینہ میں شامل کر لیے گئے تھے۔

☆☆☆

جناب عمران خاں جن طریقوں سے اقتدار میں لائے گئے ہیں، وہ کسی بھی صاحبِ نظر سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ۲۰۱۸ء کے انتخابات پر کیا گزری، وہ کہانی بھی باغ کے ایک ایک پتے اور ڈالی کو معلوم ہے۔ انتخابی نتائج کو تیز رفتاری سے جمع کرنے کا سسٹم الیکشن کمیشن نے نادرا کے تعاون سے قائم کیا تھا، مگر اُس نے آغاز ہی میں کام کرنا چھوڑ دیا اور

نتائج کے اعلان میں نا قابلِ تصور تاخیر ہوئی۔ پھر چاروں طرف سے شور اُٹھا کہ نتائج کو ترتیب دیتے وقت اکثر پولنگ اسٹیشنوں سے پولنگ ایجنٹ نکال دیے گئے تھے جبکہ فوجی پولنگ اسٹیشن کے اندر اَور باہر موجود رہے۔ معرکۂ انتخابات کی کہانی بڑی طویل اور دلفگار ہے جسے بیان کرتے ہوئے قلم کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں ملک سے غداری کا الزام نہ آ جائے۔ چشمِ فلک نے یہ منظر دیکھا ہے کہ جناب جہانگیر ترین کامیاب امیدواروں کو اپنے جہاز میں بھر بھر کر بنی گالہ لاتے، اُنھیں عمران خاں کی خدمت میں پیش کرتے اور اُنھیں یہ خوشخبری دیتے کہ وہ تحریکِ انصاف میں شامل ہو گئے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ سودا بازی سیاست کی جان ہے، اگر اِسے مقتدر ایجنسیوں کی تھپکی بھی میسر ہو۔

پاکستان تحریکِ انصاف کے چیئرمین جناب عمران خاں نے اقتدار میں آتے ہی تین باتوں پر خاص زور دیا۔ پہلی یہ کہ مَیں ڈاکوؤں، چوروں اور لُٹیروں کو جیل میں ڈالوں گا اور اُنھیں کبھی این آر او نہیں دوں گا۔ دوسری یہ کہ ریاست اور حکومت ایک صفحے پر ہیں۔ تیسری یہ کہ ہمیں جو پاکستان ملا ہے، وہ قرضوں میں جکڑا ہوا ہے، خزانہ خالی ہے اور پاکستانی روپے کی قدر مصنوعی طریقے سے بلند رکھی گئی ہے۔ اِس لیے معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے انقلابی اقدامات ناگزیر ہیں۔ اِن رہنما اصولوں کے ساتھ ساتھ وہ قوم کو یہ خوش خبری بھی دیتے رہے کہ ہماری حکومت کے سوچے سمجھے اقدامات کے ذریعے ہر روز دَس اَرب روپوں کی ہونے والی کرپشن رک جائے گی اور سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں پاکستانیوں کے جو دو سو اَرب ڈالر پڑے ہوئے ہیں، اُنھیں واپس لانے کے انتظامات بھی کر لیے گئے ہیں۔ اِن کے علاوہ پوری دنیا میں تحریکِ انصاف کے جو اہلِ ثروت پروانے پائے جاتے ہیں، وہ ڈالروں کی بارش کر دیں گے جن سے بڑے بڑے کارخانے لگیں گے، معیشت برگ و بار لائے گی اور عوام نہال ہو جائیں گے۔

☆☆☆

جناب عمران خاں کی حکومت کو دو سال سے زائد ہو چکے اور عوام یہ محسوس کر رہے ہیں کہ خوش بختی کے بجائے غربت نے ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس میں کوئی ہولناک حادثہ نہ ہو یا دہشت گردی کی آفت نہ ٹوٹے۔ اشیائے خورونوش کی قیمتوں میں کم سے کم دوگنا اضافہ ہو چکا۔ جناب وزیرِ اعظم کے نوٹس لیتے ہی وہ ضروری اشیا بازار سے غائب ہونے لگتی ہیں۔ آٹا، شکر، سبزیاں، دالیں اور دَوائیں درمیانے طبقے کی پہنچ سے باہر ہو گئی ہیں جبکہ غربت زدہ کروڑوں لوگ فاقوں پر گزارہ کر رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو کے دورِ آشوب کی تین چار فی صد اقتصادی نمو کے مقابلے میں آج وہ مائنس ون تک پہنچ گئی ہے۔ فیٹف کو مطمئن کرنے کے لیے ایسے ایسے روح فرسا قوانین بنائے گئے ہیں جو فرد کی آزادی کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہیں۔ نیب نے پہلے ہی سیاست دانوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اب تو اِسے کسی ثبوت کے بغیر چار ماہ تک قید میں رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ مسٹر بھٹو نے مخالفین کو گھروں سے اُٹھا لینے کے لیے فیڈرل سکیورٹی فورس بنائی تھی۔ وزیرِ اعظم عمران خاں ٹائیگر فورس تیار کر رہے ہیں اور جرأت مند صحافی غائب ہونے لگے ہیں۔ سابق وزرائے اعظم جناب نواز شریف اور جناب شاہد خاقان عباسی سلاخوں کے پیچھے رہ چکے ہیں۔ سابق وزیر ریلوے خواجہ سعد رفیق ڈیڑھ سال کے لگ بھگ جیل میں سڑتے رہے جس پر اعلیٰ عدالتوں نے نیب کی سخت گرفت کرتے ہوئے دونوں بھائیوں کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ محترمہ مریم نواز بھی جیل کی سختیاں بھگت چکی ہیں۔ رانا ثناء اللہ منشیات کے جھوٹے مقدمے میں طویل عرصے تک آزادی سے محروم رہ چکے ہیں۔ جناب احسن اقبال بھی عقوبت

خانے میں بہت رہ چکے ہیں۔ میاں شہباز شریف کی آزمائشیں طویل ہوتی جارہی ہیں۔ حکومت کا زیادہ تر وقت انھی جھمیلوں میں گزر رہا ہے اور اِسے قوم سے کیے ہوئے وعدے پورے کرنے کی ذرہ برابر بھی فرصت نہیں۔ اپوزیشن کے اِس الزام اور تنقید میں عام آدمی بہت وزن محسوس کرتا ہے کہ قومی سلامتی کے حساس معاملات بھی نظر انداز ہو رہے ہیں کہ پشاور کی منحوس دہشت گردی کی واردات نے دل اور ذہن ہلا کے رکھ دیے ہیں۔

وزیرِ اعظم کے مشیروں، وزیروں اور ترجمانوں کی سیاسی بصیرت کی داد دینی چاہیے کہ وہ ہفتوں اور مہینوں ٹی وی پر آ کر یہ دعویٰ کرتے رہے کہ اپوزیشن کی جماعتیں بری طرح بٹی ہوئی ہیں، اُن کا کبھی اتحاد قائم ہو سکے گا نہ وہ کسی ایجنڈے پر متفق ہوں گے۔ اِسی قسم کی رائے ۱۹۷۷ء میں مسٹر بھٹو کے نورتنوں نے دی تھی۔ سیاست دان تاریخ پڑھنے سے گریزاں رہتے ہیں، اِس لیے اُن سے وہی بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں جو ماضی میں حکمرانوں سے سرزد ہو چکی ہوتی ہیں اور یوں وہ نشانِ عبرت بنتے جاتے ہیں۔ جناب عمران خاں کی توقعات کے برعکس گیارہ سیاسی جماعتیں جمع ہوئیں، اُنھوں نے ۲۰ ستمبر کو اتحاد کا اعلان کرتے ہوئے منفقہ نکات بھی قوم کے سامنے پیش کر دیے نیز گوجرانوالہ، کراچی اور کوئٹہ میں عام جلسوں کا ٹائم ٹیبل بھی دے دیا گیا۔

☆☆☆

پروگرام کے مطابق تینوں مقامات پر جلسے ہو چکے ہیں۔ آزاد مبصرین کی نگاہ میں اِن کے جلو میں تین کیفیتیں اُبھر کر سامنے آئی ہیں۔ پہلی یہ کہ تینوں جگہ بہت بڑے بڑے جلسے ہوئے جو اِس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی حکومت سے بیزار اور تاریخی مہنگائی، بے روزگاری اور بے بسی سے نجات پانے کے لیے پی ڈی ایم کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ دوسری یہ کہ اِن جلسوں نے مختلف مذہبی فرقوں، قومیت پرست اور قومی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا ہے۔ تیسری یہ کہ مقررین نے بالعموم شائستہ لب و لہجہ اختیار کیا ہے، اگرچہ بعض مقامات پر زبان لڑکھڑا بھی گئی اور سرخ نشانات بھی عبور کر لیے گئے۔ انھوں نے زیادہ تر عوامی حاکمیت کی بحالی، سیاسی معاملات میں غیر سیاسی اداروں کی عدم مداخلت پر زور دیتے ہوئے آئین کی بالادستی، قانون کی حکمرانی اور معاشی استحکام کو اوّلین ترجیحات میں شامل کیا ہے۔ کوئٹہ میں بلوچستان کی پس ماندگی، اِس کے سیاسی حقوق کی پامالی اور جبری لاپتہ افراد کی مظلومیت کا تفصیل سے ذکر ہوا ہے جس نے پنجاب، سندھ اور خیبر پختونخواہ کے شہریوں کو اہلِ بلوچستان کے ساتھ پیوست کر دیا ہے۔

گوجرانوالہ اور کوئٹہ کے جلسے میں جناب نواز شریف کا ویڈیو لنک خطاب حکومتی حلقوں میں شدید تنقید کی زد میں ہے۔ بعض حلقے طیش میں ہیں اور ٹی وی پر دھاڑتے ہوئے الزام لگا رہے ہیں کہ آرمی چیف اور ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی کے بعض اقدامات پر نکتہ چینی کر کے نواز شریف نے بھارت کی زبان استعمال کی ہے اور ملکی مفادات کو نقصان پہنچایا ہے۔ اہم جرنیلوں کو عام جلسوں میں گفتگو کا موضوع بنانا ہرگز ایک اچھا عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس طرزِ عمل سے سول ملٹری تعلقات بھی متاثر ہوتے ہیں اور اِداروں کے اندر بھی کشیدگی گہری ہوتی جاتی ہے، مگر اربابِ بست و کشاد اور اہلِ فکر و نظر کو اِن عوامل کا بھی سراغ لگانا اور اِنھیں قابو میں رکھنے کا لائحہ عمل دریافت کرنا ہوگا جنھوں نے تین بار منتخب ہونے والے وزیرِ اعظم کو زبان کھولنے اور بھرے جلسوں میں بات کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کراچی میں ایک چھوٹے سے

واقعے کے بطن سے جو ہوش رُبا واقعات جنم لیتے رہے، اُن سے یہ تلخ حقیقت آشکار ہوتی گئی کہ ریاست سے بالاتر ایک ریاست موجود ہے۔ رات کے دو بجے آئی جی سندھ کا اغوا کیا جانا، اُنھیں کیپٹن (ر) محمد صفدر کے خلاف جھوٹی ایف آئی آر درج کرانے پر مجبور کرنا، اِس جعلی ایف آئی آر کی بنیاد پر ہوٹل کا کمرا توڑ کر ملزم کا گرفتار کیا جانا، چادر اور چار دِیواری کا تقدس پامال کرنا، پولیس کی توہین پر اعلیٰ پولیس افسروں کا چھٹی پر چلے جانے کا اعلان کر دینا اور اِس پورے معاملے کی تحقیقات کے لیے آرمی چیف کا میدان میں اترنا، حالات کے انتہائی تشویش ناک پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے اور اِس تاثر کو ہوا دیتا ہے کہ ریاست کے معاملات میں انتہائی خطرناک عوامل شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

سنجیدہ قیادت غیر معمولی واقعے کو بڑی اہمیت دیتی اور معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے سائنسی طریقِ کار اَپناتی ہے، مگر پاکستان تحریکِ انصاف کے قائدین اور پُرمغز مصاحبین کی طرف سے پی ڈی ایم کے جلسوں کے بارے میں زیادہ تر منفی ردِعمل سامنے آیا ہے۔ بیشتر ترجمانوں نے ایک ہی تاثر دینے کی احمقانہ کوشش کی کہ جلسے بہت چھوٹے تھے اور مقررین کی باتوں میں شدید تضادات پائے جاتے تھے۔ جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی راہنما مولانا اویس نورانی بلوچستان کے عوام کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم بلوچستان کی سرزمین کو پُرامن، خوشحال اور غیر ضروری پابندیوں سے آزاد سرزمین بنائیں گے۔ زورِ خطابت میں اُن کے منہ سے سرزمین کے بجائے ملک نکل گیا، تو جناب شبلی فراز بغاوت کا مقدمہ دائر کرنے کا مژدہ سنانے لگے اور قوم کا قیمتی وقت ضائع کرنے پر کمربستہ ہیں، حالانکہ جناب اویس نورانی نے اپنے مؤقف کی متعدد بار وضاحت کر دی ہے۔ آزاد بلوچستان کی سرخیاں بھارتی اخبارات نے جناب شبلی فراز کے بیانات سے لگائی ہیں۔

ہمارے بُردبار وزیرِ خارجہ جناب شاہ محمود قریشی بھی جذبات میں بہتے ہوئے قومی اسمبلی میں پی ڈی ایم کو 'غداروں کا ٹولہ' کہہ گئے۔ یہ وہی بیمار ذہنیت ہے جس کا اظہار ایوب خاں نے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح پر ملک سے غدّاری کا الزام لگا کر کیا تھا۔ اُنھیں اپنی تاریخ سے شرم آئی تھی نہ فوج کی درخشندہ روایات کا کچھ پاس تھا۔ جناب وزیرِ اعظم نے تو یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ چوروں اور ڈاکوؤں پہ مذاکرات کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور مَیں اقتدار میں رہوں یا اِس سے باہر ہو جاؤں، اُن سے قوم کا لُوٹا ہوا پیسہ واپس لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ حکومت اور اَپوزیشن کے طرفدار بار بار یہ پیش گوئیاں کر رہے ہیں کہ جنوری سے پہلے جھاڑو پھر جائے گی۔ اِس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی بہت بڑا تصادم ہونے والا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہی کیفیت مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئی تھی اور اِس کا اعادہ ۱۹۷۷ء میں انتخابات کے بعد پیدا ہونے والے واقعات میں رونما ہوا تھا جب سعودی عرب نے اہم سفارتی کردار ادا کیا تھا اور فوج نے معاملات سنبھال لیے تھے، مگر اب سعودی عرب کی وہ پوزیشن قائم ہے نہ فوج کا ادارہ یہ بار اُٹھا سکتا ہے۔

☆☆☆

ہم نے پاکستان کی تاریخ اِسی لیے دہرائی ہے کہ تمام سیاست دان اِس حقیقت کا پورا پورا اِدراک کر لیں کہ مکالمے کا رشتہ توڑ دینے کا نتیجہ بہت بڑی تباہی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اقتدار بھی چلا جاتا ہے اور زندگی کے چراغ بھی گل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اِس ہولناک انجام سے بچنے کے لیے مذاکرات کا راستہ اپنانا اور کمال درجے کی سنجیدگی، سیاسی

بصیرت اور اَخلاقی رفعت کا ثبوت دینا ہوگا۔ ماضی کی غلطیوں کا کفارہ عمدہ کارکردگی اور وُسعتِ قلبی سے ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔ جناب عمران خاں کو اپوزیشن لیڈر کے بجائے ایک ذمے دار حکمران کا کردار اَدا کرنا ہوگا جبکہ اپوزیشن کو صورتِ حال کی بہتری میں تعمیری کردار اَدا کرنا ہوگا۔

یہ امر کسی قدر امید افزا ہے کہ دونوں طرف سے ڈائیلاگ کی ضرورت کا احساس ہونے لگا ہے اور اگر، مگر کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ اِس پہلو پر بطورِ خاص زور دِیا جارہا ہے کہ مذاکرات تمام اسٹیک ہولڈرز کے مابین ہونے چاہئیں یعنی اِن میں حکومت بھی بیٹھے، اپوزیشن بھی، عدلیہ اور میڈیا بھی اور ریاستی ادارے بھی۔ یہی بات سابق چیف جسٹس جناب آصف سعید کھوسہ اور سینیٹ کے سابق چیئرمین جناب رضا ربانی نے بھی بار بار دُہرائی تھی۔ اُمید ہے رحمتوں کے مہینے میں ہم سلامتی کا راستہ دریافت کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

☆☆☆

انسانی تاریخ کا سب سے اہم دن بارہ رَبیع الاوّل ہے کہ اِس روز اَللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ اِس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ آپؐ کی پیدائش ایک ایسے علاقے میں ہوئی جہاں قبائل آباد تھے جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر جنگ وجدل پر آمادہ رَہتے تھے اور اِس قدر سنگ دل واقع ہوئے تھے کہ اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دَفنا دیتے۔ اُن میں شراب نوشی اور بہت ساری معاشرتی خرابیاں عام تھیں۔ اُنھیں اپنی نسلی برتری پر بہت ناز تھا اور وَہ اَپنے مقابلے میں دوسروں کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے اُن کے درمیان زندگی اِس طرح بسر کی کہ آپ شہر مکّہ میں صادق اَور امین کے لقب سے پکارے جاتے۔ آپؐ جب چالیس برس کی عمر کو پہنچے، تو نبوت کے منصب پر فائز کیے گئے اور آپؐ پر اللہ کی وحدانیت کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کی ذمے داری سونپی گئی۔ آپؐ نے اہلِ مکّہ کو جمع کیا اور فاران کی وادی سے خطاب کرتے ہوئے پوچھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑی کے پیچھے ایک بہت بڑا لشکر جمع ہے، تو کیا آپ لوگ میری بات پر یقین کریں گے۔ پورے مجمع نے بیک آواز جواب دیا ہم اِس لیے یقین کریں گے کہ تم نے ہمارے درمیان ایک صادق اَور اَمین کے طور پر زندگی بسر کی ہے، تب آپؐ نے فرمایا کہ اللہ ایک ہے اور اِس نے مجھے تمہاری طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ اِس پر اہلِ مکّہ بہت برہم ہوئے، مگر اُنھوں نے رحمت للعالمینؐ کی اخلاقی عظمت کا برسرِ عام اعتراف کیا۔

آپؐ کی اِسی اخلاقی عظمت اور قوت کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر آیا ہے اور اَللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپؐ خلقِ عظیم پر فائز ہیں اور آپؐ ہی انسانیت کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ سرورِ دوعالمؐ نے دین کی تبلیغ کرتے ہوئے مکّہ مکرمہ میں تیرہ برس شدید ترین مزاحمت میں گزار دیے اور آپؐ کو بالآخر اپنے شہر سے مدینہ منورہ کی طرف سخت خطرات کے درمیان ہجرت کرنا پڑی۔ دشمنی وعداوت کے اِس انتہائی پُرآشوب عہد میں آپؐ نے اپنے اخلاق وکردار اَور اِسلام کی سادہ اَور حیات آفریں تعلیمات کے ذریعے ذہنوں اور دِلوں کو مسخر کرنے کا عمل بڑی خوش اسلوبی سے جاری رکھا جس کے اثرات مدینہ منورہ تک پہنچ گئے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر آپؐ نے مواخات، انسانی عظمت، عدل وانصاف اَور اَللہ اور اِس کے رسولؐ کی اطاعت پر ایک بے مثال ریاست قائم کی۔ آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر انسانی حقوق اور آزادیوں کا عالمگیر چارٹر عطا فرمایا۔ آپؐ نے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا اِنقلاب اخلاقی طاقت کے ذریعے بپا کیا تھا

جس کے تہذیبی وتمدنی اثرات چار دانگ عالم میں محسوس کیے جارہے ہیں۔ یورپ کے فلسفی، دانش ور اور حکمران قرآن کی حقانیت سے متاثر ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہورہے، اگرچہ منفی طاقتیں بھی سرگرم دکھائی دیتی ہیں۔

☆☆☆

رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے ایک انتہائی مختصر مدت میں جزیرۃ العرب کی پوری کایا پلٹ دی تھی۔ وہ قبائلی معاشرہ جس میں ہر شخص دوسرے شخص کا جانی دشمن تھا، اس میں ایسا انقلاب برپا ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے والے انھیں سب سے زیادہ عزیز رکھنے لگے۔ ماں کی عزت ہونے لگی کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ والدین کو یہ مقام عطا ہوا کہ ان کے آگے اولاد اُف بھی نہیں کرسکتی۔ عورت کو وراثت میں شامل کرکے اس کی آزادانہ حیثیت قائم کی گئی۔ قانون کے آگے برابری کا اصول ریاستِ مدینہ کی بنیاد قرار پایا۔ خوفِ خدا اور خوفِ آخرت اسلامی تمدن کے بنیادی اوصاف ہیں۔ انسان کا احترام اور اس کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت اسلامی ریاست کی بنیادی ذمے داری ہے۔ دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرنا، پڑوسیوں کا خاص خیال رکھنا، شہریوں کو تعلیم وتربیت کی سہولتیں فراہم کرنا، معاملات میں امانت ودیانت اور ایفائے عہد کو بنیادی اہمیت دینا اسلام کی معاشرتی زندگی کے بڑے بڑے ستون ہیں۔ اس قدر عظیم انقلاب رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ کے لازوال جذبۂ خیر خواہی اور عفو ودرگزر کی عظیم ترین صفت کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جب تک وہ آنحضرت محمد ﷺ کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور اپنے مال ومتاع سے زیادہ عزیز نہیں سمجھیں گے، وہ مسلمان ہی نہیں ہوسکتے اور نبی آخر الزماںؐ کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کرسکتے۔ یورپ میں سالہا سال سے آپؐ کے گستاخانہ خاکے آزادیٔ اظہار کے نام پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس بار فرانسیسی صدر میکرون نے سرکاری سطح پر اعلان کیا ہے کہ وہ یہ خاکے تمام سرکاری عمارتوں پر چسپاں کرے گا۔ اس پر مسلم دنیا میں ایک زلزلہ سا آگیا ہے۔ ترک صدر اردوان نے ایمانی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ میکرون کا دماغی معائنہ کرایا جائے۔ شاید اس کا دماغ چل گیا ہے۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور دوسرے مسلم ممالک کے عوام اور حکمرانوں نے غیر معمولی ردِعمل ظاہر کیا ہے، تاہم ضرورت جوش کے ساتھ ہوش سے کام لینے کی ہے۔ اپنا نظامِ زندگی درہم برہم کرنے کے بجائے بین الاقوامی اداروں، تنظیموں اور حکومتوں پر اثرانداز ہونے اور انھیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ اس طرح کی اشتعال انگیز حرکات کی مستقل روک تھام کے لیے قانون سازی کریں اور مذہبی پیشواؤں کے احترام کی فضا پروان چڑھائیں۔ اس وقت او آئی سی کو ایک زبردست قائدانہ کردار ادا کرنا ہوگا۔ یہ رحمتوں کا مہینہ ہے۔ ہمیں اس میں اپنے دلوں کو محبوبِ خدا حضرت محمد ﷺ کی محبت سے منور کرنے کے ساتھ ساتھ خارجی اور داخلی محاذوں پر معاملات کی درستگی کے لیے جرأت وفراست کے ساتھ قدم آگے بڑھانا ہوگا۔ یہ ہماری کس قدر سیاہ بختی ہے کہ ہم دورِ جاہلیت کے عرب قبائل کی طرح ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے اپنے ہی عزیز وطن کو تباہی کے دہانے پر لے آئے ہیں۔ ہم اپنے رب اور سرورِ دوعالم حضرت محمد ﷺ کو آخر کیا منہ دکھائیں گے!

◆◆◆

رؤف و رحیم ہمارے حضور ﷺ

حضور ﷺ کی مبارک حیات کا، دلوں کو راحت و ٹھنڈک پہنچاتا دلنشیں و رُوح پرور تذکرہ

مولانا امیر حمزہ

عربی زبان میں ''ربیع'' کا معنی بہار ہے۔ ''معجم المعانی'' میں ہے ایسا موسم جو سردی اور گرمی کے درمیان آئے یعنی معتدل ہو۔ ''ربیع'' کے معنی سرسبز پودا اور موسمِ بہار کی سبز گھاس بھی ہے یعنی جب گھاس زمین پر قالین کی طرح بچھی ہوتی ہے۔ پودے اور پھل دار درخت لہلہاتے ہیں، پھول اپنی خوشبوئیں فضا میں بکھیرتے اور چاروں سمتوں سے باری باری ہوائیں چلتیں اور اپنے ساتھ بادل لاتی ہیں، ایسے شاندار اور نشاط انگیز موسم کو ''ریاح اربع'' کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کی چاروں سمتوں سے ہوائیں چلتی ہیں۔ سال کے بارہ قمری مہینوں میں ایک مہینہ ایسا ہے جسے ''ربیع الاوّل'' کہا جاتا ہے یعنی اوّلین بہار......اِس مہینے میں تمام رسولوں کے سردار، ساری انسانیت کے تاجدار حضرت محمد کریم ﷺ تشریف لائے۔

آپ ﷺ کی تشریف آوری سے سارے جہاں میں بہار آ گئی۔ سارے جہاں کی چاروں سمتوں میں ہر وہ جگہ معطر ہونے لگی جہاں جہاں آپ ﷺ کا رحمتوں بھرا پیغام پہنچا۔ یہ پیغام نبوت کا پیغام ہے۔ یہ پیام رسالت کا پیام ہے۔ ختمِ نبوت ﷺ کی ٹھنڈی چھاؤں تلے، یہ آخری بھی ہے اور اوّلین اِن معنوں میں بھی کہ اِس پیغام کا فیصلہ اوّلین انسان حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کر دیا گیا تھا۔ امام محمد بن عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ ''کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ'' میں حدیث لائے ہیں۔ ''حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ کو نبوت عطا فرمانے کا فیصلہ کب ہوا؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''وَ اٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَ الْجَسَدِ''

جب حضرت آدمؑ روح اور جسم کی درمیانی حالت میں تھے۔ (ترمذی: ۳۶۰۹ صحیح) یعنی مٹی سے حضرت آدمؑ کا جسم تو بن رہا تھا، مگر ابھی اس میں روح نہ پھونکی گئی تھی......اُس وقت اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا تھا کہ حضرت آدمؑ کی اولاد میں آخری رسول حضرت محمد کریم ﷺ ہوں گے۔ جی ہاں! حضور ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری اس لحاظ سے بھی اوّلین بہار ہے جسے عربی میں ''ربیع الاوّل'' کہا جاتا ہے۔

خیر سے بھرپور شجرہ

حضرت آدمؑ میں روح پھونک دی گئی اور وہ اوّلین انسان کی حیثیت سے زمین پر آ گئے۔ حضرت حوّا علیہا السلام کو انھی کی پسلی سے پیدا کر کے جوڑا بنا دیا گیا۔ اب آدمؑ و حوّا کی اولاد پھیلنے لگی۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے، ''مجھے اولادِ آدمؑ میں بہترین لوگوں کے اندر ایک صدی بعد دوسری صدی میں منتقل کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے اِس صدی میں مبعوث کیا گیا جس کے اندر مَیں اب موجود ہوں۔'' (بخاری، ۳۵۵۷) یاد رہے! حضور ﷺ نے ''خیر'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے یعنی حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب تک حضور ﷺ کے جتنے بھی اجداد تھے، ان سب میں خیر تھی۔ اِن میں رسول اور اَنبیاء بھی تھے اور جو غیر نبی تھے، وہ سب شرم و حیا والے پاک دامن تھے۔ ان میں انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کے جذبات تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا معروف انسانی تاریخ سے جو شجرۂ نسب شروع ہوتا ہے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ چنانچہ امام محمد بن اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری میں حضور ﷺ کا شجرۂ نسب ۲۲/اجداد کے ساتھ جناب عدنان تک بیان کیا ہے۔ (بخاری: ۳۸۵۱) امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سیرت کی شہرہ آفاق کتاب میں لکھتے ہیں کہ اِس بات پر علماء کا اجماع اور اِتفاق ہے کہ جناب عدنان حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اسی طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حدیث لائے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ''(مجھے دنیا میں بھیجنے کے لیے) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے حضرت اسمٰعیلؑ کا انتخاب فرمایا۔ اولادِ اسمٰعیلؑ سے کنانہ (قبیلے) کا انتخاب کیا اور کنانہ کی اولاد سے قریش کا انتخاب کیا اور قریش سے بنو ہاشم کو چُنا جبکہ بنو ہاشم سے مجھے منتخب کر لیا۔ (صحیح مسلم: ۲۲۷۶) یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں اہم ترین اور سردار قبیلے جن میں خیر سب سے زیادہ تھی، وہ تین قبیلے تھے۔ آخری قبیلے یعنی بنو ہاشم کے سردار عبدالمطلب کو اللہ نے پوتا عطا فرمایا جن کا نامِ نامی اسمِ گرامی حضرت محمد ﷺ ہے۔

محرومیوں پر ایک نظر

شجرۂ نسب اور اِس میں نمایاں ترین اجداد ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس میں انسان کی پسند کو کوئی دخل نہیں۔ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے۔ اِسی لیے حضور ﷺ نے بھی اپنے شجرۂ نسب کو اللہ تعالیٰ کا انتخاب کہا ہے، تاہم خیر سے بھرپور شجرۂ نسب اپنے اندر شرف اور عزت و اعزاز کا سرمایہ رکھتا ہے اور یہ سرمایہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ کو سب سے بڑھ کر عطا فرمایا۔ حضور ﷺ کی مبارک زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے اِس دنیا میں تشریف لانے کا امکان پیدا ہوا، تو آپ ﷺ کی پیدائش سے قبل ہی آپ ﷺ کے والدِ گرامی حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب اِس دنیا کو چھوڑ گئے۔ یوں آپ ﷺ اِس دنیا میں یتیم کی حیثیت سے تشریف لائے، یعنی بہترین شرف و اعزاز والے بچے کے ساتھ محرومیوں کا سلسلہ شروع ہوا، تو اس نے تھمنے کا نام نہ لیا۔

حضور ﷺ چھے برس کے تھے کہ حضرت آمنہ نے پروگرام بنایا کہ یتیم بچے کو باپ کی قبر ہی دکھلا لاؤں۔ جی ہاں! چھے سال کے بچے نے باپ کو نہ دیکھا۔ یثرب میں باپ کی قبر کو دیکھ کر واپس مکّہ آ رہے تھے، تو ابواء کے مقام پر پردیس اور مسافرت میں ماں کا شفقت بھرا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا اور ماں کی قبر پر اپنے ننھے ہاتھوں سے مٹی ڈال کر اُمِ ایمن کی انگلی تھامے مکّہ میں دادا کی انگلی تھام لی۔ آٹھ سال کے ہوئے، تو دادا بھی اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ ماں اور دادا بچپن کی محرومیاں تھیں۔ اب جناب ابوطالب کفالت کرنے لگے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کے بندھن میں انھوں نے باندھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو چار بیٹیاں اور دو بیٹے عطا فرمائے۔ پہلے حضرت ابوطالب اور پھر بچوں کی اماں

جان حضرت خدیجہؓ فوت ہوگئیں۔ دونوں بیٹے بچپن میں فوت ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ادھیڑ عمر خاتون حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا تاکہ بچیوں کی دیکھ بھال اور گھر آباد ہو جائے۔

اقتدار سے عدم دلچسپی، مگر اقتدار ناک رگڑتا حاضر ہوا

سردار عبدالمطلب مکّہ کے سردار تھے۔ اپنے پوتے ننھے محمد ﷺ کو وہ بیٹوں پر ترجیح دیتے تھے۔ جناب ابوطالب نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ حضور ﷺ کو اِس سرداری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حضرت خدیجہؓ مکّہ کی مال دار ترین خاتون تھیں۔ حضور ﷺ نے اِن کا مال بھی غریبوں، مسکینوں میں اِن کی اجازت سے تقسیم کیا۔ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے پیغامِ توحید کو اہلِ مکّہ نے نہ مانا، تو حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جیسے مبلغین کو یثرب میں بھیج دیا۔ وہاں اذہان ایمان میں بدل گئے، چنانچہ وہاں کے شہریوں نے منتیں کیں کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ہمارے ہاں تشریف لائیے۔

حضور ﷺ مکّہ سے چھپ کر نکلتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ایک غلام کے ساتھ یثرب کی جانب چل پڑتے ہیں۔ جب وہ یثرب جاتے ہیں، تو وہاں کے لوگ کہ جن کے اذہان علم اور دلیل کی قوت کے ساتھ فتح ہو چکے تھے، وہ حضرت محمد کریم ﷺ کا استقبال کرتے ہیں۔ اُنھیں اپنا حکمران بناتے ہیں اور یثرب کا نام تبدیل ہو کر ''مدینۃ الرسول ﷺ'' بن جاتا ہے۔

اللہ اللہ! انسانی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ ایک فاتح دُور بیٹھا دلوں کو دلیل سے فتح کرتا ہے اور وہاں کے لوگ حضور ﷺ کو اپنا حکمران بناتے ہیں۔ مکّے کا اقتدار جو پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں گرنے کو تیار تھا، حضور ﷺ نے نبوت کی دعوت کے بغیر اِس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور نبوت کے پیغام کی قبولیت کے ساتھ جب اقتدار ترلے کر کے حضور ﷺ کے مبارک قدموں میں گرا، تو اسے قبول فرما لیا..... اب تک تو سردار کا بیٹا ہی سردار ہوتا تھا۔ حکمران کا بیٹا ہی حکمران ہوتا تھا اور وہ بھی صرف اپنے علاقے اور قبیلے میں ہوتا تھا..... ساڑھے چودہ سو سال کے متعصب معاشرے میں یہ کیا ہوا کہ ہمارے حضور ﷺ حکمران بنے، تو اپنے شہر میں نہ اپنے قبیلے میں..... آپ ﷺ دوسرے قبیلوں کے حکمران بنے، دوسرے شہر میں بنے، پردیس میں بنے اور ایسے بنے کہ غیر قبیلوں کے ترلوں اور منتوں کو دیکھ کر بنے۔

محرومیوں کے مداوے

اقتدار ملنے کے بعد محرومیوں کے مداوے کا دَور ہوتا ہے، مگر یہ کام دنیا کے غلاموں کا، دنیا کے بندوں کا ہوتا ہے۔ قیصر و کسریٰ اِسی کے غلام تھے۔ اِن سے چھوٹے حکمران، علاقوں کے سردار سب اِسی کے بندے تھے۔ اپنی نسلوں اور اپنے اپنے خاندانوں کے پجاری تھے۔ حضور ﷺ ایسے حکمران تھے جو تاریخ کا دھارا بدلنے آئے تھے۔ پہلا دھارا اُس وقت بدلا جب آپ ﷺ روایتی طریقوں سے ہٹ کر دعوت و تبلیغ کی اساس اور نبوت کے پیغام کی بنیاد پر حکمران بنے۔ اب اگلا دھارا یہ بدلنا تھا کہ کسی کی جانشینی کا اعلان نہیں کرنا تھا۔ وصیت کے ذریعے کسی کو نامزد نہیں کرنا تھا۔ اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنانا تھا۔ یہ کام اُمت پر چھوڑ دیا کہ وہ باہم مشورے سے اپنے میں سے بہتر کو حکمران بناتے رہیں..... حالات کے مطابق اِس کی شکل و صورت کو بہتر سے بہتر اور جدید تقاضوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ جمہوری بنایا جاسکتا ہے۔

حضور ﷺ نے واضح کر دیا کہ حکمران بنانے کا حق اُمت کا ہے۔ اے انسانو! ذرا سوچو، آج بھی بادشاہتیں ہیں، وصیتیں ہیں، خاندانوں میں حکمرانیاں ہیں، آمریتیں ہیں..... مگر ذرا تصور کریں کہ ساڑھے چودہ سو سال قبل ہمارے حضور ﷺ نے اقتدار کے حصول کا رنگ بھی بدلا اور جب اقتدار چھوڑ کر دنیا سے جانے لگے، تو تب بھی تاریخِ انسانی میں

حکمرانی کے روایتی طریقے کا رنگ اور دھارا بھی بدل کر رکھ دیا۔

حضور ﷺ نے قربانیوں کا کلچر یوں دیا کہ بدر کے میدان میں جب اسلام اور کفر کے درمیان پہلا معرکہ ہوا، تو مبارزت کے میدان میں تین دلاوروں میں سے دو آپ ﷺ کے گھر سے تھے یعنی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ دونوں فاتح بن کر لوٹے۔ یہ مشرکوں سے معرکہ تھا۔ خیبر میں یہود سے جنگ ہوئی، تو پھر حضرت علیؓ فاتح خیبر ہوئے۔ اہلِ صلیب کے ساتھ اُردن میں معرکہ ہوا، تو پھر تین کمانڈوں میں سے دو کمانڈر گھر کے فرد تھے جو شہید ہوئے۔ پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے جو حضورؐ کو انتہائی محبوب تھے۔ دوسرے حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ تھے جو شہید ہو کر طیار بنے، لیکن صدقے قربان جاؤں حضورؐ کے تاریخی دھارے اور رَنگ پر کہ بنو ہاشم کی قربانیاں اللہ کی خاطر..... مگر اِس کے بدلے اقتدار کی کوئی وصیت نہیں۔ نہ ہی زندگی میں کوئی دنیاوی مفاد..... بس ایک ہی بات کہ جنت میں اعلیٰ مقام ملے گا۔

شہادت اور جنّت سے مداوا:

چونکہ دنیا میں ہر انسان کے ساتھ ضروریاتِ زندگی لگا دی گئی ہیں، چنانچہ حضور ﷺ کسی کی خدمات یا محرومیوں کا مداوا کرتے، تو مناسب انسانی ضرورت کی حد تک جب کہ اصل مداوا آخرت اور جنت کی نعمت کی خوشخبری کے ساتھ کرتے۔ ''حضرت ابو حسانؒ کہتے ہیں کہ مَیں نے حضرت ابوھریرہؓ سے عرض کی کہ میرے دو چھوٹے بیٹے فوت ہو گئے ہیں، چنانچہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کا کوئی فرمان سنایئے کہ جس سے ہمارے دل مطمئن و مسرور ہو جائیں۔ ایک روایت اِس طرح ہے کہ کیا آپؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے کوئی ایسی خوشخبری والی حدیث سنی ہے کہ اپنے فوت شدگان کے بارے میں ہم وہ حدیث سن کر دلوں کو اطمینان دے سکیں۔ اِس پر حضرت ابوھریرہؓ نے کہا، ہاں کیوں نہیں! حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''فوت ہونے والے چھوٹے بچے تو جنت کی چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیوں کی طرح ہیں جو (جنت کے دروازے پر) ماں باپ کا دامن پکڑ لیں گے اور چھوڑیں گے نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اِن بچوں اور اِن کے ماں باپ کو جنت میں داخل نہیں کر دے گا۔'' (صحیح مسلم: ۲۶۳۵) یعنی دنیا میں دی ہوئی اللہ کی خاطر قربانیوں اور محرومیوں کے مداوے، دنیا کے مفادات سے نہیں ہوتے بلکہ فردوس کی خوشخبریوں سے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوھریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حضرت جبریلؑ آئے، تو انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اُمّ خدیجہؓ آ رہی ہیں۔ اِن کے پاس برتن ہے جس میں کھانا ہے۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس آ جائیں، تو اِنھیں اِن کے رب کی طرف سے سلام کہہ دیجیے گا اور میری طرف سے بھی اور اِنھیں جنت کے ایک ایسے محل کی خوشخبری بھی دیجیے گا کہ جس میں شور و غوغا نہیں ہوگا (پُرسکون ہوگا) اور تھکاوٹ بھی نہیں ہوگی۔'' (بخاری: ۳۸۲۰) اپنے چچا حضرت حمزہؓ کے بارے میں فرمایا: ''تمام شہداء میں افضل شہید اللہ تعالیٰ کے ہاں حمزہؓ بن عبدالمطلب ہیں۔'' (طبرانی اوسط: ۹۲۲ حسن) مَیں نے جعفرؓ بن ابوطالب کو دیکھا کہ وہ بادشاہ ہے جو دو پروں کے ساتھ فرشتوں کے ہمراہ جنت میں پرواز کر رہا ہے۔ (مستدرک حاکم، ترمذی و صحیح عند الحاکم: ۳/ ۲۱۲) حضورؐ نے اپنے فوت ہو جانے والے اٹھارہ ماہ کے بیٹے حضرت ابراہیمؓ کے بارے میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اِس کے لیے جنت میں ایک دودھ پلانے والی (حور) کا تعین فرما دیا ہے۔'' (بخاری: ۶۱۹۵)

خاتونِ جنّت اور اولادِ بتولؓ:

حضور ﷺ اِس دنیا سے رخصت ہوئے، تو آپ ﷺ کی اولاد میں سے تین بیٹیاں حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت اُمِ کلثومؓ فوت ہو چکی تھیں۔ صرف

سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حیات تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساری اولاد کی موجودگی میں بھی حضرت فاطمہؓ کے ساتھ سب سے بڑھ کر محبت تھی، لیکن جب فاطمہ بتولؓ کے سوا اَولاد میں سے کوئی بھی نہ رہا، تو حضرت فاطمہؓ سے محبت کی شدت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اب حضرت فاطمہؓ کی اولاد ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اِس محبوب ترین اولاد کا کیا ہوگا؟ اِس کا نظارہ بھی اللہ کریم نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کروا دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آخری بیماری میں ایک بار حضرت فاطمہؓ کو بلوایا۔ وہ آئیں، تو آہستہ سے ان کے کان میں کوئی بات کہی۔ حضرت فاطمہؓ رونے لگ گئیں۔ پھر دوبارہ آہستہ سے کوئی بات فرمائی، تب حضرت فاطمہؓ ہنسنے لگ گئیں۔ مَیں نے حضرت فاطمہؓ سے رونے اور ہنسنے کا سبب پوچھا، تو وہ کہنے لگیں: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے آگاہ کیا کہ وہ اَپنے اِسی مرض میں اپنے اللہ سے جا ملیں گے۔ یہ سن کر میں رونے لگ گئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بتایا کہ خاندان میں سب سے پہلے تم ہی مجھ سے آن ملو گی، تو یہ سن کر مَیں ہنس پڑی۔'' (بخاری: ۴۴۳۳)

جی ہاں! کچھ ہی ماہ بعد حضرت فاطمہؓ اپنے ابا جان کے پاس چلی گئیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتا دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کا آخری فرد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دنیا میں چند ماہ ہی گزارے گا۔ حضرت فاطمہؓ اپنے پیچھے دو ننھے پھول حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم چھوڑ گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا: ''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے گا۔'' (بخاری: ۲۷۰۴، مسند احمد: ۲۰۷۲۱)

جی ہاں! حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت چھوڑ دی، مگر مؤرخین کا کہنا ہے کہ اِنھیں کچھ عرصہ بعد زہر دے دیا گیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند میں روایت لائے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے اپنے نانا کے ساتھ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دفن کیا جائے، مگر بنو اُمیہ کے حکمران رکاوٹ بن گئے۔ اِس پر حضرت حسنؓ جو پہلے ہی مصالحانہ کردار اَدا کر چکے تھے نے فرمایا کہ فتنہ پڑ جائے، تو مجھے بقیع میں دفن کر دیا جائے۔ اُمت کو فتنوں سے بچانے کی کیا عظیم خوشبو ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھول کی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جگر گوشے حضرت حسنؓ کو بقیع میں دفن کر دیا گیا۔ نانا کی اُمت کے اتحاد کی خاطر وہ قربانی دے گئے اور نانا کی زبانِ مبارک سے جنت کی سرداری کے حق دار بن گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے پھول حضرت حسینؓ کے بارے میں بھی شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ حدیث لائے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت اُمِ فضل رضی اللہ عنہا نے ننھے حسینؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں رکھ دیا (جبکہ وہ ایک، دو دِن کے تھے)۔ اُمِ فضلؓ کہتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ اب میری طرف سے ہٹی اور حسینؓ کی طرف ہو گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو گر رہے ہیں۔ مَیں نے کہا اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا ہوا؟ فرمایا میرے پاس ابھی حضرت جبریلؑ آئے اور بتایا کہ میری اُمت عنقریب میرے اِس بیٹے (حسینؓ) کو قتل کر دے گی۔ یہ سن کر مَیں نے کہا اِس کو؟ فرمایا، ہاں! میرے پاس تو جناب جبریلؑ اِس کی قبر کی سرخ مٹی بھی لے کر آئے ہیں۔ (سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ: ۸۲۱)

قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت کو صفر سے بنانا شروع کیا اور گمنامی میں گرے ہوئے لوگوں کو دنیا کی سپر پاور بنا دیا..... بدلے میں نہ خود کچھ لیا اور نہ بنو ہاشم اور نہ ہی اپنی اولاد کے لیے کچھ لیا۔ حسنؓ اور حسینؓ کے خوبصورت کردار سے باخبر ضرور فرما گئے، مگر اِن کے لیے

جاگیر اور نہ کسی عہدے کا فرمان صادر کر کے گئے۔

انسانی تاریخ کا یہ وہ اعجاز ہے جس کی کوئی مثال نہ پہلے تھی، نہ آج ہے۔ افسوس کہ ختم المرسلین ﷺ نے سیاست میں جس سیاسی وراثت کو دفن کیا، وہ خلافتِ راشدہ کے تیس سال بعد دوبارہ سیاست کے خاندانی وارثوں میں زندہ ہو کر کھڑی ہوگئی..... افسوس! وہ آج تک زندہ ہے اور اُمت کی سیاسی کشتی اسی وجہ سے بھنور میں ہے۔ آیئے! اب آخر میں حضور ﷺ کی پُررحمت حکمرانی کا ایک منظر ملاحظہ کرتے ہیں۔

رؤف اور رحیم رسول ﷺ

قرآن کریم میں ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ۱۱۳ سورتوں کا آغاز بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے ہوتا ہے۔ یعنی ''الرحیم'' کا لفظ ۱۱۳ بار قرآن میں آیا ہے۔ سورتوں کے اندر آیات میں ''الرحیم'' یا ''رحیم'' کا لفظ ۹۳ بار آیا ہے۔ یوں اِس لفظ کی تعداد قرآن میں ۲۰۶ ہے۔

مذکورہ لفظ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔ ''الرحمٰن یا رحمٰن'' اللہ تعالیٰ کا ایسا صفاتی نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ ''ا، ل'' کے ساتھ صفاتی نام بھی صرف اللہ کے لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ ''معرفہ'' ہو جاتا ہے۔ ''ا، ل'' کے بغیر بھی ''رحیم'' کا لفظ قرآن میں آیا ہے، مگر سارے قرآن میں اس انداز سے بھی مذکورہ لفظ یعنی ''رحیم'' کسی رسول اور نبی کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ یہ لفظ صرف حضرت محمد کریم ﷺ کے لیے استعمال ہوا ہے اور ایک ہی بار استعمال ہوا ہے یعنی اللہ کے لیے ۲۰۵ بار اور حضرت محمد کریم ﷺ کے لیے ایک بار..... اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں کے لاتعداد ٹھاٹھیں مارتے سمندروں میں سے رحمت کو مخلوق پر تقسیم فرمایا، تو تمام مخلوقات سے بڑھ کر اور بہت بڑھ کر رحمت کی نعمت عطا فرمائی، تو حضرت محمد کریم ﷺ کو عطا فرمائی۔ اسی لیے ہمارے حضور ﷺ کے لیے مولا کریم نے فرمایا:

و ما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (الانبیا: ۱۰۷)

(میرے حبیبؐ) ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے سراسر رحمت بنا کر بھیجا۔

قرآن میں دوسرا لفظ ''رؤف'' ہے جو ''رافت'' سے ہے یعنی انتہائی نرمی، ملائمت اور شفقت۔ قرآن میں یہ لفظ گیارہ مرتبہ آیا ہے۔ دس بار اللہ تعالیٰ کے لیے اور ایک بار اللہ تعالیٰ نے اِس لفظ کو اپنے حبیب اور خلیل حضرت محمد کریم ﷺ کے لیے استعمال فرمایا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''رؤف و رحیم'' کے دونوں الفاظ اپنے پیارے اور آخری رسول ﷺ کے لیے ایک ہی آیت میں استعمال فرمائے ہیں۔ ملاحظہ ہو!

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم

''(اے انسانو) تم میں سے ہی تمہارے پاس ایک ایسا خاص رسول آیا ہے کہ تم کسی مشقت میں پڑو، تو اِس کے دل پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں (خیر کے حصول کے لیے) انتہائی حرص رکھنے والے ہیں۔ مومنوں کے ساتھ انتہائی شفقت و ملائمت رکھنے والے ہیں۔ نہایت اور حد درجہ مہربانی کرنے والے ہیں۔''

سورۃ التوبہ مدنی سورت ہے یعنی حضور ﷺ مدینہ منورہ میں ریاستِ مدینہ کے حکمران ہیں اور وہیں آپ ﷺ پر قرآن کی سورت ''التوبہ'' کی آیت نمبر ۱۲۸ نازل ہو رہی ہے، تو آپ ﷺ کی مذکورہ دونوں صفتوں کو یکجا کر کے بیان فرما دیا گیا ہے۔ جی ہاں! بتلا دیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کا کلمہ پڑھنے والا جو بھی مسلمان..... حکمران بنے، اسے ریاستِ مدینہ کے حکمران کی مذکورہ دونوں صفتوں کو حرزِ جان بنانا ہوگا۔ اپنی ریاست کے باشندوں کے لیے پالیسی بنانا ہوگی۔ جبر و قہر والا حکمران نہیں، بلکہ رافت و رحمت والا حکمران بننا ہوگا۔ اگر اِس کا کردار ایسا نہیں، تو وہ حضور ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے

والا حکمران نہیں۔ وہ ریاستِ مدینہ کے مقدس حلقے میں ایک اجنبی حکمران ہے۔

ریاستِ مدینہ اور جیل خانہ

قرآن جو حضور ﷺ کا اخلاق تھا اور اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے بتایا تھا۔ وہ قرآن پڑھ جایئے، احادیث کا مطالعہ کر جایئے، سیرت کی تمام کتابیں کھنگال لیجیے۔ ریاستِ مدینہ میں میرے حضورؐ کی دس سالہ پُررحمت حکمرانی میں جیل خانہ نہیں ملے گا۔ جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد کریم ﷺ کو فتح سے نوازا، تو جہاں ۷۲ مشرک مارے گئے، وہاں قیدی بھی بنے۔ مدینہ منورہ میں کوئی جیل خانہ نہیں تھا جہاں جنگی قیدیوں کو رکھا جاتا، چنانچہ حضورؐ نے بدری قیدیوں کو اُن صحابہؓ کے حوالے کر دیا جو اِن کو رکھنے اور کھلانے پلانے کی استطاعت رکھتے تھے۔ جو فدیہ دیتا چلا گیا، وہ رہا ہوتا چلا گیا اور جو فدیہ نہ دے سکتا تھا اور پڑھا لکھا تھا، اُسے کہا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے، اسے رہا کر دیا جائے گا ..... یعنی جنگی قیدیوں کو لمبے عرصہ تک تو کجا تھوڑے عرصے کے لیے بھی قید میں رکھنے کا کوئی منصوبہ نہیں، بلکہ آسان رہائی کا منصوبہ ہے۔ جن کے ہاں قیدی ٹھیرائے گئے تھے، اللہ کا قرآن حضرت محمد کریم ﷺ پر نازل ہو کر قیدیوں کے ساتھ اُن کے حُسنِ سلوک کو یوں بیان کرتا ہے ''وہ (صحابہؓ) کھانے کی ضرورت و خواہش کے باوجود مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلا دیتے ہیں اور ساتھ یوں بھی کہتے ہیں کہ ہم تم لوگوں کو کھانا کھلا رہے ہیں، تو محض اِس لیے کہ اللہ کریم کے چہرے کے دیدار اور خوشنودی کے حصول کی خاطر۔ ہمارے دلوں میں تمہاری طرف سے کسی بدلے اور شکریے کی خواہش نہیں ہے۔'' (الدھر: ۹) اس سورت کے دو نام ہیں۔ ایک نام ''انسان'' ہے، دوسرا نام ''الدھر'' ہے۔ اللہ کی قسم، یہ ہیں مدینہ کے حکمران حضرت محمد کریم ﷺ کہ جنھوں نے دشمن اور غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ بھی اِس قدر اچھا سلوک کیا کہ آپ ﷺ کے حکم پر صحابہؓ نے کمال کر دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں قرآن نازل کر دیا۔ سورت کا نام ''انسان'' رکھ کر دنیا کو بتایا کہ انسانیت کیا ہے۔ اِس سورت کے دوسرے نام کا معنی زمانہ ہے یعنی اِس دور کے زمانے میں تو قیدیوں کو روم کے اسٹیڈیم میں کہ جس کے آثار آج بھی موجود ہیں، ان سے مشقت کروائی جاتی ..... پھر بھوکے شیروں اور کتوں کے سامنے پھینکا جاتا جو چیر پھاڑ کر انھیں کھا جاتے۔ بادشاہ، اس کے وزرا، اس کی فوج کے جرنیل، شہر کے عمائدین اور عام لوگ اِس کا نظارہ کرتے۔

اللہ اللہ! انسانوں کو انسانیت کا سبق پڑھایا، تو ہمارے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے پڑھایا۔ حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں آگاہ کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت بدر کے قیدیوں کے بارے میں تھی۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں قیدی وہی ہوتے تھے جو جنگ میں قیدی بنتے تھے۔ مسلمان کو قیدی نہیں بنایا جاتا تھا..... جی ہاں! جنگی قیدیوں کو بھی حُسنِ سلوک کے ساتھ گھروں کو بھیجا جاتا تھا۔

حضرت ابوھریرہؓ سے مروی ''صحیح بخاری ۴۲۷۲'' میں ایک لمبی حدیث ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی پاکباز فوج کا ایک دستہ نجد کے علاقے سے ''بنوحنیفہ'' قبیلے کے سردار ثمامہ بن اثال کو گرفتار کر کے لایا۔ حضور ﷺ نے مسجدِ نبویؐ کے ستون کے ساتھ باندھ دینے کا حکم دیا۔ اُسے کھانا کھلایا جاتا، ضروریات اس کی خواہش کے مطابق پوری کی جاتیں اور پھر ستون کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ پہلے دن حضور ﷺ نے اسے مسجد میں دیکھا، تو حال احوال دریافت فرمایا۔ کہنے لگا اگر مجھے قتل کرو گے، تو میرا بدلہ میرا قبیلہ لے گا۔ احسان کرو گے تو ہم قدر کریں گے۔ باقی مال چاہیے، توبات کرو..... حضور ﷺ خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا اور تیسرے دن آپ ﷺ

نے احوال پوچھے، تو سردار ثمامہ نے تب بھی یہی سخت جواب دیا۔ اب حضور ﷺ نے ثمامہ کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مقصد تربیت تھا۔ اس نے مسجد میں تین دن تک نمازیں اور حضور ﷺ کی تربیت کا انداز دیکھا، قرآن سنا۔ باہر جا کر اس نے غسل کیا، واپس آیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کلمہ پڑھ لیا۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! جسم آزاد کر دیا، مگر دل کو "عمر قید" کر لیا۔ جی ہاں! یہ تھا حضور ﷺ کا جیل خانہ۔

مسلمانوں میں سے جس کسی سے جرم سرزد ہوا، اسے فوراً سزا دی اور بات ختم..... آج دنیا کے ہر ملک کی جیلوں پر بہت بڑا بجٹ خرچ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں جیلیں ختم ہوں، صرف حوالاتیں بنیں۔ حوالاتوں میں چند دنوں کے اندر اندر ہر ملزم کا فیصلہ ہو۔ سزا سرِ عام ہو، دوسروں کو عبرت ہو۔ اربوں کھربوں روپے کی بچت ہو۔ اس سے پولیس اور عدلیہ کی رفتار خود بخود تیز اور شفاف ہو جائے گی۔ مجبوراً بھی کرنا پڑے گی۔ نظام بہتر کرنا پڑے گا کہ جیل کا وجود نہیں ہے۔ مجرم کے ورثاء پیسے خرچ کرنے، جیلوں میں ملاقاتیں کرنے اور سالہا سال ذلیل ہونے سے بچ جائیں گے۔ اللہ کے بندو! مجرم نے جرم کیا۔ اسے سالہا سال جیلوں میں پھینکتے ہو۔ ساتھ بے گناہ وارثوں کو اس سے کہیں بڑھ کر سزا دیتے ہو۔ خاوند کے ہوتے ہوئے بھی مجرم کی بیوی کی حیثیت، شوہر والی، بیوہ نہ مطلقہ کی ہوتی ہے۔ وہ کس ناکردہ جُرم کی سزا بھگتتی ہے؟ ان ناروا سزاؤں کا حساب اللہ کے دربار میں دینا پڑے گا۔ مدینہ کی ریاست کا تقاضا ہے کہ مسلم حکمران اپنے جیلوں کے نظام کو حضور ﷺ کی سنت کے مطابق کریں اور جیلوں کے بارے میں دنیا بھر کے ملکوں کی بھی اُسوۂ رسول ﷺ کے مطابق راہنمائی کریں۔ دنیا بھر کی جیلوں کے خاتمے سے اربوں ڈالر کی بچت ہوگی۔ وہی پیسہ کمزور انسانیت پر خرچ ہو تو ہمیں اس عالمی سطح کی نیکی کا بھی اجر ملے گا (انشاءاللہ) وگرنہ موت کے بعد سخت ترین جیل خانہ تیار ہے مگر وہ جیل خانہ انتہائی وسیع ہوگا۔ ہر جانب آگ کے شعلوں میں ہر سُو جانے کی آزادی ہوگی۔

خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بھی حضور ﷺ کا نظام ہی چلتا تھا، اسی لیے وہ خلفائے راشدینؓ بنے۔ کیا بات ہے حضرت صدیقِ اکبر، فاروقِ اعظم، عثمانِ غنی اور حیدرِ کرّار رضی اللہ عنہم کی کہ انھوں نے حضور ﷺ کی طرز پر قیدیوں کے نظام کو چلایا۔ یاد رہے! مذکورہ نظام پر پیسہ خرچ نہیں ہوتا، بلکہ پیسہ بچتا ہے۔ کیا مدینہ کی ریاست کے علم بردار پیسہ بچائیں گے؟

آخری گزارش

حضور ﷺ کی دس سالہ پُررحمت حکمرانی کا صرف ایک گوشہ "جیل خانہ" ہم نے ملاحظہ کیا اور وہ بھی انتہائی اختصار اور سرسری نظر کے ساتھ۔ ایسے کئی دوسرے مزید گوشے اور شعبے اگر ہم بیان کرتے جائیں، تو زیرِ نظر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں، تاہم اپنی جگہ پر یہ ایک حقیقت ہے کہ جیل خانے کے ساتھ پولیس اور عدلیہ جڑی ہوئی ہے۔ جیل خانہ نہ ہونے کا مطلب بہرحال یہ ہوگا کہ ہمارا تھانہ اور عدلیہ مثالی بن گئی ہے۔ معاشرے کو عدل اور امیرٹ مل گیا ہے۔ تمام مسائل کی یہ کنجی اور چابی ہے۔ اس کی اصلاح میں حضور ﷺ کا اسوہ رحمتوں اور رأفتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ اس سے معاشرے میں بہار آئے گی۔ ہمیں سارا سال "ربیع" کا موسم ملے گا، ہر ایک کو ملے گا۔ وطنِ عزیز پاکستان جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا، اس میں حضور ﷺ کی مدینے کی دس سالہ بہار دیکھنے کو ملے گی، تو پاکستان "ربیع الاوّل" کی بہاروں میں زندہ باد اور پائندہ باد رہے گا (ان شاء اللہ)۔ آیئے! تلخیاں اور نفرتوں کو بھلا کر حضور رحمتِ دو عالم ﷺ کی رحمت و رأفت کا اسلوب اختیار کریں اور صحیح معنوں میں پاکستان کو مدینے کی ریاست بنائیں۔ ◆◆◆

محسن فارانی

انطاکیہ سے بیت المقدس کا خونیں صلیبی سفر

پہلی صلیبی جنگ میں یورپی درندوں نے خونریزی، وحشیانہ اور بھیانک جرائم کے ریکارڈ قائم کیے

فرانسیسی صلیبی سردار گاڈفرے آف بوئیلون ۱۰۹۸ء میں جنوبی ترکی کے مفتوحہ شہر الرّہا (ایڈیسا) میں اپنے بھائی بالڈون کو حکمران بنا کر انطاکیہ چلا آیا اور ریمنڈ ڈی سینٹ گائل البارہ (شام) کی طرف روانہ ہوا جو دریائے عاصی کے مشرق میں واقع تھا۔ ریمنڈ نے مسلمان مردوں، عورتوں اور جوانوں اور بوڑھوں کا خاصا خون بہانے کے بعد البارہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہاں صلیبی سرداروں بوہیمنڈ، ریمنڈ، گاڈفرے اور رابرٹ کورٹ ہیوز کی ایک میٹنگ ہوئی۔ ان کے علاوہ

کاؤنٹ ڈی فلانڈرز (بلجیم) اور ایوسٹیس ثانی (کاؤنٹ ڈی بولون، فرانس) بھی موجود تھے۔ انھوں نے بعض پیش آمدہ امور پر بحث کی اور اس بات پر اتفاق کیا کہ پوپ کو خط ارسال کیا جائے اور اپنے حالات سے آگاہ کر کے ان کی خواہش معلوم کی جائے اور انھیں انطاکیہ تشریف لانے کی دعوت دی جائے تاکہ وہ خود صلیبی حملے کی قیادت کرتے ہوئے انھیں بیت المقدس تک لے جائیں، جبکہ انطاکیہ تک ساتھ آنے والا پوپ کا نمایندہ ایڈیمار ڈی مونٹیل طاعون سے فوت ہوگیا تھا۔ ڈیڑھ ہزار نو وارد جرمن جنگجو بھی طاعون سے ہلاک ہو گئے۔

ظاہر ہے ویٹیکن (روم) میں بیٹھے پوپ اربن ثانی کے پاس وقت نہیں تھا کہ ان حالات میں یورپ کو چھوڑ کر صلیبیوں سے آملتا، چنانچہ اس نے صلیبی سرداروں کے ارسال کردہ خط کا جواب نہ دیا اور نہ ان کی خواہش پر اپنی آمد کے بارے میں کچھ بتایا۔ قسطنطنیہ کے بازنطینی قیصر کا بھی یہی معاملہ تھا۔

معرۃ النعمان میں صلیبی خونریزی: ایک لاکھ شہداء

دریں اثناء بوہیمنڈ اور ریمنڈ ڈی سینٹ گائل کے درمیان شدید جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا کہ انطاکیہ کا حکمران کون ہوگا، تاہم جلد ہی صلیبیوں کی توجہ شام کے رستے بستے شہر معرۃ النعمان پر مبذول ہوگئی اور وہ ادھر خون کی ندیاں بہانے دوڑ پڑے۔ معرۃ النعمان کے بدنصیب مسلمانوں کا محاصرہ شروع ہوگیا۔ ابن القلانسی معرۃ النعمان پر قبضے کے حوالے سے کہتے ہیں:

''اس سال (۴۹۲ھ) کے محرم (نومبر دسمبر ۱۰۹۸ء) میں فرنگیوں (صلیبیوں) نے معرۃ النعمان کی فصیل پر مشرق اور شمال کی طرف سے چڑھائی کر دی اور لکڑی کا بلند برج بنا کر فصیل کے ساتھ لگا دیا جو اس سے اونچا تھا۔ محصور مسلمان فصیل سے پیچھے ہٹ گئے۔ لڑائی ۱۴ محرم کی مغرب تک جاری رہی۔ صلیبی فصیل پر چڑھ گئے اور اہل شہر چھٹ گئے۔ انھوں نے امان اور تحفظ دینے کی شرط پر ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کی مگر فرنگی نمایندوں نے پس و پیش کی۔ بعض مسلمانوں نے بھی ہتھیار ڈالنے کی مخالفت کی اور یوں جو ہونا تھا ہو کے رہا۔ مسلمان شکست کھا گئے اور مغرب کے بعد صلیبی شہر پر قابض ہوگئے۔ لڑائی میں فریقین کے لوگ بڑی تعداد میں قتل ہوئے۔ مسلمان شکست کھا کر اپنے گھروں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ صلیبیوں نے انھیں امان دی اور پھر ان سے دغا کیا۔ انھوں نے شہر میں صلیبیں بلند کیں۔ اہل شہر کے لیے پہلے امن کے علاقے مخصوص کر دیے مگر صلیبیوں نے اپنے قول و قرار کی پابندی نہ کی اور جو چیز پائی چھین لی اور لوگوں سے اتنا زیادہ مال طلب کیا جس کی وہ استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ پھر ۱۷ صفر کو صلیبیوں نے کفر طاب کی طرف کوچ کیا۔'' ابن اثیر کے بقول ''فرنگیوں نے معرۃ النعمان میں تین دن قتل عام کیا جس میں ایک لاکھ مسلمان شہید ہوئے اور ہزاروں مرد و زن گرفتار کر لیے۔ (الکامل فی التاریخ)

پہلی صلیبی جنگ کے دوران میں بیت المقدس کے سوا کسی اور شہر میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کا خون نہیں بہایا گیا۔

صلیبی مسلمانوں کی لاشیں پکا کر کھا گئے

''کروسیڈز'' کا مصنف جارج کارکس لکھتا ہے:

محاصرۂ انطاکیہ کے زمانے میں اور معرۃ النعمان کی فتح کے بعد شرمناک واقعات پیش آئے جب صلیبی اس پر مجبور ہو گئے کہ کتوں اور آدمیوں کے گوشت پر گزر بسر کریں، چنانچہ ترکوں (مسلمانوں) کی لاشیں قبروں سے کھود کھود کے نکالی گئیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے پکا کے کھا لی گئیں۔ بعض مسلمانوں سے بوہیمنڈ نے رشوت لے کر ان کی جان بخشی کی مگر پھر ناتواں بوڑھے قتل کر کے باقی انطاکیہ کے بردہ فروشی کے بازار میں بھیج دیے گئے۔ (خونریز صلیبی جنگوں کے سربستہ راز۔ دارالابلاغ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور)

معرۃ النعمان میں صلیبی زائرین کا فساد:

جب صلیبی لشکر کی انطاکیہ سے بیت المقدس کی طرف پیش قدمی میں تاخیر ہوئی تھی تو ان صلیبیوں میں بے چینی پھیل گئی جو زیارتوں کے لیے یورپ سے نکلے تھے اور جن کو جلد از جلد شہر مقدس یروشلم تک پہنچنے کا شوق تھا۔ یہی ان کا اولین ہدف تھا۔ وہ صلیبی سرداروں سے شکوہ شکایت پر اتر آئے۔ جو صلیبی پیچھے معرۃ النعمان میں رہ گئے تھے، انھوں نے اس کی دیواریں، مکانات اور مسجدیں مسمار کر دیں، جیسے کہ کمال الدین کہتے ہیں، تاکہ وہ اپنے سرداروں (Barons) کو یروشلم کی طرف پیش قدمی پر مجبور کر دیں (جنوری ۱۰۹۹ء)۔

برہنہ پا صلیبی سردار کا مارچ:

زائرین اور صلیبی جنگجو بشپ پیری ڈی ناربون (فرانس) کی نصیحتوں پر کان دھرتے تھے نہ اپنے سرداروں کی ہدایات پر، بلکہ وہ چیختے چلاتے تھے کہ ہم مشرق میں اس لیے نہیں آئے کہ شہروں پر قبضہ کریں۔ انھوں نے صلیب کے راستے میں خدمات انجام دینے کے لیے مشقت اُٹھائی تھی اور یہ کہ وہ سرداروں کو طاقت سے مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے ہدف کی طرف پیش قدمی کریں۔ صلیبی سرداروں میں ان زائرین اور صلیبی رائے عامہ کو نظر انداز کرنے کی تاب نہ تھی، لہٰذا وہ بادلِ نخواستہ ان کے مطالبے اور لشکریوں کی خواہشات پر صاد کرتے ہوئے ان کے ساتھ چل پڑے۔ سب سے پہلے جس نے صلیبی طوفانی جذبے کے آگے سر جھکایا، فرانسیسی کاؤنٹ ریمنڈ ڈی گائلز تھا۔ اس نے انطاکیہ کا خیال کیا نہ اس پر قبضہ کرنے کا سوچا۔ وہ معرۃ النعمان سے برہنہ پا اور ہر زائر کی طرح ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں صلیب اُٹھائے ہوئے نکلا (۱۳ جنوری ۱۰۹۹ء) اور پھر دوسروں نے اس کی پیروی کی۔

جب ریمنڈ اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے دریائے عاصی پر واقع شیزر کی طرف بڑھ رہا تھا، راستے میں ٹنکرڈ اور اس کے چالیس صلیبی سورمے (نائٹس) اس سے آن ملے۔ ان سب نے مل کر کفر طاب شہر پر قبضہ کر لیا۔ پھر رابرٹ کرٹ ہیوز اپنے دستے کے ساتھ ان سے آملا اور اب وہ سب شیزر کی طرف بڑھے۔ وہ شہر کے قریب نہ گئے۔ ادھر امیر شیزر عزّالدین ابوالعسا کر سلطان نے بھی جس کا تعلق کنانہ کی شاخ بنومنقذ سے تھا، ان کے پاس جانے میں پہل نہ کی کہ ان کے لیے رسد کی فراہمی یقینی بناتا، اپنی سرزمین میں سے ان کے لشکر کو گزرنے دیتا اور انھیں مال اور گھوڑوں کے ہدیے پیش کرتا، نیز ان سے اُمید رکھتا کہ وہ اس کی عملداری سے دور نکل جائیں۔

(۱) شیزر: قلعہ شیزر شام میں معرۃ النعمان کے قریب واقع ہے۔ یہ صوبہ حمص میں شمار ہوتا ہے۔ سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے حماۃ کے بعد صلح کے ساتھ شیزر فتح کیا۔ (معجم البلدان: ۳/ ۳۸۲)

امیر شیزر کی صلیبی سرداروں کو دھمکی:

صلیبیوں نے اس امیر کی جانب زیادہ دھیان نہ دیا تھا جبکہ اس کی طرف سے بھی انھیں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تھی، پھر بھی انھوں نے شہر کے دروازوں پر خیمے آن لگائے تاکہ اس پر دباؤ ڈالیں۔ اس پر عزّالدین کو غصہ آیا۔ اس نے صلیبی سرداروں کے مقابلے میں نکل کر دھمکی دی کہ وہ ان کی رسد کا راستہ بند کر دے گا۔ صلیبیوں نے ممکنہ انجام سے ڈر کر اس جگہ سے پڑاؤ اُٹھا لیا۔ ان کے ہمراہ دو عرب (عیسائی) گائیڈ تھے جو انھیں راستہ بتاتے تھے جہاں سے انھیں گزر کر جانا تھا۔ آگے سفر کے دوران میں انھوں نے وادی سروج میں رُک کر ایک قلعے پر قبضہ کیا اور مویشیوں کے کچھ ریوڑ اور اناج کے ذخیرے قبضے میں لے لیے۔ انطاکیہ اور معرۃ کے حشر کے پیش نظر عزالدین نے صلیبیوں کے منہ آنے کی جرأت نہ کی تھی۔

پھر صلیبیوں نے مغرب کا رخ کیا اور حصن مصیاف پہنچ

گئے۔ قلعے کے حاکم نے ان کا استقبال کیا اور ریمنڈ کاؤنٹ ڈی تولوز سے دوستی کا معاہدہ کرلیا (۲۲ جنوری ۱۰۹۹ء)۔ اگلے روز انھوں نے حصن رفنیہ کی راہ لی۔ حاکم رفنیہ صلیبیوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی قلعہ خالی کرگیا تھا۔ صلیبیوں نے قلعے میں تین دن آرام کیا، پھر کچھ اونچے پہاڑوں سے گزر کر مریامین اور حصن اکراد کے درمیان میدان بقیعہ (Boquee) میں اُترے جسے ایک چوڑی نہر سیراب کرتی ہے۔ یہ ایک دریا سے نکلتی ہے (۲۷ جنوری ۱۰۹۹ء)۔ اس علاقے کے عربوں نے حصن اکراد (یا قلعۃ الحصن) میں جا پناہ لی تھی۔ صلیبیوں نے اس پر چڑھائی کی اور چند زبردست ہلّوں کے بعد اس میں داخل ہوگئے (۲ فروری ۱۰۹۹ء)۔ اہل قلعہ اسے خالی کرگئے۔

(1) مصیاف: حصن مصیاف (مصیاب) مشہور اسماعیلی قلعہ ہے۔ مصیاف شام کے شہروں حماہ اور بانیاس کے درمیان واقع ہے۔ (معجم البلدان: ۵/ ۱۴۴)

(2) کاونٹ ڈی تولوز، ریمنڈ ڈی گائلز تھا جو جنوب مغربی فرانس کے شہر تولوز کا نواب تھا۔ وہ سان گائلز نامی خانقاہ سے وابستہ رہا تھا، اس لیے ریمنڈ ڈی سان گائلز کے نام سے مشہور ہوا۔

(3) رَفَنِیّہ: یہ صوبہ حمص میں واقع ہے۔ اسے رفنیہ تدمر کہا جاتا ہے۔ یہ ساحل شام پر طرابلس کے پاس آباد ہے۔ (معجم البلدان: ۳/ ۵۵)

(4) حصن الاکراد: شام کا یہ تاریخی قلعہ بعلبک اور حمص کے درمیان (حمص کے مغرب میں) ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہاں اُمرائے شام نے ایک برج بنایا تھا اور کردوں کا ایک دستہ متعین کیا تھا جنھوں نے اسے قلعے کی شکل دے دی۔ اسے ان دنوں قلعۃ الحصن کہا جاتا ہے۔ (معجم البلدان: ۲/ ۲۶۴)

الپ ارسلان سلجوقی کے جانشینوں کی بزدلی

حصن اکراد میں امیر حمص جناح الدولہ بن ملاعب کے دو نمایندوں نے صلیبیوں کا استقبال کیا اور کاؤنٹ ڈی تولوز (ریمنڈ) کو بعض تحائف پیش کیے، مثلاً عربی گھوڑے اور سونا۔ صلیبیوں نے اس سے معاہدہ کیا جس میں جناح الدولہ نے ان سے اچھا برتاؤ کرنے کا وعدہ کیا۔ (الحروب الصلیبیۃ فی المشرق، سعید احمد برجاوی، ص: ۱۵۱-۱۵۶)

جناح الدولہ معرۃ النعمان پر صلیبی دھاوے سے پہلے حاکم موصل کربوغا اور حاکم دمشق دقاق کے ہمراہ صلیبیوں سے شکست کھا چکا تھا۔ المیہ یہ ہوا کہ 27 سال پہلے جنگ ملازکرد (۱۰۷۱ء) میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے رومی قیصر دیوجانوس رومانوس کو شکست دے کر گرفتار لیا تھا اور اب ان کے جانشین ریاستی حکمرانوں میں صلیبیوں کے مقابلے کی جرأت نہ تھی۔

صلیبی جنگجو حصن الاکراد سے نکل کر نہر الکبیر کی وادی میں داخل ہوئے جو لبنان کی شمالی سرحد پر ہے۔ پھر ساحلی میدان عکار میں سے گزر کر قلعہ بند شہر عرقہ کے قریب پہنچے جو امارت طرابلس کے تحت تھا۔ امیر طرابلس نے اپنے آدمیوں کے ہاتھ دس گھوڑے، چار خچر اور بہت سے طلائی دینار بھیجے او کاؤنٹ ریمنڈ ڈی سان گائلز کے ساتھ معاہدہ دوستی طے کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر کاؤنٹ نے بات چیت سے انکا کردیا اور شہر پر طاقت سے قبضہ کرنے کے لیے اس کا محاصر کرلیا۔

طرابلس کا محاصرہ

ان دنوں طرابلس پر بنوعمار کی حکومت تھی۔ اس خاندان بانی ابوطالب امین الدولہ حسن بن عمار تھا۔ وہ طرابلس کا قاض اور اثنا عشری مسلک کا پیروکار تھا اور مصر کے عبیدی (نام فاطمی) حکمران کے ماتحت تھا۔ اس نے سلجوقیوں اور عبیدیو کے درمیان اختلاف کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے خودمختاری حاص کرلی تھی۔ اس کا جانشین جلال الملک علی بن محمد بن عمار بن

جلال الملک کی وفات کے بعد اس کا بھائی ابوعلی فخر الملک عمار بن محمد بن عمار حکمران ہوا تھا۔ اس نے اس خیال سے صلیبی جنگجوؤں کے ساتھ مفاہمت میں کوئی عیب نہ جانا کہ وہ تیسری قوت بن کر دو پہلی قوتوں (عبیدیوں اور سلجوقیوں) کو کمزور کرتے اور اس کے ذاتی مفادات کی آبیاری کرتے رہیں گے۔ فرقہ بندی کا اسیر ابوعلی فخر الملک عمار کس قدر احمق اور بدبخت تھا کہ اسلام دشمن صلیبیوں سے مفاہمت کر کے خیر کی امید رکھتا تھا!

جہاد طرابلس اور صلیبیوں سے مصالحت:

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: صنجیل فرنگی (کاؤنٹ آف تولوز، ریمنڈ ڈی سان گائلز) لعنہ اللہ نے سلطان قونیہ قلیچ ارسلان داؤد بن سلیمان بن قتلمش سے لڑائی کی۔ صنجیل کے پاس ایک لاکھ جنگجو تھے جبکہ قلیچ ارسلان کا لشکر قلیل تعداد میں تھا۔ خونریز جنگ میں فرنگیوں نے شکست کھائی۔ بے شمار مسیحی قتل اور گرفتار ہوئے۔ قلیچ ارسلان مالِ غنیمت کے ساتھ لوٹا۔ اس کی فتح بے پایاں تھی۔ شکست خوردہ صنجیل ۳۰۰ جنگجوؤں کے ساتھ فرار ہوا تھا اور شام کی طرف نکل گیا۔ حاکمِ طرابلس فخر الملک عمار نے حاکم حمص یاغی، جناح الدولہ کے نائب، کو پیغام بھیجا، نیز شاہ دمشق دقاق بن تتش کے پاس صدر روانہ کیا کہ بہتر ہے مل کر صنجیل کو جا لیں جبکہ وہ اتنا قریب ہے۔ امیر یاغی خود فوج لے کر نکلا جبکہ دقاق نے ۲ ہزار سپاہی بھیجے۔ طرابلس سے بھی امداد پہنچ گئی اور وہ باب طرابلس پر اکٹھے ہوئے اور وہاں صنجیل کے لشکر پر دھاوا بولا۔ صنجیل نے وہیں صف بندی کر لی، اس نے اپنے ۱۰۰ جنگجو طرابلس والوں کی طرف، ۱۰۰ لشکر دمشق کی طرف اور ۵۰ لشکر حمص کی طرف بھیجے جبکہ اس کے پاس ۵۰ صلیبی رہ گئے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو حمص کی فوج تتر بتر ہو کر بھاگ نکلی اور اس کے بعد لشکر دمشق نے راہِ فرار اختیار کی۔

جہاں تک اہلِ طرابلس کا تعلق تھا، وہ دشمن کے ۱۰۰ جنگجو صلیبیوں سے لڑتے رہے۔ جب صنجیل (ریمنڈ ڈی سان گائلز) نے یہ دیکھا تو اس نے باقی دو سو جنگجوؤں کے ساتھ مسلمانوں پر ہلا بول دیا۔ اہل طرابلس کی صفیں ٹوٹ گئیں، سات سو مسلمان شہید ہوئے اور صنجیل نے آگے بڑھ کر طرابلس کا محاصرہ کر لیا۔ اہل جبل (اسماعیلی) بھی آ گئے اور انھوں نے محاصرے میں صلیبیوں کی مدد کی۔ اہل سواد نے بھی ایسا ہی کیا جبکہ ان میں سے اکثر عیسائی تھے۔ اہل طرابلس نے جان توڑ مقابلہ کیا۔ تین سو فرنگی مارے گئے، پھر صنجیل نے مال اور گھوڑوں کی فراہمی پر صلح کر لی۔

طرطوس میں قتلِ عام:

اس کے بعد صنجیل (ریمنڈ) نے شہر انطرطوس کی راہ لی جو طرابلس کے تحت تھا۔ صنجیل نے اس کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ وہاں اس نے قتلِ عام کیا، پھر وہ حصن طوبان کی طرف بڑھا جو رفنیہ کے قریب ہے۔ اس کے ہراول کا افسر ابن العریض تھا۔ اس کی حصن طوبان والوں سے لڑائی ہوئی۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور انھوں نے ابن العریض کو گرفتار کر لیا۔ وہ صنجیل کے بڑے شہسواروں (Knights) میں سے تھا، چنانچہ اس نے ابن العریض کے فدیے میں ۱۰ ہزار دینار اور ایک ہزار قیدیوں کی پیشکش کی مگر ابن العریض نے انکار کر دیا۔

(1) انطرطوس (طرطوس): طرطوس جزیرہ ارواد کے بالمقابل شامی بندرگاہ ہے (جہاں رُوس نے بحری اڈا قائم کر رکھا ہے۔) یہ صوبائی صدر مقام ہے۔ صوبہ (محافظہ) طرطوس میں بانیاس، صافیتا، الشیخ بدر کے اضلاع شامل ہیں۔ عراق سے تیل کی پائپ لائن یہاں پہنچتی ہے جو یورپ کو برآمد ہوتا ہے۔ طرطوس ۶۳۸ء میں عربوں (مسلمانوں) نے فتح کیا اور بازنطینیوں نے ۹۶۸ء میں ان سے چھین لیا تھا۔ (المنجد فی الاعلام: ۳۵۶)

(2) الکامل فی التاریخ: ۴/ ۳۸۳

صلیبی طرابلس سے نکل آئے

حاکم طرابلس ابوعلی عمار نے صلیبیوں کو شہر (طرابلس) میں داخل ہونے کی اجازت دے دی اور ۳۰۰ صلیبی قیدی رہا کر دیے۔ اب صلیبیوں نے شہر عرقہ کا محاصرہ اٹھایا اور ان کے لشکر شہر طرابلس میں داخل ہو گئے۔ وہاں تین دن ٹھہرے۔ اس دوران میں ان سے اچھا برتاؤ ہوا، پھر حاکم طرابلس سے طے شدہ معاہدے کے مطابق وہ شہر چھوڑ کر آگے چل دیے جیسا کہ ابوعلی عمار نے معاہدے کی پابندی کی تھی۔

قلعہ صنجیل (قلعہ طرابلس)

بلندی پر واقعہ قلعہ طرابلس قلعہ صنجیل کے نام سے مشہور ہے جہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے۔ صلیبی دور میں اس کے قیام سے لے کر اس میں توسیع و ترمیم ہوتی رہی۔ آج اس کی آٹھ گوشوں والی (مثمن الاضلاع) عمارت جو نظر آتی ہے اس کا تعلق عبیدی دور سے ہے۔ یہ ایک بڑے قبرستان کے وسط میں ایک شیعی یادگار تھی جس نے پورے پہاڑی ٹیلے کو گھیر رکھا تھا۔ طرابلس کی صلیبی ریاست کے بانی ریمنڈ ڈی سان گائلز (عربی میں ریمون دی صنجیل) نے اسے گرجے میں بدل دیا اور پھر اسے کلیسائے قبر مقدس کہا جانے لگا جو زائرین کے ٹیلے (تلّۃ الحجاج) پر واقع تھا۔ ان دنوں یہ ٹیلا تلّۃ ابی سمراء کے نام سے معروف تھا۔ اس قلعے میں بعض عمارتیں صلیبی ایام سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں قلعے کی مشرقی دیوار بھی شامل ہے۔ گرجے کے بعض حصے بارہویں تیرہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ قلعے کے وسط میں برج الکبیر ہے، وہ بھی صلیبی دور کا ہے۔ دورِ ممالیک میں رُونما ہونے والی نمایاں تبدیلیوں میں قلعے کے شمال اور جنوب کی دیواریں شامل ہیں۔ بعض عثمانی دور کی معمولی تبدیلیوں میں سولہویں صدی عیسوی کا وہ بڑا دروازہ قابل ذکر ہے جو مملوکی دور کی عمارت کا حصہ ہے۔

طرابلس سے بیت المقدس کا صلیبی سفر

صلیبی طرابلس سے نکلے اور بیروت کا قصد کیا جبکہ گائیڈان کے ہمراہ تھے (۱۶ مئی ۱۰۹۹ء)۔ وہ طرابلس ساحل پر ناک کی سیدھ چلے۔ راستے میں راس شکا، جس پر ایک مضبوط اسلحہ بند قلعہ تھا، بترون اور جبیل آئے۔ وہاں سے انھوں نے نہر الکلب نامی ندی کا رخ کیا جو ریاست طرابلس کی آخری حدود پر تھی۔ ۱۹ مئی ۱۰۹۹ء کی شام صلیبی لشکر بیروت کے سامنے پہنچ گیا اور انھیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ نہر الکلب سے بیروت تک کا علاقہ اس وقت سے عبیدیوں کے قبضے میں تھا جب وہ اگست ۱۰۹۸ء میں فلسطین اور یروشلم پر قابض ہوئے تھے۔ یوں عبیدی (فاطمی) سلطنت کی حدود شمال میں نہر الکلب اور مشرق میں دریائے اُردن تک پہنچ گئی تھیں۔ بیروت کے مضافات میں پہنچنے پر صلیبی لیڈروں کو سواگت کرنے والے مقامی لوگوں (عیسائیوں) نے ہر وہ چیز پیش کر دی جس کی انھیں ضرورت تھی، اسلحے سے لے کر خوراک تک ہر چیز دی اور ان سے عہد کیا کہ اگر وہ بیت المقدس (یروشلم) پر قبضہ کرنے کے بعد انھیں حصہ دینے کا وعدہ کریں تو وہ ان کا ساتھ دیں گے۔ صلیبیوں نے اس سے اتفاق کیا اور پھر صیداء (Sidon) کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ وہاں سے صور (Tyre) پہنچے جہاں پڑاؤ کیا (۲۳ مئی)، پھر ارسوف پہنچ گئے اور اس کے بعد یافا (موجودہ تل ابیب یافو) سے پہلے ہی ساحل چھوڑ کر اندرونِ ملک بیت المقدس کی طرف مڑ گئے۔ نہر العوجہ نامی ندی پار کر کے رملہ کے پاس پڑاؤ کیا۔ رملہ کے لوگ صلیبی لشکر کی آمد سے پہلے ہی شہر خالی کر گئے تھے (2-3 جون 1099ء)۔ رملہ میں داخل ہو کر صلیبی لیڈروں نے روبیر ڈی روان نامی شخص کو وہاں کا بشپ مقرر کیا اور ایک حفاظتی دستہ رملہ میں تعینات کر دیا۔

رملہ سے صلیبی لشکر نے بیت المقدس کی طرف سفر جاری رکھا۔ قیبیہ سے گھڑسواروں کا کھوجی دستہ ٹنکرڈ اور بالڈون ڈ

بورگ کی قیادت میں بیت لحم کی طرف بھیجا۔ وہ دستہ طلوعِ فجر کے وقت پہنچا۔ جب بیت لحم کے عیسائیوں نے انھیں دیکھا تو ان کے استقبال کو نکلے۔ وہ مذہبی گیت گا رہے تھے، پھر انھوں نے ٹنکرڈ کا پرچم اٹھایا اور کلیسائے عذراء (سینٹ ورجن چرچ) کی بلندی پر نصب کر دیا۔

۱۵ رجب ۴۹۲ھ/ ۷ جون ۱۰۹۹ء منگل کے دن صلیبی لشکروں کے اس ٹڈی دل نے بیت المقدس کی دیواروں کے نیچے آن پڑاؤ کیا۔ یہی ان خونخوار جنونی لشکروں کا ہدف تھا۔ (الحروف الصلیبیۃ فی المشرق، سعید احمد برجاوی: ۱۶۱، ۱۶۲)

بیت المقدس اور خونخوار صلیبی

صلیبی جنگجو رجب ۴۹۲ھ میں بیت المقدس آن پہنچے۔ اہل شہر سے لڑائی ہوئی اور صلیبیوں نے ان کی رسد روک دی۔ انھوں نے چوبی برج کھڑا کر کے فصیل سے لگا دیا۔ دریں اثنا انھیں مصر سے افضل بن بدر جمالی کے زبردست فاطمی لشکر کی آمد کی خبر ملی جو بیت المقدس والوں کی مدد و حمایت کو آ رہا تھا۔ صلیبیوں نے بیت المقدس پر زبردست دھاوا کیا اور دن کے آخر تک لڑائی جاری رکھی، پھر صلیبی پیچھے ہٹ گئے اور انھوں نے اگلے دن کا چیلنج دیا۔ ادھر شہر کے لوگ مغرب کے وقت فصیل سے نیچے اُتر آئے۔ لیکن صلیبیوں نے فصیل پر پھر حملہ کر دیا، چوبی برج فصیل کے ساتھ لگایا اور اس پر چڑھنے لگے۔ مسلمان شکست کھا گئے اور صلیبیوں نے دھاوا کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ خوفزدہ مسلمانوں نے محراب (مسجد) میں پناہ لی۔ وہاں کم و بیش ایک لاکھ کی تعداد میں لوگ شہید ہوئے جن میں مسلمانوں کے اجل علمائے دین اور زاہد و عابد بھی شامل تھے۔ یہود اپنے کنیسہ (Synagogue) میں جمع تھے، انھیں صلیبیوں نے زندہ جلا دیا۔ ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ کو ان کا مسجد اقصیٰ پر قبضہ ہوا، پھر وہاں انھوں نے بے پناہ خونریزی کی اور کئی قبور اور مقامات مسمار کر دیے۔ (خونریز صلیبی جنگوں کے سربستہ راز)

بیت المقدس پر صلیبی یلغار اور لاطینی مملکت کا قیام

صلیبی جنگجو بیت المقدس کی دیواروں کے سامنے

شام کے شمال مغربی علاقے میں صلیبیوں کے پانچ ماہ قیام کے بعد، جبکہ وہ وہاں بہت سے شہروں اور قصبوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہے تھے، صلیبی انبوہ بیت المقدس کی طرف حرکت میں آئے اور راستے میں بعض مسلم حکام صلیبیوں کے مطیع ہو گئے۔ انھوں نے مقابلے کے بجائے اپنی سلامتی کو ترجیح دی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صلیبی شرائط پر انھیں مدد اور رسد دیتے رہے۔ یوں ساحلی اور اندرونی شہر یکے بعد دیگرے صلیبیوں کے آگے ڈھیر ہوتے گئے حتیٰ کہ وہ ۱۵ رجب ۴۹۲ھ/ ۷ جون ۱۰۹۹ء کو بیت المقدس کی دیواروں کے سامنے پہنچ گئے۔ حیرت ہے کہ مسلمانوں کا ایمان اور جذبۂ جہاد اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ وہ مؤتہ و یرموک کو بھول کر باطل پرست صلیبیوں کے آگے ڈھیر ہوتے چلے گئے۔

مصر کی عبیدی سلطنت کی طرف سے افتخار الدولہ بیت المقدس کا حکمران تھا۔ اس نے صلیبیوں کا مقابلہ کرنے کی تیاری کی۔ پانی کے کنوؤں میں زہر ڈلوا دیا اور چشموں کا پانی کاٹ دیا اور شہر سے تمام عیسائیوں کو اس خیال سے نکال دیا کہ صلیبی حملے کے دوران میں ان کی موجودگی خطرناک ہوگی، کہیں وہ صلیبیوں سے گٹھ جوڑ نہ کر لیں۔ افتخار الدولہ نے شہر کی قلعہ بندیوں کو بھی مضبوط بنایا۔

فصیلِ شہر پر صلیبی دھاوا

اس شہر مقدس کا محاصرہ کرنے والی صلیبی افواج کی تعداد ۴۰ ہزار کے لگ بھگ تھی اور تقریباً پانچ دن گزرنے کے بعد شہر کی فصیل پر ان کا متوقع حملہ شروع ہو گیا۔ صلیبی لشکر میں شہر پر قابض ہونے کا جوش و خروش بے پناہ تھا۔ ان کا فیصلہ کن حملہ ۲۰ رجب ۴۹۲ھ/ ۱۲ جون ۱۰۹۹ء کو عمل میں آیا۔ شہر کی شمالی فصیل کے بیرونی مورچے ڈھے گئے، تاہم عبیدی فوجی

دستوں کی ثابت قدمی اور بہادری نے مسیحی حملے کا رخ پھیر دیا اور صلیبیوں کے دلوں میں بھڑکتا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد صلیبی لشکر پلٹ گیا۔

صلیبیوں کا پڑاؤ غلط جگہ پر تھا۔ انھیں پیاس اور خوراک کی قلت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ عبیدی فوج کے لیے ممکن تھا کہ وہ صلیبیوں پر جوابی حملہ کر دیتی جبکہ وہ ماندگی کی حالت میں تھے۔ ان کے قدم اکھاڑے جا سکتے تھے اور انھیں تتر بتر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن عبیدی کار پردازوں نے فصیل کو ناقابل تسخیر بنانے کی کوئی کاوش نہ کی۔ صلیبی اپنی اس حالت میں محاصرے کو جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جنوا (اٹلی) والوں کے بحری جنگی جہاز یافا پہنچ گئے اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یوں صلیبیوں کو رسد، خوراک، اسلحہ اور محاصرے کے برج بنانے کے لیے ضروری آلات دستیاب ہو گئے۔ اس امداد کا صلیبیوں پر گہرا اثر پڑا، ان کے ارادے پختہ ہو گئے، وہ ثابت قدم ٹھہرے اور ان کا متوقع کامیابی کا شوق فزوں تر ہو گیا۔

یروشلم پر صلیبی تسلط: تاریخ کی سب سے بڑی خیانت

محاصرے کے دوران میں صلیبیوں کا ایک چوبی برج مسلمانوں نے تباہ کر دیا تو انھوں نے دوسرا برج بنا کر منجنیقوں سے شدید سنگباری کی اور نیزہ بازوں نے برج کی بلندی سے فصیل پر دھاوا بول دیا۔ بیت المقدس کی دیواروں پر شدید لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر کار عبیدی فوج نے ہتھیار ڈال دیے اور یہ شہر مقدس صلیبیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ دراصل جنھوں نے بیت المقدس نصاریٰ کو دے دیا، وہ مصر کے عبیدی (فاطمی) حکمران تھے جنھوں نے بیت المقدس کے مسلمانوں کے لیے بروقت امدادی فوج بھیجی نہ بیت المقدس کی طرف بڑھتے صلیبیوں کو راستے میں روکنے کی زحمت کی۔ یہ ان کی تاریخ کی سب سے بڑی خیانت اور کوتاہی تھی۔ (فلسطین التاریخ المصور، ص ۱۱۴)

اس سانحے پر ایک عرب شاعر نے کہا۔

فَحَقٌّ ضَائِعٌ وَحِمًى مُبَاحٌ
وَسَيْفٌ قَاطِعٌ وَدَمٌ صَبِيبٌ
وَكَمْ مِّنْ مَسْجِدًا جَعَلُوْهُ دَيْرًا
عَلٰى مِحْرَابِهٖ نُصِبَ الصَّلِيبُ
اُمُوْرٌ لَوْ تَأَمَّلَهُنَّ طِفْلٌ
لَطَفْلٌ فِيْ عَوَارِضِهٖ مَشِيْبٌ

''حق ضائع ہو گیا اور (بیت المقدس کی) پناہ گاہ میں خون مباح ٹھہرا۔ کاٹنے والی (مسلمانوں کی) تلوار کند ہو گئی اور بہتا ہوا خون بیکار گیا۔ کتنی ہی مسجدیں انھوں نے گرجے بنا لیں اور ان کی محرابوں پر صلیبیں نصب کر دیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر بچہ بھی ان پر غور کرے گا تو عوارض میں مبتلا ہو کر بوڑھا ہو جائے گا۔''

(بقیہ حصہ مضمون برائے دسمبر ۲۰۲۰ء میں ملاحظہ فرمائیں۔)

☆☆☆

''بابری مسجد کے نیچے مندر نہیں مساجد تھیں''

اصل واقعات اور تاریخ مسخ کرنے میں بھارتی انتہا پسند ہندوؤں کا کوئی جوڑ نہیں۔ یہ جب اور جیسے چاہتے ہیں، ویسی تاریخ بنا لیتے ہیں۔ یہ سمجھے اور جانے بغیر، کہ کبھی نہ کبھی تاریخ کی اصل داستان سے پردہ اُٹھ ہی جاتا ہے اور یہ قوم شرمندہ ہونے کے بجائے کمال ڈھٹائی سے اپنے خود ساختہ بے بنیاد مؤقف پر قائم رہتی ہے۔

سنگھ پریوار کی مکّاری عیاں کرتا دو ہندو ماہرین اثریات کا سنسنی خیز انکشاف پڑھیے

صفحہ نمبر 57 پر

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ابوصارم

لٹیروں کے سرپرست

عالمی بینکنگ

دورِ حاضر میں بین الاقوامی بینکاری
نظام لُوٹ مار سے اُڑایا مال سفید بنانے کا
سہل ترین ذریعہ بن چکا

امریتا سین ایک بھارتی نژاد امریکی معاشیات دان ہے جسے نوبل انعام بھی مل چکا۔ وہ کہتا ہے کہ کرپشن، منی لانڈرنگ اور ٹیکس چوری ترقی پزیر ممالک میں عوام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ یہ بات سو فی صد درست ہے۔ ترقی پزیر ممالک میں حکومت کے اندر یا باہر موجود طاقتور و بااثر عناصر عموماً ناجائز ذرائع سے رقم کماتے ہیں۔ وہ پھر منی لانڈرنگ کے ذریعے اپنے کالے دھن کو سفید کرا لیتے ہیں۔ دورِ حاضر میں منی لانڈرنگ کرپٹ حکمرانوں، جرنیلوں، سرکاری افسروں، ججوں اور نجی افراد کے لیے ناجائز دولت چھپانے یا اُسے جائز بنانے کا معروف ترین طریقہ بن چکا۔ جو رقم عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونی چاہیے، افسوس وہ ان کے اللے تللوں پر خرچ ہوتی ہے۔

امریکی ادارے فن سین کا لوگو

منی لانڈرنگ کے ذریعے کالے دھن کو بینکوں یا مالیاتی اداروں کے ذریعے بڑے پیچیدہ مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ اِس ساری 'کڑی مشقت' کا حاصل یہ ہے کہ کالا دھن بڑے غیر روایتی انداز میں اور ناراست (اِن ڈائریکٹ) طریقے سے ''صاف شفاف'' ہو کر اپنے مالک تک واپس پہنچ جائے۔ گویا منی لانڈرنگ ناجائز دولت کو دھو دھا کر جائز بنانے کا عمل ہے۔ اِسی لیے عربی میں اسے ''غسل الاموال'' کہتے ہیں۔

منی لانڈرنگ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جنم لینے والا عجوبہ ہے جب افریقا، ایشیا اور لاطینی امریکا میں کئی ممالک یورپی استعمار کی گرفت سے آزاد ہوئے۔ ایسے اکثر ممالک میں استعمار کے دست راست مقامی طاقتور طبقے نے اقتدار سنبھال لیا۔ رفتہ رفتہ کئی ملکوں میں دیسی حکمران طبقہ سرکاری خزانے کی لُوٹ مار سے ارب پتی ہو گیا۔ یہ طبقہ پھر ملک و قوم پر ڈاکے ڈال کر حاصل شدہ رقم کو ٹھکانے لگانے کی خاطر منی لانڈرنگ کرنے لگا۔ مثلاً نواز شریف خاندان اور زرداری خاندان پر الزام ہے کہ وہ اپنے اپنے دورِ حکومت میں منی لانڈرنگ کرتے رہے ہیں۔

اداروں کی تشکیل:

منی لانڈرنگ روکنے کے لیے ۱۹۸۹ء میں ترقی یافتہ ممالک نے ایک ادارے ''فیٹف'' (فنانشل ایکشن ٹاسک فورس) کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ مختلف ممالک کا جائزہ لے کر دیکھتا ہے کہ وہاں کی حکومتیں منی لانڈرنگ روکنے کی خاطر کس قسم کے قانونی اقدامات کر رہی ہیں۔ جو ممالک منی لانڈرنگ خصوصاً دہشت گرد تنظیموں کو غیر قانونی طریقوں سے سرمایہ فراہم کرنے میں ملوث پائے جائیں، اُن پر مالی و تجارتی پابندیاں لگ جاتی ہیں۔

۱۹۹۰ء میں امریکا کی وزارتِ خارجہ نے ایک ادارہ ''فن سین'' (فنانشل کرائمز انفورسمنٹ نیٹ ورک) قائم کیا۔ اِس نئے ادارے کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ بینکوں اور مالیاتی اداروں میں مشکوک اور مشتبہ لین دین پر نظر رکھے، چنانچہ امریکا اور یورپ کے تمام بینکوں کو پابند کر دیا گیا کہ جب کوئی بینک افسر منی لانڈرنگ کا کیس دیکھے، تو اِس کی بابت ایک رپورٹ بنا کر ''فن سین'' کو بھجوا دے، تاہم اِس مشتبہ منی لانڈرنگ کے خلاف متعلقہ بینک ہی کو کارروائی کرنا تھی۔ یہ رپورٹ اصطلاح میں ''سار'' (Suspicious activity reports) کہلاتی ہے۔

رپورٹیں افشاء ہو گئیں:

بزفیڈ نیوز امریکا کی مشہور نیوز ویب سائٹ ہے۔

۲۰۱۹ء میں اِس نیوز سائٹ کے صحافیوں نے کسی طرح فن سین کے ذخیرے سے ۲۶۵۷ خفیہ دستاویزات حاصل کر لیں۔ اِن میں سے ۲۱۲۱ فائلیں ''سار'' (رپورٹیں) تھیں۔ یہ یاد رہے کہ امریکا میں اگر کوئی غیر متعلقہ آدمی ''سار'' رپورٹ منظرِ عام پر لے آئے، تو اُسے جیل جانا پڑتا ہے، کیونکہ یہ ایک جرم ہے۔ وجہ یہ کہ رپورٹ سامنے آنے سے منی لانڈرنگ کیس کے خلاف جاری تفتیش متاثر ہوتی ہے، تاہم امریکی حکومت صحافیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکی۔

بہرحال بزفیڈ نیوز کے صحافی فن سین کی اہم فائلیں پانے میں کامیاب رہے۔ پھر ایک سال تک اِس نیوز سائٹ کے محقق ایک اور مشہور صحافتی تحقیقی ادارے، آئی سی آئی جے (انٹرنیشنل کنسورشیم آف اِنویسٹی گیٹو جرنلسٹس) کے محققین کی معیت میں اِن فائلوں کا جائزہ لیتے رہے۔ انھوں نے فائلوں کو مصدقہ اور قانونی پایا، چنانچہ دونوں ادارے ۲۰ ستمبر ۲۰۰۲ء کو تمام فائلیں منظرِ عام پر لے آئے۔ اِن فائلوں نے حیران کن انکشافات کے باعث بین الاقوامی مالیاتی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ اِن چشم کشا انکشافات سے شعبۂ بینکاری بہت متاثر ہونے کا امکان ہے، اِس لیے تمام حکومتوں کے احکامات پر مقامی میڈیا نے اِس مالیاتی اسکینڈل کے بارے میں بہت کم خبریں شائع کیں۔ یوں بینکوں کو بدنامی اور کاروبار متاثر ہونے کے خطرے سے بچالیا گیا۔

''فیٹف'' پاکستان کے پیچھے پڑا ہے

دو ٹریلین ڈالر کا لین دین:

اِن فائلوں نے انکشاف کیا کہ ۱۹۹۹ء سے لے کر ۲۰۱۷ء تک سینکڑوں مقامی اور غیر ملکی بینکوں میں دو لاکھ سے زائد مشکوک لین دین یا منی لانڈرنگ کے واقعات انجام پائے۔ یہ بینک ''اپاک سو سترممالک'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن مشتبہ واقعات کی کُل مالیت دو ٹریلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ واضح رہے، اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر سال ۸۰۰ بلین ڈالر تا دو ٹریلین ڈالر کی منی لانڈرنگ ہوتی ہے۔ گویا کم از کم اسّی کروڑ ڈالر کا سیاہ دھن ہر سال سفید بنایا جاتا ہے۔

بنیادی اور ہولناک انکشاف یہ ہے کہ کسی بھی بینک نے مشکوک لین دین کے خلاف کارروائی نہیں کی اور اُسے انجام ہونے دیا۔ گویا اِن فائلوں سے پتا چلا کہ پوری دنیا میں بینک اور مالیاتی ادارے کرپٹ حکمرانوں، چوروں، ڈاکوؤں اور لُٹیروں کے مددگار بلکہ سرپرست بنے بیٹھے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بے ایمان اور لالچی افراد کی ناجائز اور غیر قانونی طریقوں سے حاصل کردہ دولت کو بینک ہی سفید اور جائز بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اِن بینکوں نے کرپٹ حکمرانوں اور سرکاری افسروں کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ اپنے ممالک کے سرکاری خزانے لُوٹ کر رقم دنیا میں کہیں بھی بھجوادیں۔ اس سارے مجرمانہ اور غیر قانونی عمل سے بینک بھی ہر سال کروڑوں ڈالر کا منافع کماتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک کی منافقت:

فن سین کی فائلوں کا ایک بڑا اور حیرت انگیز انکشاف یہ

بھی ہے کہ امریکا اور دِیگر ترقی یافتہ ممالک کے سرکاری ادارے بھی منی لانڈرنگ روکنے میں کوئی اہم کردار اَدا نہیں کرتے۔ حقیقتاً بڑے بڑے بینک اِن کی ناک تلے کرپٹ شخصیات کے مددگار اَور ہم نوا بنے ہوئے ہیں۔ اِس کا مطلب ہے کہ امریکی و یورپی سرکاری اداروں کا سارا تام جھام محض ڈھکوسلا ہے۔ دراصل اِن اداروں کے ذریعے بنیادی طور پر مخالف حکومتوں پر مالی پابندیاں لگائی جاتی رہیں تاکہ اِنھیں

بھارتی بینک منی لانڈرنگ کرتے ہیں

گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکے۔ عام حالات میں دوست ممالک کے بینک جتنی مرضی منی لانڈرنگ کر لیں، ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ اِس عیاں منافقت اور دوغلے پن کی ایک مثال بھارت اَور پاکستان کے ساتھ رویہ ہے۔

فیٹف پچھلے دو برس سے پاکستان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اِس کا دعویٰ ہے کہ پاکستان منی لانڈرنگ اور دہشت گرد

تنظیموں کو سرمایہ دینے والے حوالہ جات کا مرکز ہے۔ اِس نے وطنِ عزیز کو ''گرے فہرست'' میں رکھا ہوا ہے۔ اِس فہرست میں اُن ممالک کو رکھا جاتا ہے جن پر منی لانڈرنگ انجام دینے کا شک ہو۔ اگر یہ شک یقین میں بدل جائے، تو اِسے ''بلیک فہرست'' میں ڈال کر اِس پر تجارتی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ فی الوقت گرے فہرست میں پاکستان کے علاوہ شام، آئس لینڈ، یوگنڈا، یمن، زمبابوے، منگولیا، بہاماس وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ بلیک فہرست صرف دو ممالک ایران اور شمالی کوریا پر مشتمل ہے۔

پاکستانی معیشت کو دھچکا:

حکومتِ پاکستان نے فیٹف کی ہدایت پر بعض سخت اقدامات کیے ہیں۔ ماہرینِ معاشیات کے نزدیک یہ بے جا اقدامات ہیں جنہوں نے خصوصاً پاکستان میں غیر رسمی (اِنفارمل) معیشت کو نقصان پہنچایا ہے اور اِسی لیے وہ سکڑ کر

گئی۔ اِن اقدامات سے نہ صرف قومی معیشت سے کثیر سرمایہ نکل گیا، بلکہ ہزارہا پاکستانی کام بند ہونے سے بے روزگار بھی ہو گئے۔ اِس کے باوجود فیٹف پاکستان کو گرے فہرست سے نہیں نکالتا، کیونکہ یہ بنیادی طور پر سیاسی معاملہ ہے۔

امریکا، بھارت اور اِن کے ہم نوا ملک پاکستان کو بلیک فہرست میں ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ اِس کی معیشت کو مزید برباد کیا جا سکے، تاہم پاکستان فی الوقت چین، ترکی، ملائیشیا اور سعودی عرب کے سہارے بلیک فہرست میں جانے سے بچا ہوا ہے۔ اگرچہ مودی سرکار نے بھرپور زور لگا رکھا ہے کہ فیٹف میں موجود اُپنے دوستوں کے ذریعے پاکستان پر تجارتی پابندیاں لگا دے۔

منی لانڈرنگ میں ملوث بھارتی بینک:

فیٹف کے ۳۹ ارکان ہیں۔ بھارت بھی اِن میں شامل ہے۔ وجہ یہ کہ فیٹف کی رو سے بھارت نے منی لانڈرنگ روکنے کی خاطر تمام ضروری قانونی اقدامات کر رکھے ہیں، لہٰذا اِن کی بجاآوری کے بعد اُسے بھی رکن بنا لیا گیا، لیکن فن سین کی فائلوں سے انکشاف ہوا ہے کہ بھارت کے ۴۴ بینک بھی منی لانڈرنگ میں ملوث رہے۔ ۲۰۱۱ء تا ۲۰۱۷ء اِن بھارتی بینکوں نے ایک ارب ڈالر سے زائد رقم کی منی لانڈرنگ کر ڈالی۔

منی لانڈرنگ کرنے والے بھارتی بینکوں میں پنجاب نیشنل بینک، سٹیٹ بینک آف انڈیا، بینک آف بڑودہ، یونین بینک آف انڈیا اور کنارا بینک شامل ہیں۔ یہ تمام سرکاری ہیں جبکہ کئی نجی بھارتی بینکوں کے نام بھی فہرست میں ملتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اِس انکشاف کے بعد فیٹف بھارت اور اِن تمام ممالک کے خلاف کیا کارروائی کرے گا جن کے بینک منی لانڈرنگ میں ملوث ہیں؟ فہرست میں تمام نامی گرامی بین الاقوامی بینک موجود ہیں جو نام نہاد ترقی یافتہ حکومتوں کی زیرِ سرپرستی چوری، ڈاکے کی رقوم اِدھر سے اُدھر بھجواتے رہے۔

مودی سرکار کی دہشت گردی:

بھارت عرصۂ دراز سے افغانستان کے راستے پاکستان میں دہشت گردی کروا رہا ہے۔ اِس نے ریاستِ پاکستان کے خلاف سرگرم مقامی تنظیموں کو بڑی عیاری سے اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے۔ یہ تنظیمیں آئے دن خصوصاً بلوچستان، سندھ اور خیبر پختونخواہ میں سکیورٹی فورسز اور عام شہریوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ پاکستان نے کئی بار اَقوامِ متحدہ اور عالمی قوتوں کو

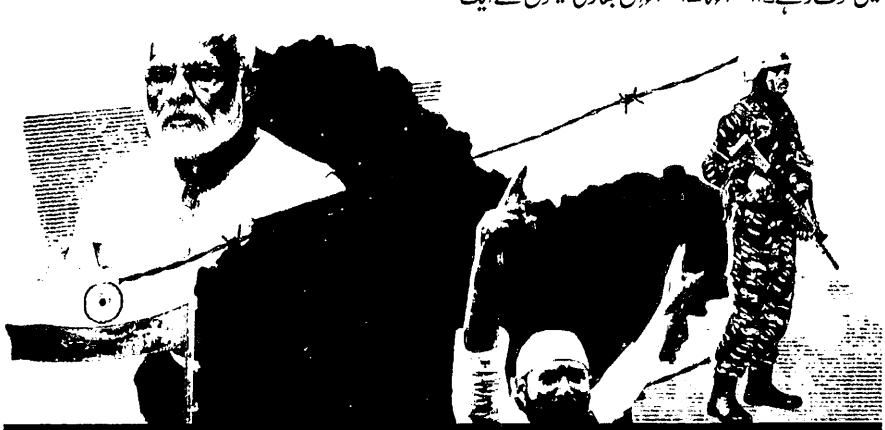

مقبوضہ کشمیر میں سرکاری دہشت گردی

بھارت کی دہشت گردی کے بارے میں مطلع کیا ہے، مگر کوئی بھی مودی سرکار کو کٹہرے میں کھڑا نہیں کرنا چاہتا۔

بھارت کے آنجہانی وزیر دفاع، منوہر پاریکر کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ بھارتی حکومت نے دہشت گردی کا جواب دہشت گردی سے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بھارتی حکومت مقبوضہ ریاست جموں و کشمیر میں جاری تحریکِ آزادی کو ''دہشت گردی'' کا نام دیتی ہے۔ اِسی پالیسی کو نریندر مودی نے اقتدار سنبھالتے ہی حرزِ جاں بنالیا۔ آج ریاستِ پاکستان کی دشمن تمام تنظیموں کو بھارت سے مالی امداد اور اسلحہ مل رہا ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کو اپنی سرگرمیاں انجام دینے کے سلسلے میں افغان حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے۔

فیٹف کا دعویٰ ہے کہ حکومتِ پاکستان نے مقامی جنگجو تنظیموں کو سرمایہ جمع کرنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے، لیکن بین الاقوامی ادارہ یہ نہیں دیکھتا کہ مودی سرکار نے وادیٔ کشمیر میں ایک کروڑ کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھاتے ہوئے انتہا کر دی۔ وادی میں دس لاکھ بھارتی فوج نے اہلِ کشمیر کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ یہ علاقہ اب دُنیا کی سب سے بڑی جیل میں تبدیل ہو چکا، مگر فیٹف سمیت کوئی بھی عالمی ادارہ کھلی غنڈہ گردی دکھانے پر بھارتی حکومت کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھاتا۔ یہ خصوصاً امریکا، برطانیہ اور فرانس کی منافقت اور دوغلے پن کی انتہا ہے۔

آزادیٔ رائے کا ناجائز استعمال:

پچھلے دنوں فرانس میں ایک مسلمان نے شاتمِ رسول ﷺ کو قتل کر ڈالا۔ اِس پر فرانسیسی صدر کا بیان آیا ''اسلامی دہشت گردی پھر سر اُٹھا رہی ہے۔'' فرانسیسی صدر کو وہ اَفراد دکھائی نہیں دیتے جو انتہائی اشتعال انگیز خاکے بنا کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ایسے لوگ آزادیٔ رائے کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کئی مغربی دانش ور بھی یہ استدلال تسلیم کر چکے، مگر فرانسیسی صدر نے اُلٹا مسلمانوں پر دہشت گردی کرنے کا الزام تھوپ دیا۔

فن سین کی فائلوں سے عیاں ہے کہ مغربی حکومتوں کی سرپرستی میں چلنے والے بین الاقوامی بینک دنیا میں جاری منی لانڈرنگ کے سب سے بڑے مرکز ہیں۔ زیادہ سے زیادہ منافع اور پیسا کمانے کے لالچ میں آ کر یہ اخلاقیات اور قانون، دونوں کو بھول چکے۔ تمام بینک افسر بخوبی جانتے ہیں کہ فلاں رقم چوری، ڈاکے یا فراڈ کی ہے، مگر وہ اِسے نہیں روکتے، کیونکہ ایسا کرنے سے بینک کا کاروبار متاثر ہوتا ہے۔ یہ لالچ و ہوس کی انتہا ہے۔

مغربی ممالک اپنے آپ کو انسانی حقوق کے چیمپئن اور اَخلاق و قانون پر عمل کرنے والا قرار دیتے ہیں، مگر فن سین کی فائلوں نے اِن کی عیاری بھی عیاں کر دی۔ اِن ملکوں کی حکومتوں نے عالمی بینکوں میں جاری منی لانڈرنگ روکنے کی ٹھوس کوششیں قطعاً نہیں کیں، کیونکہ اِس سے انھیں نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن یہ بے عملی ترقی پزیر ممالک کے عوام پر ظلم ڈھانے کے مترادف ہے۔ وجہ یہ کہ اِنھی ممالک کا کرپٹ طاقتور طبقہ سرکاری خزانے لُوٹ کر سیاہ دھن بذریعہ منی لانڈرنگ سفید بناتا ہے۔ اِن کی لُوٹ مار نے غریب ممالک کے عوام کو مزید غریب بنا دیا ہے اور آج وہ مہنگائی، بے روزگاری، بھوک اور بیماری سے نبرد آزما ہیں۔ ◆◆◆

کشمیر پر ہوتے مظالم کو صدی سے زائد کا عرصہ ہو چلا مگر ظلم و ستم کی یہ داستان اپنے اختتام کو نہ پہنچ سکی۔ نہ جانے ابھی کتنی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں خون کے آنسو روئیں گی۔ کشمیری خواتین کی قربانیوں اور کشمیری خاندانوں کے چراغوں کی گمشدگی کی لاکھوں داستانیں سناتا مضمون، مصنفہ بیگم تنویر لطیف (تمغۂ امتیاز) کے قلم سے، جن کے اپنے خاندان کے ۳۵ افراد تا حال گم شدہ ہیں۔

صفحہ نمبر 92 پر

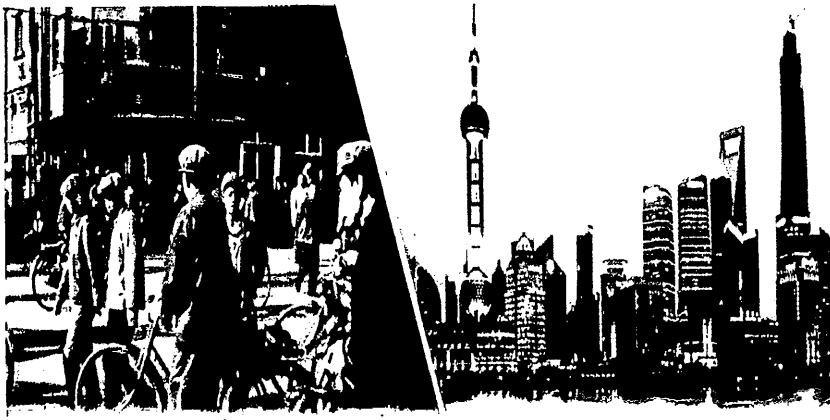

چین جو میں نے دیکھا

2012ء میں مجھے بطور پولیٹیکل کونسلر بیجنگ میں تعینات کیا گیا۔ ایک سفارتی عشائیے میں میری ملاقات ایک افریقی سفیر سے ہوئی جو کئی سال سے بیجنگ میں مقیم تھے۔ مجھے جستجو تھی کہ میں چین کی اقتصادی ترقی کے بارے میں افریقی سفیر کے تاثرات معلوم کروں، چنانچہ میں نے سفیر سے پوچھا کہ وہ چین کو کیونکر بدلتے دیکھ رہے ہیں؟ ان کا جواب دوٹوک اور معنی خیز تھا۔ انھوں نے کہا:

''چین ہر ایک منٹ میں بدل رہا ہے۔'' ان کے اس جواب پر میں چین کی معجزہ نما اقتصادی ترقی کے بارے میں سوچتا چلا گیا۔ دوسرا سوال جو میرے ذہن میں آیا، وہ یہ تھا کہ چین ترقی کی اس سطح کو برقرار رکھنے میں کیونکر کامیاب رہا ہے جس کی معلوم انسانی تاریخ کوئی مثال موجود نہیں۔

ہم کئی اقتصادی نظریات پڑھتے آئے ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ معیشتوں کو ترقی کرنے کے لیے کیا کچھ درکار ہوتا ہے۔ یہ نظریات میکرو اکنامکس اور مائیکرو اکنامکس دونوں کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں جو کسی ملک یا خطے کی اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، تاہم چین میں سروس کرتے ہوئے مجھے جو تجربات حاصل ہوئے، ان سے میں بالکل مختلف نتیجے پر پہنچا اور میرا اس کہاوت پر یقین بڑھ گیا کہ ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ!''

تمام اقتصادی نظریات ایک خاص ثقافتی، سیاسی اور سماجی ماحول میں بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ جہاں دانشور

ایک پاکستانی سفارت کار کے اقتصادی معجزے برپا کرتے اور ہر آن بدلتے چین میں تعیناتی کے دوران مشاہدات

محمد مدثر ٹیپو

برادری، ترقیاتی عمل کے وابستگان اور ماہرین اقتصادیات یہ سمجھتے ہیں کہ چین کی اقتصادی افزائش کی کلید اس کی اقتصادی ترقی کا ماڈل ہے جو سرمایہ داری اور ریاستی ملکیت کا شاندار آمیزہ ہے مگر میرے نزدیک چین کی ثقافت نے اس کی نمایاں اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

چین اب دنیا کی دوسری بڑی معیشت ہے۔ اس کی اقتصادی برتری کے اعداد وشمار حیرت انگیز ہیں۔ 2019ء میں چین کی جی ڈی پی 14.3 ٹریلین ڈالر تھی اور عالمی معیشت میں اس کا حصہ 18.72 فیصد تھا۔ چین کے قدرتی وسائل کی قدر کا تخمینہ 23 ٹریلین ڈالر ہے جن کا 90 فیصد کوئلے اور نایاب زمینی دھاتوں پر مشتمل ہے۔ چین دنیا کا سب سے بڑا بینکنگ سیکٹر بھی رکھتا ہے جس کے اثاثے 40 ٹریلین ڈالر کے لگ بھگ اور مجموعی ڈیپازٹس 27.39 ٹریلین ڈالر ہیں۔ اس کی درآمد غیر ملکی براہِ راست سرمایہ کاری دنیا میں چوتھے اور برآمد غیر ملکی براہِ راست سرمایہ کاری گیارھویں نمبر پر ہے۔ چین ارب پتیوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے درجے پر ہے جن کی مجموعی دولت 996 بلین ڈالر ہے۔ دنیا کی 500 بڑی کمپنیوں میں سے 129 کے ہیڈ کوارٹر چین میں ہیں۔ اس کے زرِ مبادلہ کے ذخائر دنیا میں سب سے زیادہ ہیں جن کی مالیت 3.1 ٹریلین ڈالر ہے۔

چین میں بڑے پیمانے پر تبدیلی عمل میں آنے کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

شین ژن کبھی ایک چھوٹا سا ماہی گیروں کا قصبہ تھا مگر چار دہائیوں کی اصلاحات اور افتتاحات کے نتیجے میں یہ ہارڈ ویئر کا عالمی مرکز اور سائنسی وفنی ترقیات کا گڑھ بن چکا ہے۔ یہاں فلک بوس عمارتوں کی بھرمار ہے اور اس کی آبادی ایک کروڑ 30 لاکھ سے بڑھ گئی ہے۔ آج بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ چین تاریخی طور پر پہلی ہزاری سے لے کر 19 ویں صدی تک دنیا کی اوّلین اقتصادی طاقت تھا۔

چینی ثقافت کے بارے میں ایک سب سے حیرت انگیز بات وہ اصول وضوابط اور ان سے وابستگی کا شعور ہے جن سے چینی معاشرہ دو ہزار سال سے بہرہ یاب ہو رہا ہے۔ کنفیوشس کے خود احتسابی، محنت اور مصائب میں صبر کے اصول چینی عوام کے فکر وعمل میں گوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بڑوں کا ادب چینی معاشرے کے ڈی این اے میں رچا بسا ہے جس نے ترقی اور خوشحالی کے ریاستی ماڈل پر عمل درآمد میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی (CPC) جس نے یکم اکتوبر 1949ء کو عوامی جمہوریہ چین کا قیام ممکن بنایا، اسے فخر ہے کہ وہ دنیا میں ایک سب سے زیادہ میرٹ پر استوار ادارہ ہے۔ چینی کمونسٹ پارٹی کے راہنماؤں کے ساتھ میرے اپنے میل جول سے اور پبلک گورننس کے نظام کو دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پارٹی کی قیادت سخت چھان پھٹک اور نمایاں کارکردگی کی بنا پر منتخب کی جاتی ہے۔

چین کے اندر سفر کرتے ہوئے مجھے صحیح معنوں میں

اندازہ ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی کی جڑیں واقعی عوام میں ہیں۔
چین بیسویں صدی کے نصف اوّل میں بڑی کشاکش سے گزرا اور کمونسٹ پارٹی کے سامنے سب سے بڑا چیلنج چین میں غربت کو کم کرنا اور ملک کو اقتصادی ترقی اور یکجہتی کی شاہراہ پر ڈالنا تھا۔ پارٹی کے ارکان بڑے مخلص تھے اور ایک ارب سے زیادہ عوام کی خواہشات پر پورا اُترنے کا جذبہ رکھتے تھے، چنانچہ کمیونسٹ پارٹی گزشتہ تین عشروں کے اندر تقریباً 80 کروڑ عوام کو غربت سے نکالنے میں کامیاب رہی۔ غربت کم کرنے کا ایسا وسیع پروگرام کمیونسٹ پارٹی کے بغیر عمل میں نہیں آسکتا تھا جس نے سوچی سمجھی، طویل المیعاد، قابل عمل اور عوامی شرکت کی حامل پالیسیاں بروئے کار لا کر چینی عوام کی قسمت بدل دی ہے۔

میں نے چین میں دورانِ قیام ایک جس حیرت انگیز چیز کا مشاہدہ کیا، وہ یہ کہ بنیادی سہولتیں اور انفراسٹرکچر ہر کہیں پایا جاتا ہے حتیٰ کہ انتہائی دُور دراز مقامات پر بھی یہ سہولتیں دستیاب ہیں۔ مسلّمہ اقتصادی اور کاروباری اصولوں کے پیش نظر یہ سوچنا محال تھا کہ استطاعت سے زیادہ مہنگا انفراسٹرکچر غریب سے غریب عوام کی نہایت بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا ہوگا۔ تبت جو دنیا کی چھت کہلاتا ہے، وہاں بھی میں ہسپتالوں، سڑکوں اور عوامی سہولتوں کا شاندار انفراسٹرکچر دیکھ کر حیران رہ گیا جو کہ لہاسہ کے دارالحکومتی شہر میں پھیلا ہوا ہے۔

ایک اور بات جس نے مجھے متاثر کیا، وہ یہ تھی کہ چین کے طول و عرض میں انسانی مساوات کا بیش از بیش احساس پایا جاتا ہے۔ اکثر یہ دیکھ کر بڑی مسرّت ہوئی کہ ہفتہ وار چھٹی پر یا لمبی تعطیلات میں ہزاروں افراد باغات میں کھیلتے، فلمیں دیکھتے یا تھیٹر کی تفریح سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لوگ بازاروں میں می جیانگ کھیل رہے تھے۔ ان میں خوش وضع عورتیں بھی تھیں۔ کتے ٹہل رہے تھے، پیارے پیارے بچے بائیسکلوں پر آ جا رہے تھے اور فراری اور آڈی گاڑیاں سڑکوں پر رواں دواں تھیں۔ ان سب سے چین ایک بہشت اور تصوراتی دنیا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے چین میں اپنی پانچ سال کی سفارتی خدمات کے دوران اپنے آس پاس شاذ و نادر ہی کوئی پُرتشدّد واقعہ رُونما ہوتے دیکھا۔

ایک اور چیز جس کی طرف میری توجہ مبذول ہوئی، وہ چینیوں کی اپنی پانچ ہزار سال پر محیط ثقافت کو محفوظ رکھنے اور اسے ترقی دینے کی لگن ہے۔ چین کی سرحدیں 14 ممالک سے ملتی ہیں اور یہ دنیا کا سب سے زیادہ متنوع ملک ہے۔ ہان نسل کے لوگ اکثریت میں ہیں جبکہ چین کی 56 نسلی اقلیتیں اپنی رنگارنگ ثقافتوں کے ساتھ ہم آہنگی سے رہ رہی ہیں۔ میں نے چین میں خوبصورت ترین تاریخی مسجدیں اور مزار دیکھے ہیں جنہیں چینی حکام نے کمال احتیاط سے محفوظ بنا رکھا ہے۔

چین کے جغرافیائی خطے بہت منفرد اور متنوع ہیں جو بے مثل خصوصیات کے حامل ہیں اور ان کے اپنے مسالے دار مرغن کھانے ہیں۔ جنوب مغربی چین کے علاقے نہایت خوبصورت ہیں، ان میں تبت، شِن جیانگ (سنکیانگ)، سچوان، یُنان اور گائی ژو جیسے صوبے ایسے حسین و جمیل منظر پیش کرتے ہیں جو دل و نگاہ کو کھینچتے ہیں۔ اس خطے کے ساتھ میری گہری ذاتی وابستگی رہی ہے جیسا کہ مجھے وہاں پاکستان کے قونصل جنرل کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا اعزاز حاصل ہوا اور اس عرصے میں اس خطے نے میرے دل و دماغ میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ قونصل خانہ جنوب مغربی چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کی نگرانی کرتا ہے۔

سچوان کا دارالحکومت چینگڈو دنیا بھر میں اپنے خوبصورت پانڈوں کے لیے مشہور ہے۔ چینگڈو شہر کا جی ڈی پی تقریباً 250 بلین ڈالر ہے جبکہ اس کے اردگرد ورلڈ کلاس انفراسٹرکچر تعمیر کیا گیا ہے۔ چینگڈو میں جے ایف 17 تھنڈر

طیارے تیار کرنے کا کارخانہ بھی ہے۔ یہ لڑاکا طیارہ پاکستان ایرو ناٹیکل کمپلیکس اور چینگڈو ایئر کرافٹ انڈسٹریل کارپوریشن لمیٹڈ کے مابین ایک جوائنٹ وینچر کے طور پر تیار کیا جا رہا ہے۔ پاک فضائیہ کی ایک ٹیم اس طیارے کی مشترکہ ترقی اور پیداوار کے لیے چینگڈو میں تعینات ہے۔

برسوں میں چین نے اپنے تعلیمی اداروں اور اپنے ایس اینڈ ٹی سیکٹر کو ترقی دینے میں ناقابل یقین اقدامات کیے ہیں۔ چین کو اب اپنی بعض ورلڈ کلاس یونیورسٹیوں پر فخر ہے اور وہ مصنوعی ذہانت، کلاؤڈ کمپیوٹنگ اور بگ ڈیٹا میں ریسرچ کے میدان میں سرفہرست ہے۔

چین کی مختلف یونیورسٹیوں میں اس وقت تقریباً 28 ہزار پاکستانی طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ یہ طلبہ پاکستان اور چین کے لیے عظیم سرمایہ ثابت ہوں گے اور دونوں ملکوں کے درمیان مضبوط تر پُل تعمیر کریں گے۔ چین کی مختلف یونیورسٹیوں میں کئی پاکستانی اسٹڈی سنٹر اور اردو زبان کے شعبے قائم ہو چکے۔ یہ تعلیمی مراکز دونوں ملکوں کے مابین تعلیمی و تحقیقی روابط کو ترقی دینے کے لیے اہم علمی مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستانی یونیورسٹیاں چین کی یونیورسٹیوں کے ساتھ ایم او یوز (MoU's) سائن کر رہی ہیں تاکہ مختلف شعبوں میں تعاون کو فروغ دے سکیں۔

پاکستان نے سات چینی صوبوں کے ساتھ سسٹر پراونس ریلیشنز اور تیرہ چینی شہروں کے ساتھ سسٹر سٹی ریلیشنز بھی استوار کیے ہیں۔ پاکستان اور چین نے 2019ء کو سسٹر سٹی اور سسٹر پراونس ریلیشن شپ کے سال کے طور پر منایا ہے۔

چین میں سیاحت اس کے فراواں سیاحتی مقامات اور بیش از بیش سیاحتی ماحول کے باعث عروج پر ہے۔ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سیاح ایک مثالی سفری منزل کے طور پر چین کا رخ کر رہے ہیں۔ ہمیں پاکستان اور چین کے مابین سیاحت کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔

اقبالؒ اور صوفیا

روم رحمۃ اللہ علیہ سے اقبالؒ کو روحانی فیض پہنچا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی تمام زندگی دین اسلام کی حیات بخش تعلیمات اور امت مسلمہ و مرحومہ کی بیداری اور احیاء کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں 6 اکتوبر 1911ء میں اپنا مرشد لکھتے ہوئے فرمایا:

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے۔ آپؒ نے بہت سے اولیاء اللہ کے مزارات کی نہ صرف زیارت کی بلکہ جا بجا ان کی مدح و ثناء بھی کی ہے۔ آپ کے مدحیہ اشعار آپ کی صوفیا اور اولیاء سے محبت و عقیدت کا اظہار ہیں۔

اس برس چینی قوم عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا 71 واں جشن منا رہی ہے جو تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اگلے سال پاکستان اور چین دونوں ملکوں کے مابین سفارتی تعلقات کے قیام کا 70 واں جشن منا رہے ہیں۔ ہم ان جشنوں کو روایتی جوش و خروش کے ساتھ منانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں جس سے پاکستان اور چین کے عظیم عوام قریب تر ہو جائیں گے اور ہمارے ابدی روابط مزید مضبوط ہوں گے ◆◆◆

(صاحبِ مضمون مدثر ٹیپو، آکسفورڈ گریجوایٹ ہیں اور وزارتِ خارجہ میں ڈائریکٹر جنرل (چائنہ) کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔)

افغانستان کی تقدیر چھے ہاتھوں میں

عبدالھادی خان

یا آپ جانتے ہیں، افغانستان امن معاہدہ پایۂ تکمیل پہنچانے والے تینوں راہنماؤں نے امریکا اور بھارت کی درسگاہوں میں تعلیم پائی؟

یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے جب برادر اسلامی ملک افغانستان میں متحارب سیاسی گروہوں کے مابین خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں کمیونسٹ گروہ کی پشت پناہی کرنے کی خاطر سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ ۱۹۹۰ء تک کمیونسٹ حکومت کے خلاف افغان مجاہدین پاکستان، امریکا اور سعودیہ کی مالی و عسکری امداد سے سوویت فوج سے نبرد آزما رہے اور آخر کار اُسے شکست دی۔

بدقسمتی سے فتح کے بعد مجاہدین کی مختلف تنظیمیں متنوع اختلافات کے باعث آپس میں دست و گریباں ہو گئیں۔ ۱۹۹۴ء میں ایک نئی سیاسی و مذہبی تنظیم، طالبان نے افغانستان

زلمے خلیل زاد　　اشرف غنی　　شیر محمد عباس

کے بیشتر علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ۲۰۰۱ء میں اسامہ بن لادن کی حمایت کرنے پر طالبان حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اِس بار امریکی فوج دندناتی ہوئی سرزمین افغانستان میں چلی آئی اور اَب تک وہاں براجمان ہے۔ پچھلے بیس سال سے طالبان امریکیوں، نیٹو اور اِن کی کٹھ پتلی افغان فوج سے لڑ رہے ہیں۔

گزشتہ ایک برس سے کوششیں جاری ہیں کہ طالبان اور اَفغان حکومت کے مابین امن معاہدہ طے پا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ بیالیس برس سے جاری جنگیں اختتام کو

پہنچیں اور اَفغان عوام سکون کا سانس لے سکیں۔ اِن جنگوں نے لاکھوں افغانوں کو غربت، جہالت اور بیماری کا شکار بنا دیا ہے۔ وہ نہایت اذیت ناک زندگی گزار رَہے ہیں۔

تین اہم راہنما:

افغان امن مذاکرات کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار تین شخصیات پر ہے..... اشرف غنی، شیر محمد عباس اور زَلمے خلیل زاد۔ اشرف غنی ستمبر ۲۰۱۴ء سے افغان صدر ہیں۔ شیر محمد عباس طالبان دورِ حکومت میں نائب وزیرِ خارجہ تھے۔ ۲۰۱۵ء سے طالبان کے سیاسی چیف چلے آ رہے ہیں۔ زلمے خلیل زاد اَمریکی حکومت کے نمائندۂ خصوصی برائے افغانستان ہیں۔

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ اِن تینوں پشتون رہنماؤں نے بیرونِ ملک تعلیم و تربیت پائی ہے۔ اشرف غنی اور زَلمے خلیل زاد اَمریکی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم رہے۔ انھوں نے پھر امریکا کے مختلف سرکاری اور نجی اداروں میں ملازمت بھی کی۔ شیر محمد عباس بھارت کی ملٹری اکیڈمی، دہرہ دون کے تربیت یافتہ ہیں۔

جب افغان امن مذاکرات کے یہ تینوں بنیادی کھلاڑی بیرونِ ممالک میں زیرِ تعلیم تھے، تو افغانستان میں عمومی طور پر امن و امان تھا۔ اشرف غنی اور زَلمے خلیل زاد، دونوں تبادلے کے طالبِ علم کی حیثیت سے امریکی اسکولوں میں پڑھتے رہے۔ پھر انھوں نے بیروت کی مشہور امریکن یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔

اُس وقت بیروت (لبنان) مشرقِ وسطیٰ کا پیرس کہلاتا تھا۔ وہاں شبینہ کلبوں کی بھرمار تھی جہاں دونوں افغان نوجوان اپنے ساتھیوں کے ساتھ رقص کرنے جاتے۔ ساحلوں پر دھوپ سینکی جاتی۔ اِس سیر و تفریح کے دوران دونوں کو مقامی لڑکیوں سے عشق ہو گیا۔ وہ لڑکیاں پھر بیاہ کے بعد اِن کی بیویاں بن گئیں۔

ملٹری اکیڈمی، دہرہ دون میں تعلیم پاتے ہوئے شیر محمد

عباس بھی چھٹیوں میں بھارتی شہروں کی سیر وتفریح کرتے تھے۔ ایک بار وہ بمبئی گئے تاکہ بالی وڈ کے مشہور پشتون اداکاروں یوسف خان (دلیپ کمار)، سنجے خان وغیرہ سے ملاقات کرسکیں۔ انھوں نے کچھ چھٹیاں جموں وکشمیر میں بھی گزاریں۔

جھوٹ ماسچ؟:

کیا یہ اتفاق ہے کہ بیرونِ ممالک تعلیم پانے

شاہ محمود قریشی اور عبداللہ عبداللہ

والے تینوں افغان نوجوان آج اپنے ملک میں امن وامان لانے کی خاطر بڑے حساس مذاکرات کررہے ہیں؟ بعض افغان دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ یہ تینوں امریکا کے ایجنٹ ہیں۔ وہ بذریعہ مذاکرات امریکی اسٹیبلشمنٹ کے مفادات پورے کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ امریکی فوج کو باعزت واپسی کا راستہ دیا جائے، افغانستان میں چین کے قدم نہ جمنے پائیں اور یہ کہ سرزمینِ افغاناں میں بھارت کا اثر ورسوخ برقرار رہے۔

تاہم افغان دانش وروں کی درج بالا سوچ غلط بھی ہو سکتی ہے۔ شیر محمد عباس نے ماضی میں ضرور بھارتی ملٹری اکیڈمی میں تعلیم پائی، لیکن اب وہ طالبان کے سیاسی نمائندے ہیں۔ لہٰذا وہ طالبان کے نظریات وخیالات پر گامزن رہ کر ہی امن مذاکرات میں شریک ہیں۔ اگر انھوں نے طالبان سے ذرا بھی غداری کرنے کی کوشش کی، تو انھیں فوراً ہٹا دیا جائے گا۔

اسی طرح اشرف غنی اور زلمے خلیل زاد کا بھی اپنا اپنا ایجنڈا ہے۔ نیز وہ نظریات اور شخصیت کے لحاظ سے بھی خاصے مختلف ہیں۔ سچ یہ ہے کہ بیالیس سال سے جاری طویل جنگیں ختم کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اندرون اور بیرون ملک اِن جنگوں کے کئی فریق بن چکے۔ اِن سب کو مطمئن کرکے امن معاہدہ کرنا کئی کٹھن مراحل اور مشکلات رکھتا ہے۔

چوتھا کھلاڑی:

مثال کے طور پر اشرف غنی کے سیاسی حریف، عبداللہ عبداللہ اُس ادارے کے سربراہ ہیں جس نے طالبان کے ساتھ ہونے والا امن معاہدہ منظور کرنا ہے۔ اِس ادارے کا نام ''شورائے عالی مصالحتِ ملّی'' (High Council for National

(Reconcilliation) ہے۔ ساٹھ سالہ عبداللہ عبداللہ کے والد پشتون ہیں اور والدہ تاجک۔ اِس لیے وہ پشتونوں کے حریف، تاجکوں کے لیے بھی نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ واضح رہے، افغانستان میں دو بڑے نسلی گروہ ہیں: پشتون (آبادی کا ۴۲ فی صد) اور تاجک (۲۷ فی صد)۔

عبداللہ عبداللہ نے پچھلے دو صدارتی انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے ہر بار جیت کا دعویٰ کیا۔ اِس باعث افغانستان میں سیاسی بحران نے جنم لیا۔ ۲۰۱۴ء میں بحران ختم کرنے کی خاطر عبداللہ صاحب کے لیے چیف ایگزیکٹو کا نیا عہدہ تخلیق کرنا پڑا۔ اِس بار بھی انھوں نے تنازع کھڑا کیا، تو اُن کے لیے ایک نیا ادارہ بنا دیا گیا۔

دلچسپ بات یہ کہ دورانِ افغان جہاد دو سال (۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۶ء) عبداللہ عبداللہ پشاور کے ایک اسپتال میں کام کرتے رہے۔ وہ بہ لحاظِ پیشہ ڈاکٹر ہیں، تاہم نظریاتی طور پر آج وہ بھارت کے قریب سمجھے جاتے ہیں۔ اِسی لیے خطرہ ہے کہ اگر اشرف غنی اور طالبان کے مابین امن معاہدہ ہوا اور نوہ عبداللہ صاحب کی توقعات پر پورا نہ اُترا، تو وہ رَنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے، موصوف کی سعی ہو گی کہ معاہدے کے ذریعے اُن کے مفادات کی بھی تکمیل ہو جائے۔

نظریات کا ٹکراؤ:

عبداللہ عبداللہ اور اَشرف غنی، دونوں نوجوانی میں سوشلسٹ نظریات کے حامی تھے۔ جبکہ زلمے خلیل زاد سرمایہ دارانہ نظام کو پسند کرتے۔ یہی وجہ ہے جب ۱۹۷۳ء میں افغان وزیرِاعظم محمد داؤد نے بادشاہ اَور اَپنے قریبی عزیز، ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹا، تو اشرف غنی نے اِس تبدیلی پر خوشی منائی۔ محمد داؤد مملکت کو جمہوریہ بنا کر صدر بن گئے تھے۔

زلمے خلیل زاد مگر اپنی تحریروں میں محمد داؤد کا تذکرہ اچھے الفاظ میں نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک بار مَیں وزیرِاعظم محمد داؤد کے قافلے میں شامل تھا۔ کسی بات پر خفا ہو کر وزیرِاعظم نے اپنے ڈرائیور کو بری طرح مارا، حتیٰ کہ دانتوں سے اُس کا ایک کان کاٹ ڈالا۔ یہ منظر دیکھ کر مَیں خوف سے تھرّ اُٹھا۔ محمد داؤد ایک ظالم حکمران تھے۔''

امریکن یونیورسٹی، بیروت میں ایک اور اَفغان نوجوان، اکرم فضل دونوں نوجوانوں کے ساتھ زیرِتعلیم تھا۔ وہ بتاتا ہے:

''اشرف غنی اور زلمے خلیل زاد کی شخصیات بالکل مختلف تھیں۔ اشرف غنی کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ وہ بیشتر وقت نت نئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے گزارتے۔ زلمے خلیل زاد مگر کتابی کیڑے نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کو سیر و تفریح بھی کرنی چاہیے تاکہ وہ زندگی سے لطف اُٹھا سکے۔''

اشرف غنی اپنے نظریات پر سختی سے جمے رہنے کے قائل ہیں۔ جبکہ زلمے خلیل زاد سمجھتے ہیں کہ انسان کو کچھ پانے کی خاطر مصالحت سے بھی کام لینا چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ طالبان کی سیاست میں آمد کے بعد اشرف غنی کی صدارت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اِسی لیے طالبان سے کسی قسم کا معاہدہ کرنے سے قبل یہ ضمانت چاہتے ہیں کہ وہ اپنے عہدے کی تکمیل تک افغان صدر رہیں گے۔ اشرف غنی کا کہنا ہے:

''زلمے خلیل زاد کی تمنا ہے، امن معاہدہ فی الفور طے پا جائے، لیکن وہ ہماری امنگوں پر پورا نہ اترا، تو افغانستان میں نئی خانہ جنگی ہو سکتی ہے۔''

قید اور پھر رہائی:

طالبان راہنما شیر محمد عباس بھی نشو و نما پاتے ہوئے

مختلف نظریاتی ادوار سے گزرے۔ ان کا تعلق صوبہ لوگار سے ہے۔ کابل یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ پھر ایک سرکاری پروگرام کے تحت بھارتی ملٹری اکیڈمی دہرہ دون چلے گئے۔ اُس وقت اکیڈمی میں زیرِ تعلیم بیشتر افغان اور بھارتی کیڈٹ کمیونسٹ تھے، تاہم ان کے ہم جماعت بتاتے ہیں کہ شیر محمد سیاسی و نظریاتی بحثوں سے دُور رہتے۔ وہ بہرحال عملی مسلمان تھے، شراب اور حرام کھانوں سے اجتناب کرتے۔

۱۹۷۹ء میں جب سوویت فوج نے حملہ کیا، تو شیر محمد پاکستان چلے آئے۔ وہاں وہ مشہور مجاہد رہنما، عبدالرب رسول سیاف کے ساتھی بن گئے۔ شیر محمد عباس جنگی فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی بھی اچھی بول لیتے۔ اِنھی خوبیوں کے باعث انھوں نے مجاہدین میں اہم مقام حاصل کرلیا۔

اِنھی دنوں شیر محمد عباس نے پاکستانی ایلیٹ خفیہ ایجنسی، آئی ایس آئی کے کمانڈروں سے دوستی کر لی۔ یقیناً بھارتیوں کو یہ جان کر دھچکا لگا ہوگا کہ جس افغان نے دہرہ دون میں جنگی تربیت پائی، وہ اِن کے حریفوں سے جا ملا۔ آئی ایس آئی سے قربت بعدازاں افغان راہنما کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

طالبان نے شیر محمد عباس کو نائب وزیرِ خارجہ بنایا تھا۔ اِس حیثیت سے وہ امریکا بھی گئے تھے تاکہ سپر پاور طالبان حکومت کو تسلیم کرلے، مگر اِنھیں ناکامی ہوئی۔ اِدھر طالبان انھیں شک و شبہے کی نگاہ سے دیکھتے۔ وجہ یہ ہے کہ دیگر طالبان رہنماؤں کی نسبت شیر محمد عباس آزاد خیال تھے۔ وہ اپنی بیگم کو ریسٹورنٹ اور بازار لے جاتے۔ اِنھیں بیوی کو گھر میں بند رکھنا پسند نہ تھا۔

۱۹۹۸ء میں امیر طالبان، ملا عمر کسی بات پر اِن سے ناراض ہوگئے۔ شیر محمد عباس نظر بند کر دیے گئے۔ اِن سے عہدہ بھی چھین لیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آئی ایس آئی کے افسروں نے معاملہ سلجھایا اور اِنھیں قید سے چھڑایا۔ بعدازاں ملا عمر نے اِنھیں نائب وزیرِ صحت مقرر کر دیا۔ آج وہ طالبان کے سیاسی چیف کی حیثیت سے اہم عہدے پر فائز ہیں۔ چین اور رُوس جیسے اہم ممالک کے دورے کر چکے۔

افغان امن مذاکرات چیونٹی کی چال سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ امریکی صدر ٹرمپ کی تو خواہش ہے کہ امریکا کی فوج ابھی افغانستان سے واپس آجائے، مگر امریکی فوج فوری طور پر واپسی نہیں چاہتی۔ اس کی تمنا ہے کہ امن مذاکرات میں امریکا کے مفادات کا پوری طرح خیال رکھا جائے۔ دراصل افغانستان اپنی جغرافیائی پوزیشن کے باعث آج بھی امریکی اسٹیبلشمنٹ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اِسی لیے امن مذاکرات بار بار تعطل کا شکار ہو جاتے ہیں اور کوئی ٹھوس پیش رفت تا حال سامنے نہیں آسکی لیکن یہ طے ہے کہ امریکی حکمران طبقہ اب افغان کٹھ پتلی حکومت برقرار رکھنے کی خاطر مزید اربوں ڈالر خرچ نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیے آنے والے مہینوں میں امریکی فوج کی واپسی کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ ◆◆◆

روشن ضمیر، مردِ مومن

شاعرِ مشرق کی فکر اِن کی نثری تصانیف کی روشنی میں

پڑھیے صفحہ نمبر 89

بادشاہ سلامت اور دانا وزیر

اشتیاق احمد

"ہمیں ہمارے ذمہ دار مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ کھجور والی سلطنت کا بادشاہ ہم پر حملہ آور ہونے کے لیے وافر جنگی ساز و سامان جمع کر رہا ہے۔ ممکنہ حملے کے پیش نظر ہم نے بھی اپنی عظیم سلطنت کے وسیع تر مفاد میں ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔"

تمام درباری ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم دشمن کو حملے کا موقع نہ دیں اور پہلے ہی اس پر حملہ کر دیں۔ آپ سب کا اس بارے میں کیا مشورہ ہے؟"

ایک کے سوا، تمام درباریوں نے بادشاہ سلامت کے فیصلے کو بھرپور انداز میں سراہا اور باری باری جوشیلے انداز میں بادشاہ سلامت کو ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی بھی کرائی۔ حاضرین کی حمایت نے بادشاہ سلامت کو مسرور و مطمئن کر دیا۔

"اے محترم دانا وزیر! آپ کیوں خاموش ہیں؟ کیا آپ ہمارے فیصلے سے متفق نہیں؟"

بادشاہ سلامت سر جھکائے کھڑے خاموش دانا وزیر کی جانب متوجہ ہوئے۔

"بادشاہ سلامت! اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟" دانا وزیر نے دست بستہ عرض کیا۔

"اے محترم وزیر! آپ اطمینان کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔"

"حضور! اس علاقے کی تمام چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ہماری عظیم سلطنت کی بے پناہ طاقت سے بخوبی واقف ہیں۔ کوئی بادشاہ ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہمارے لیے بہتری یہی ہے کہ ہم پہل نہ کریں۔ اگر کوئی ہم پر حملہ کرتا ہے تو ہمیں خود کو بچانے کا پورا حق حاصل ہے۔ پہلے حملہ کرنے سے علاقے میں ہماری بدنامی ہو گی۔ حضور! میری وفاداری پر شک نہ کیا جائے۔ اس عظیم سلطنت کے لیے میرے آباؤ اجداد کی خدمات سے سب آگاہ ہیں۔ اس کے تحفظ کی خاطر میں ہر وقت جان کی قربانی کے لیے تیار ہوں۔

"آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ مسلسل جنگوں کی وجہ سے ہمارے خزانے پر بوجھ بہت بڑھ چکا۔ محصولات میں اضافے کی وجہ سے رعایا میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ فوج میں بھرتی کے خوف سے نوجوان گھروں سے بھاگ رہے ہیں۔ مسلسل جنگی مہمات کو ہماری رعایا بھی پسند نہیں کر رہی۔ ہم جنگ کے اخراجات کو اپنی رعایا کے لیے کتب خانے، پل، باغات، مسافر خانے اور شفاخانے بنانے پر صرف کر سکتے ہیں۔"

بادشاہ سلامت بولے: "اے وزیر دانا! آپ کی ساری باتیں بجا لیکن ہمارا فیصلہ اٹل ہے۔ ہم اپنی رعایا کو جنگ کے حملے کے خوف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی طاقتیں مل کر کبھی بھی کسی بڑی طاقت کو ختم کر سکتی ہیں۔ اگر ہم اپنے دشمنوں کی سرکوبی نہیں کریں گے تو وہ ہمارے خلاف سازشوں سے باز نہیں آئیں گے۔ مفتوح سلطنتوں سے حاصل ہونے والے زر و جواہر اور خراج سے ہم نے اپنی رعایا کو بھی نوازا ہے اور آئندہ بھی نوازتے رہیں گے۔"

دربار برخاست ہونے کے بعد سوائے دانا وزیر کے، سب بادشاہ سلامت کے فیصلے کی تعریف کر رہے تھے۔ دانا وزیر نے دربار سے نکل کر آسمان کی طرف دیکھا، آہ سرد بھری اور سر جھکاتے ہوئے اپنے محل کی طرف چل دیا۔ کاش بادشاہ سمجھ پاتا کہ سلطنت کی طاقت جنگ نہیں، رعایا کا سکون ہوتا ہے۔ ◆◆

سید عاصم محمود

"بابری مسجد کے نیچے مندر نہیں مساجد تھیں"

سنگھ پریوار کی مکاری عیاں کرتا دو ہندو ماہرین اثریات کے سنسنی خیز انکشافات

ڈی این جھا

سپریا ورما

۵ فروری ۲۰۲۰ء کو بھارتی سپریم کورٹ نے فیصلہ سنایا تھا کہ اٹھائیس سال قبل انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہونے والی بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی مندر تعمیر کیا جائے۔ یہ انصاف و قانون کا کھلم کھلا قتل اور اکثریت کا اقلیت پر ظلم تھا۔ سپریم کورٹ نے تاہم یہ ضرور تسلیم کیا کہ بابری مسجد شہید کر کے مسلمانوں کے ساتھ انصافی کی گئی، مگر ۳۰ ستمبر ۲۰۲۰ء کو بھارت کی ایک خصوصی عدالت نے اُن ''۴۹'' انتہا پسندوں کو بے گناہ قرار دے دیا جو مسجد کی شہادت میں ملوث تھے۔ گویا بھارتی عدلیہ نے بابری مسجد شہید کرنے کا غیر اخلاقی اور غیر قانونی فعل جائز قرار دے ڈالا۔ یہ انصاف کو پیروں تلے روندنے کی خوفناک مثال ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

بھارتی عدلیہ نے انتہا پسندوں کے حق میں فیصلے سناتے ہوئے بنیادی دلیل یہ دی:

''ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بابری مسجد جس جگہ واقع ہے، وہاں شری رام چندر (دیوتا شیو کے اوتار) نے جنم لیا۔ اِس لیے وہاں رام جنم بھومی مندر ہی بننا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اِس بارے میں ہندو مورخین اور ماہرینِ آثارِ قدیمہ کیا کہتے ہیں؟

سکّے کا دوسرا رُخ

بھارت میں مؤرخین اور ماہرینِ اَثریات دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ سنگھ پریوار (انتہا پسند ہندو جماعتوں) سے قربت رکھنے والے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ ایودھیا ہمیشہ ہندوؤں کا شہر رہا ہے اور یہ کہ وہاں ایک رام جنم بھومی مندر موجود تھا جس کو منہدم کر کے بابری مسجد تعمیر کی گئی، لیکن غیر جانب دار اور منصف مزاج ہندو مؤرخین و ماہرین اَثریات سکّے کا دوسرا رُخ نمایاں کرتے ہیں۔

پروفیسر رام شرن شرما (متوفی ۲۰۱۱ء) مشہور بھارتی مؤرخ گزرے ہیں۔ دہلی اور پٹنہ یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ قدیم بھارتی تاریخ اُن کا خاص موضوع تھا جس پر اُنھوں نے کئی کتب بھی تصنیف کیں۔ ۱۹۸۴ء کے بعد سیاست میں قدم جمانے کے لیے سنگھ پریوار نے بابری مسجد کو متنازع بنایا، تو پروفیسر رام شرن نے ایودھیا کی قدیم تاریخ پر ایک کتاب Communal History and Rama's Ayodhya قلم بند کی۔ اِس میں وہ انکشاف کرتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے کہ ایودھیا ماضی میں ہندوؤں کا مرکز رہا ہے۔

وہ لکھتے ہیں، (ہندوؤں کی مقدس کتابوں) وید اور پران میں درج نہیں کہ ایودھیا مذہبی یاترا کا مرکز تھا۔ اِسی طرح ۱۵۷۴ء میں جب رام کے پرستار مشہور شاعر تلسی

چیدہ چیدہ

☆ بھارت میں مؤرخین اور ماہرینِ اثریات دو گروہوں میں منقسم ہیں۔

☆ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بابری مسجد وہ جگہ ہے جہاں ان کے بھگوان شری رام چندر نے جنم لیا

☆ پروفیسر رام شرن انکشاف کرتے ہیں، یہ جھوٹ ہے کہ شہر ایودھیا ماضی میں ہندوؤں کا مرکز رہا ہے۔

☆ ماہرین کے مطابق ایودھیا ایک خیالی شہر ہے جسے پہلی بار رامائن کی داستان میں بیان کیا گیا۔

☆ غیر جانب دار ماہرین کی رُو سے ایودھیا کے علاقے میں صوفیا اور بزرگانِ دین کی تبلیغ سے اسلام پھیلا۔

☆ حیرت کی بات ہے کہ بی بی لال نے ۱۹۸۰ء میں ایودھیا میں کھدائی مکمل کی اور پھر دس سال خاموش بیٹھا رہا۔

☆ ایک بھی شہادت موجود نہیں کہ بابری مسجد کے نیچے ایک مندر موجود تھا۔

☆☆☆

داس نے اپنی مذہبی نظم 'رام چرت مانس' لکھی، تو اس میں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں رام پیدا ہوتی ہے۔

مؤرخین کی رُو سے ماضی میں ایودھیا کا نام ''سکیت'' تھا۔ یہ ہندوؤں کے مخالف اور گوتم بدھ کے پیروکار بدھیوں کا اہم مرکز تھا۔ یہاں گوتم بدھ کے باپ، شدو دھتو نے کئی عمارات تعمیر کرائی تھیں جو ایک سلطنت کا راجا تھا۔ گوتم بدھ بھی یہاں مقیم رہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں ایک چینی سیاح، فاشین سکیت آیا تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ یہاں ایک اسٹوپا میں بدھا کے آثار (روزمرہ استعمال کی اشیا) محفوظ ہیں۔

دو صدیوں بعد ایک اور چینی سیاح، پستن تنگ، سکیت آیا۔ وہ سفرنامے میں لکھتا ہے کہ شہر میں تین ہزار بدھی آباد ہیں جبکہ تھوڑے بہت غیر بدھی (برہمن اور دیگر بت پرست) بھی بستے ہیں۔ سکیت میں تب بدھیوں کی ایک سو خانقاہیں اور دس بڑے معبد موجود تھے۔ گویا چینی سیاحوں کی شہادتوں سے سنگھ پریوار کا یہ دعویٰ باطل قرار پاتا ہے کہ ماضی میں ایودھیا ہندوؤں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

تاریخ مسخ کردی

دورِ جدید کے مورخین کا دعویٰ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں برہمن گپتا خاندان کی فوج نے سکیت پر قبضہ کرلیا تھا۔ انھوں نے پھر شہر میں کئی بدھی معبد اور خانقاہیں تباہ کردیں۔ انھوں نے بدھیوں کے خلاف برہمنوں کی فتح یادگار بنانے کے لیے سکیت کو ایودھیا کا نام دے ڈالا۔ واضح رہے رام بنیادی طور پر برہمنوں کا دیوتا ہے۔ وہی رام کی جائے پیدائش ایودھیا کو قرار دیتے ہیں، مگر ماہرین کے مطابق یہ ایک خیالی شہر ہے جسے پہلی بار رامائن کی داستان میں بیان کیا گیا۔ گویا رام ایک تصوراتی کردار ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ماضی میں اِس نام کا کوئی بادشاہ گزرا ہو۔

بھارت کے غیر جانب دار مورخین و ماہرینِ اثریات کا

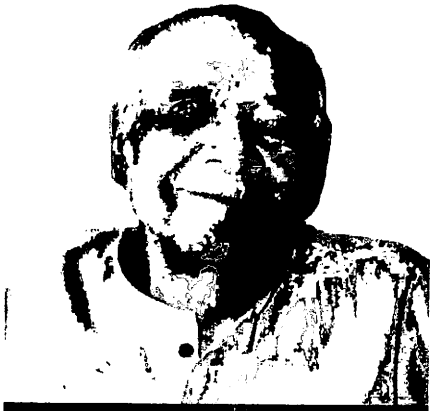

پروفیسر رام شرن شرما

کہنا ہے کہ سنگھ پریوار سے منسلک تاریخ دانوں نے ایک مقصد کے تحت بیسویں صدی میں اپنی کتب تحریر کی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہندو عوام کو دکھایا جائے، ہندوستان میں آنے کے بعد مسلمان مسلسل ہندوؤں کا قتلِ عام کرتے رہے، اُنھوں نے مندر تباہ کردیے یا پھر اِن کی جگہ مساجد تعمیر کرلیں۔ گویا سنگھ پریوار کے مورخین نے انتہا پسندانہ نظریات (ہندتوا) کی ترویج کو اپنا شعار بنالیا، مگر یہ بھارت کی تاریخ مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

صوفیا کا بڑا مرکز

غیر جانب دار بھارتی ماہرینِ تاریخ و اثریات کی رو سے کم از کم ایودھیا میں مسلمانوں نے مقامی آبادی کا کوئی قتال نہیں کیا اور نہ ہی اِن کی عبادت گاہوں پر قبضے کیے۔ حقیقت میں ایودھیا کے علاقے میں صوفیا اور بزرگانِ دین کی تبلیغ سے اسلام پھیلا۔ اِن کی تبلیغ سے ہزارہا بت پرست مسلمان ہوگئے۔ رفتہ رفتہ یہ علاقہ صوفیائے اسلام کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔

بزرگانِ اسلام برہمنوں کے برعکس ذات پات کے

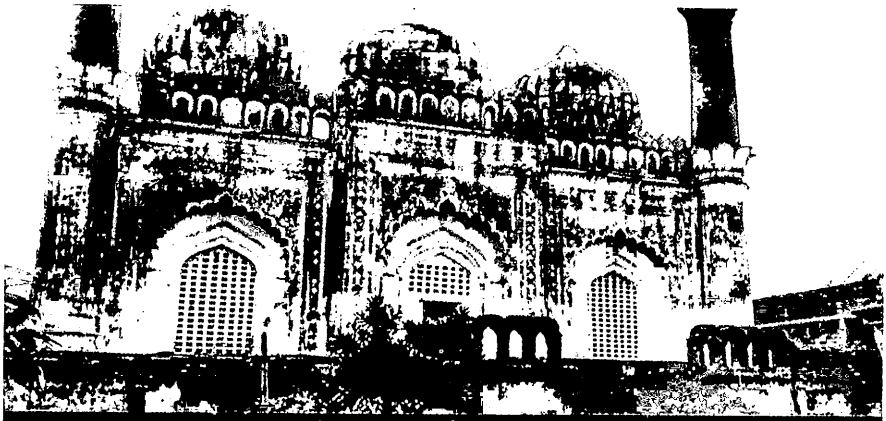

ایودھیا میں اورنگزیب عالمگیر کی بنائی گئی عالمگیری مسجد

نظام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے بھائی چارے، محبت اور اِنسان دوستی کا پیغام دیا۔ اسی لیے ہزاروں بت پرست صوفیائے کرام کے گرد جمع ہو گئے۔ اِن میں زیادہ تر نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بیچارے ظالم و جابر برہمنوں کے ستائے ہوئے تھے۔ ایودھیا میں اسلام کی آمد سولہویں صدی میں بابری مسجد کی تعمیر سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔

آج بھی ایودھیا کے مسلمان اپنے شہر کو ''مقدس'' مانتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس سرزمین میں کئی صوفیا کے مزار ہیں۔ (اگرچہ انتہا پسند ہندو پچھلی نصف صدی میں اکثر مزار شہید کر چکے)۔ وہاں آنے والے اوّلین بزرگانِ دین میں قاضی قدر الدین اودھی مشہور ہیں جو وسطی ایشیا سے آئے۔ وہ ممتاز صوفی، حضرت عثمان ہارونیؒ کے مرید تھے۔ مشہور ہندوستانی بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی حضرت عثمان ہارونیؒ کے خلیفہ تھے۔

ایودھیا کے ایک اور ممتاز صوفی، شیخ جمال گوجریؒ گزرے ہیں۔ اِن کا تعلق فردوسیہ سلسلے سے تھا۔ روایت ہے کہ شیخ جمال باہر نکلتے، تو اکثر اُن کے سر پر ایک ڈول ہوتا۔ اس میں چاول بھرے ہوتے۔ جب کوئی غریب دکھائی دیتا، تو اسے ایک مٹھی چاول دے دیتے۔ چونکہ مقامی گوجر بھی سروں پر دودھ کے ڈول لیے ہوتے، لہٰذا اُن کی دیکھا دیکھی شیخ جمال گوجری کی عرفیت سے مشہور ہو گئے۔ حضرت موسیٰ عاشقینؒ انھی شیخ جمال کے شاگرد تھے۔ روایت ہے کہ ظہیر الدین بابر ہندوستان پر حملہ کرنے سے قبل فقیر کے بھیس میں ایودھیا آیا تھا، تب اُسے موسیٰ عاشقین نے فتح کی بشارت دی تھی (لیکن مسلم مؤرخین کے مطابق یہ روایت انیسویں صدی کے اواخر کی ایجاد ہے)۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ

اسلامی دارالحکومت، دہلی میں مقیم کئی نامور صوفیا کا تعلق ایودھیا سے رہا۔ مثلاً شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ ایودھیا ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے وہاں شیخ شمس الدین یحییٰ اودھیؒ سے ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں وہ دہلی چلے گئے تاکہ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا قرب پا سکیں، تاہم وہ ایودھیا آتے جاتے رہے تاکہ اپنے عزیز و اقارب

اور اساتذہ سے ملاقاتیں کرسکیں۔ ایودھیا میں خواجہ نظام الدینؒ اور شیخ نصیر الدینؒ کے کئی مرید بھی موجود تھے۔ ان میں شیخ زین الدین علی اودھی، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا قوام الدین اودھی اور شیخ علاء الدین علّی نے شہرت پائی۔

ایودھیا میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی بہن کا مزار بھی مرجع خلائق تھا۔ وہ نامور صوفی تھیں۔ ''بڑی بی'' کے عرف سے مشہور ہوئیں، مگر آج اُن کا مزار صفحۂ ہستی سے مٹ چکا۔ ایودھیا میں اب بہت کم مسلمان رہ گئے ہیں۔ وہ بھی انتہا پسند ہندوؤں کے خوف سے سرِ عام اسلامی شعائر پر عمل نہیں کر پاتے۔ علاقے میں مزار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ مساجد بھی زبوں حالی کی تصویر بنی نظر آتی ہیں۔

شہر میں صرف وہ درگاہیں باقی ہیں جہاں مقامی ہندو مرد اور عورتیں من کی مرادیں پانے آتے ہیں۔ انھوں نے مسلمان صوفیا کی یادگاروں کو قائم دائم رکھا ہوا ہے۔ یہ تمام ہندو نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسلم صوفیا نے صدیوں قبل ان کے پرکھوں سے جو حسنِ سلوک کیا تھا، وہ اِسے بھول نہیں پائے اور آج بھی تن دہی سے ان کے مزاروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

ایودھیا میں پہلی کھدائی

ہندوستان میں محکمۂ آثارِ قدیمہ انگریزوں نے قائم کیا۔ بھارت میں یہ محکمہ ''آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا'' کہلاتا ہے۔ اِس کا پہلا سربراہ انگریز ماہرِ اثریات، الیگزینڈر کنگھم تھا۔ اسی نے سب سے پہلے ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۲ء ایودھیا میں کھدائی کرائی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایودھیا کے آثارِ قدیمہ کتنے پرانے ہیں۔ یہ کھدائی تین ٹیلوں پر ہوئی تھی۔

دو ٹیلوں کی کھدائی سے بدھوں کے اسٹوپا یا معبد برآمد ہوئے۔ ایک ٹیلے کے نیچے سے بدھی خانقاہ کے آثار ملے۔ الیگزینڈر کنگھم نے اِس کھدائی کی رپورٹ مرتب کی تھی۔ رپورٹ میں رام دیوتا سے منسلک روایات اور رسوم و رواج کا بھی ذکر ہے۔ وہ ایک رام جنم بھومی مندر کا بھی ذکر کرتا ہے۔

خاص بات یہ کہ اِس رام جنم بھومی مندر کا وہ بابری مسجد سے کوئی تعلق نہیں بتاتا۔ انگریز ماہر نے رپورٹ میں اِس بات کا بھی ذکر نہیں کیا کہ بابری مسجد رام دیوتا کی جائے پیدائش (جنم بھومی) پر بنائی گئی۔ کنگھم مزید لکھتا ہے کہ شہر میں برہمنوں کے کئی مندر ہیں، مگر وہ انیسویں صدی ہی میں بنائے گئے۔ اگرچہ اِس نے تعصب پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ضرور لکھا کہ شاید ہندوؤں کے قدیم مندر مسلمانوں نے تباہ کردیے تھے۔

معتصب بی بی لال

دوسری کھدائی

الیگزینڈر کنگھم کے بعد ایک سو سال تک کسی ماہرِ آثارِ قدیمہ نے ایودھیا کا رخ نہیں کیا۔ آخر ۱۹۶۹ء میں بنارس یونیورسٹی کے شعبۂ آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والی ایک ٹیم ایودھیا پہنچی۔ اس میں اے کے نارائن، ٹی این رائے اور پی سنگھ شامل تھے۔ انھوں نے بابری مسجد کے نزدیک مختلف مقامات کی کھدائیاں کیں۔

بنارس یونیورسٹی کے ماہرین نے کھدائی کی تفصیل اپنے ایک مضمون میں قلم بند کی جو 'انڈین آرکیالوجی ریویو' میں

شائع ہوا۔ یہ سالانہ جریدہ بھارتی محکمہ آثارِ قدیمہ چھاپتا ہے۔ مضمون زیادہ لمبا نہیں تھا۔ انھوں نے بس یہ بتایا کہ کھدائی سے ملنے والی اشیا سے ظاہر ہے کہ ایودھیا چھٹی صدی قبل مسیح میں آباد تھا۔ وہ پھر چھٹی صدی عیسوی تک مسلسل آباد رہا۔ بعدازاں وہ ویران ہوگیا۔

بی بی لال کی کھدائی

ایودھیا میں ایک اور بھارتی اثریات داں، بی بی لال زیادہ سرگرم رہا۔ وہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کا

بی بی لال کی کھینچی خود ساختہ تصویر

ڈائریکٹر جنرل تھا۔ ۱۹۷۲ء میں اُس نے ریٹائرمنٹ لی اور جیواجی یونیورسٹی، گوالیار سے منسلک ہوگیا۔ وہیں اِس نے ایک قومی منصوبے ''رامائن کے آثارِ قدیمہ'' کا آغاز کیا۔ اس منصوبے کا افتتاح ۱۹۷۵ء میں وزیرِ مملکت برائے تعلیم و ثقافت، سید نورالحسن نے کیا تھا۔

اگلے سال بی بی لال انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شملہ سے وابستہ ہوگیا۔ اِس ادارے اور محکمۂ آثارِ قدیمہ کی امداد سے پھر بی بی لال نے اگلے پانچ سال تک ایودھیا کے مختلف مقامات میں کھدائیاں کیں۔ آج تک اِن کھدائیوں کی مفصل رپورٹ شائع نہیں ہوئی، البتہ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۰ء کے انڈین آرکیالوجی ریویو میں چھپے مضامین میں اِن کے حوالے ضرور بیان ہوئے۔

دیگر ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے برعکس بی بی لال نے بابری مسجد کے قریب بھی کھدائی کی۔ (یاد رہے، بابری مسجد بھی ایک ٹیلے پر بنائی گئی ہے۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ وہاں ماضی میں تعمیرات ہوتی رہی ہیں)۔ بھارتی محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سالانہ شماروں میں چھپے مضامین سے پتا چلتا ہے کہ بی بی لال نے بھی اپنی تحقیق سے دریافت کیا کہ بابری مسجد کے اردگرد کا علاقہ چھٹی صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی عیسوی تک آباد رہا۔ پھر علاقے میں خاص تعمیرات نہیں ہوئیں۔ آخر گیارہویں صدی عیسوی کے بعد وہاں نئی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا۔

ایک حیرت انگیز انکشاف

بھارت کی سب سے بڑی قوم پرست ہندو تنظیم 'آر ایس ایس' ایک ماہانہ رسالہ ''منتھین'' شائع کرتی ہے۔ اِس کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں بی بی لال کا ایک طویل مضمون شائع ہوا۔ اِس میں ایک تصویر شائع ہوئی جو بقول بی بی لال کے بابری مسجد کے قریب کی گئی کھدائی سے متعلق تھی۔ تصویر میں اینٹوں کے تین ڈھیر نظر آتے ہیں۔ بی بی لال نے دعویٰ کیا کہ یہ ایک قدیم مندر کے ستونوں کی بنیادیں ہیں۔

بی بی لال نے دعویٰ کیا کہ بابر بادشاہ نے یہی مندر ڈھا کر بابری مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اُس نے اِن بنیادوں کو مندر کی موجودگی کا ثبوت قرار دیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بی بی لال نے ۱۹۸۰ء میں ایودھیا میں کھدائی مکمل کی تھی، لیکن وہ دس سال تک خاموش رہا اور اُس نے اِن بنیادوں کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتایا۔ اِن کے متعلق کسی علمی و تحقیقی رسالے میں

کچھ شائع نہ ہوا۔ پھر اچانک ایک انتہا پسند مذہبی تنظیم کے رسالے میں بی بی لال نے مندر کے ستونوں کی بنیادیں برآمد ہونے کا دعویٰ کر ڈالا۔

لاقانونیت اور افراتفری کا راج رہا تھا۔ انہدام کے بعد اگر بابری مسجد سے کچھ قدیم اشیا برآمد ہوئی تھیں، تو وہ غائب ہو گئیں۔ پانچ چھے دن بعد ہی پولیس اور فوج شہید مسجد کے

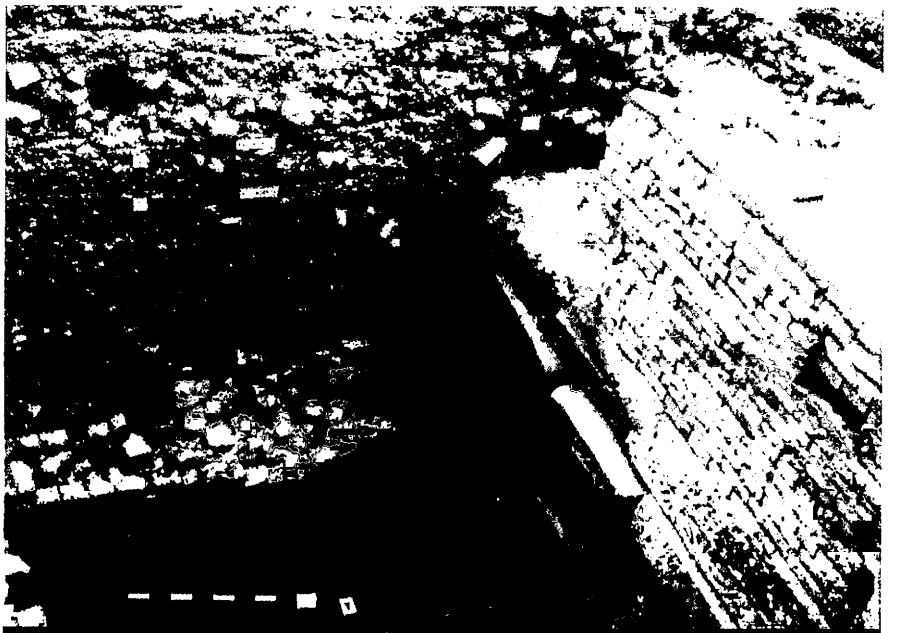

مغربی دیوار جو دراصل چھوٹی مسجد کی ہے

اِس مضمون کو سنگھ پریوار کے دیگر مؤرخین اور ماہرینِ اثریات لے اُڑے۔ قوم پرست ہندو میڈیا نے اِس تحقیق کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ وہ پھر حکومت سے مطالبہ کرنے لگا کہ بابری مسجد کے نیچے کھدائی کرائی جائے تاکہ مندر کی موجودگی کے مزید ثبوت سامنے آسکیں۔ یہ مطالبہ زور شور سے کیا جارہا تھا کہ سنگھ پریوار نے باقاعدہ منصوبہ بنا کر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کر دی۔

موقع پر موجود انتہا پسندوں نے مسجد کا بیشتر ملبہ ایک جگہ جمع کیا اور وہاں عارضی مندر قائم کر دیا۔ اِس جگہ تین دن تک علاقے کو گھیرے میں لے سکی۔

ہائی کورٹ کا حکم

کچھ عرصہ بعد بی بی لال اور سنگھ پریوار کے دیگر ماہرینِ آثارِ قدیمہ حکومت پر زور دینے لگے کہ وہ بابری مسجد کے نیچے کھدائی کرائے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ کھدائی سے ایک مندر کے آثار مل جائیں گے۔ آخر اگست ۲۰۰۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ نے بابری مسجد کی جگہ کھدائی کا حکم دے ڈالا۔ یہ کھدائی مارچ تا اگست ۲۰۰۳ء میں بھارتی محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی نگرانی میں انجام پائی۔

کھدائی سے برآمد شدہ ستون کی بنیاد جو جعلی ہے

اس زمانے میں بی جے پی کی حکومت تھی۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ یہ حکومت محکمے کے سرکاری ماہرین پر شدید دباؤ ڈالے گی کہ وہ بابری مسجد کے نیچے سے کسی نہ کسی طرح مندر کی موجودگی ثابت کردیں۔ اسی لیے مسلم تنظیموں نے فیصلہ کیا کہ کھدائی کے دوران اِن کی نمائندگی کرنے والے ماہرینِ آثارِ قدیمہ بھی موجود ہوں گے۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے اِن کا مطالبہ تسلیم کرلیا۔

مسلم تنظیموں نے پھر سپریا ورما (Supriya Varma) اور جے مینن (Jay Menon) کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے نامزد کیا۔ اُس وقت سپریا ورما نئی دہلی کی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں اثریات کی پروفیسر جبکہ جے مینن گوالیار مین واقع شیونادر یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ تھی۔ یہ دونوں پھر پانچ ماہ تک بابری مسجد کی جگہ ہوتی کھدائی کا جائزہ لیتے رہے۔

ہندو ماہرین کی چشم کشا گفتگو

فروری ۲۰۲۰ء میں جب سپریم کورٹ نے رام جنم بھومی مندر کی تعمیر کا حکم دیا، تو امریکی اخبار 'ہفنگٹن پوسٹ' نے پروفیسر سپریا ورما اور پروفیسر جے مینن کا چشم کشا انٹرو شائع کیا۔ اِس میں دونوں اساتذہ کھدائی کے حوالے سے حیرت انگیز انکشافات ہمارے سامنے لائے۔ انٹرویو کے اہم مندرجات قارئین کی نذر ہیں۔

سوال: علمِ آثارِ قدیمہ کی رو سے کیا یہ شہادتیں موجود ہیں

کہ بابری مسجد کے نیچے ایک مندر موجود تھا؟

جواب: ایک بھی شہادت موجود نہیں۔ آج بھی کسی قسم کی اثریاتی شہادت سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ بابری مسجد کے نیچے مندر موجود تھا۔

سوال: آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ماہرینِ اثریات کا مگر دعویٰ ہے کہ یہ مندر موجود تھا۔ ان کے پاس کس قسم کے ثبوت ہیں؟

جواب: سرکاری ماہرین نے چھے ماہ کھدائی کے بعد مندر کی موجودگی کے ''تین شواہد'' ملنے کا دعویٰ کیا، تاہم علمی و تحقیقی سطح پر اِن شواہد کی بنیاد پر مندر موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بہرحال اُن کا دریافت کردہ پہلا ثبوت ایک مغربی دیوار ہے۔ دوسرا ثبوت پچاس ستونوں کی بنیادیں ہیں اور تیسرا ثبوت خودساختہ مندر کے اثریاتی ٹکڑے (Fragments) ہیں۔

ہمارے نزدیک مغربی دیوار مندر نہیں، بلکہ ایک مسجد کی نشانی ہے۔ یہ ثابت کرتی ہے کہ بابری مسجد کی جگہ پہلے بھی ایک مسجد موجود تھی۔ یہ وہ دیوار ہے جس کے آگے منبر بنایا جاتا ہے۔ اِسی جگہ امام مسجد نماز پڑھاتا ہے۔ اِس قسم کی دیوار مندر میں نہیں ملتی۔ مندر کا تعمیراتی ڈیزائن بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مغربی دیوار حقیقتاً اِس بات کا ثبوت ہے کہ بابری مسجد سے قبل اِس جگہ چھوٹی مسجد تعمیر کی گئی تھی۔

اب آیئے دوسرے ثبوت یعنی وہ پچاس بنیادیں جن پر سرکاری ماہرینِ اثریات کی رو سے ایک مندر کے ستون ایستادہ تھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بنیادیں جعلی ہیں۔ انھیں اِدھر اُدھر سے اینٹیں، مٹی، ریت اور گارا لا کر خود ہی بنایا گیا۔ گویا یہ کھدائی سے برآمد نہیں ہوئی۔ ہم نے الہ آباد ہائی کورٹ میں بھی گواہی دی تھی کہ ستونوں کی بنیادیں خودساختہ ہیں۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ آپ اِن بنیادوں کو دیکھیں، تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور ریت مٹی کا ملغوبہ ہیں۔ اب آپ خود سوچیے کیا ایسے عظیم الشان مندر کے ستون ایسی کمزور اور بھربھری بنیادوں پر کھڑے ہو سکتے تھے جو پچاس ستونوں پر مشتمل تھا؟ ایسی کمزور بنیاد پر تو عام ستون بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔

ستونوں کی جعلی بنیادوں سے عیاں ہے کہ بابری مسجد کے نیچے کوئی مندر موجود نہ تھا۔ یہ سراسر سیاسی معاملہ ہے۔ بی جے پی اپنی مشہوری کے لیے مندر برآمد کرانا چاہتی تھی، سو اِس نے دھوکے بازی اور مکاری سے کام لے کر اپنا مقصد پورا کر لیا۔ سرکاری ماہرین نے کسی نہ کسی طرح ستونوں کی فرضی بنیادیں بنائیں اور حکومتی احکامات پر عمل درآمد کر دیا۔

سوال: مندر کے اثریاتی ٹکڑوں کی بابت آپ دونوں ماہرین کیا کہتے ہیں؟

جواب: آرکیالوجیکل سروے کے ماہرین کا دعویٰ ہے، انھیں بابری مسجد کے نیچے سے ماضی کی عمارت کے چار پانچ سو اثریاتی ٹکڑے ملے ہیں۔ اِن کے نزدیک بارہ ٹکڑے سب سے اہم ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ تمام ٹکڑے کھدائی سے برآمد نہیں ہوئے، بلکہ یہ انھیں چونے کے پتھر سے بنی مسجد کے فرش سے ملے۔ اِن ٹکڑوں میں ایک ٹکڑا جوڑے کی مورتی سے مشابہ ہے۔ ماہرین نے اسے ''رام سیتا کی جوڑی'' کا خطاب دیا، مگر وہ ٹکڑا ابھی آدھا ٹوٹا ہوا ہے۔ بس ماہرین کو یہی ٹکڑے مسجد کی جگہ سے ملے۔

سنگھ پریوار کے مؤرخین اور ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا دعویٰ ہے کہ بابری مسجد کی جگہ عظیم الشان رام جنم بھومی مندر ایستادہ تھا۔ یہ مندر پتھر سے بنایا گیا تھا، اگر یہ مندر حقیقت میں موجود ہوتا، تو اِس کے کئی پتھریلے ٹکڑے کھدائی سے ملنے چاہئیں تھے، مگر ماہرین کو ایک پتھریلا ٹکڑا ابھی وہاں سے نہیں ملا۔

سوال: آدھے ٹکڑے پر مشتمل وہ مورتی کتنے سال پرانی ہے؟

جواب: پتھریلے ٹکڑے کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ سائنسی طریقوں کی مدد سے مختلف اشیا سے بنے اِس انبار (Deposit) کی عمر کا تخمینہ لگاتے ہیں جو ایک جگہ سے کھدائی کے بعد برآمد ہوا۔ اِس انبار میں نامیاتی مادہ شامل ہوتا ہے اور ہڈیاں، ڈھانچے، چارکول وغیرہ بھی۔ سرکاری ماہرین نے مورتی نما آدھے ٹکڑے کی عمر کا اندازہ لگایا ہے، مگر واضح رہے کہ وہ مسجد کے نیچے سے برآمد نہیں ہوا، بلکہ فرش پر پڑا ملا ہے۔

سوال: گویا یہ بارہ ٹکڑے کہیں اور سے لاکر وہاں رکھ دیے گئے؟

جواب: شاید ایسا ہی ہوا۔ ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال اِن ٹکڑوں کی عمر کا تخمینہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ یعنی یہ ٹکڑے مسجد کی جگہ مندر ہونے کی تصدیق نہیں کرتے۔

سوال: ستونوں کی بنیادوں کی عمر کا تعین ہوسکتا ہے؟

جواب: مسجد کے فرش کی عمر کا تعین ناممکن ہے۔ ہمارے نزدیک یہ فرش بارہویں سے پندرہویں صدی کے دوران تعمیر ہوئے۔ واضح رہے کہ یہ فرش مختلف تہیں رکھتا ہے۔ فرش کی بالائی تہ بابری مسجد سے تعلق رکھتی ہے۔

سوال: آرکیالوجیکل سروے والوں نے کیا اِس مندر کی تعمیر کے زمانے کا تعین کیا جو بقول اُن کے مسجد کی تہ سے برآمد ہوا؟

جواب: جی نہیں، اُنھوں نے اِس بابت کچھ نہیں کہا۔ رپورٹ میں بس یہ لکھا ہے کہ مسجد کے نیچے ایک مندر موجود تھا۔ بات ختم۔ اُنھوں نے یہ نہیں بتایا کہ مندر کتنا پرانا ہے۔

سوال: رپورٹ میں کیا درج ہے کہ مندر دسویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا؟

جواب: آرکیالوجیکل سروے کے ماہرین ایک طرف دعویٰ کرتے ہیں کہ مسجد کی تہ میں پچاس ستونوں والا عظیم الشّان مندر موجود تھا، مگر اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ستونوں کی بنیادوں کے نیچے گول دائرے میں بنا ایک مزار بھی ملا ہے۔ یہ مزار تین چار میٹر کا قطر رکھتا ہے۔ اُن کے مطابق یہ مزار دسویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا۔

لیکن ہم نے اِس کروی مزار کے قریب بنی دیواروں کا مشاہدہ کیا ہے۔ اِس خصوصی خندق کی نوٹ بک میں درج معلومات بھی پڑھیں۔ نوٹ بک میں درج ہے کہ وہ دیواریں ایودھیا پر حکمرانی کرنے والے گپتا حکمرانوں کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ گویا وہ کروی مزار بھی گپتا دور (چوتھی صدی تا چھٹی صدی) میں تعمیر ہوا تھا۔

سوال: آپ دونوں ماہرینِ آثارِ قدیمہ آرکیالوجیکل سروے کی بابری مسجد کی زمینی کھدائی کے دوران بطورِ مشاہدہ کار موجود رہے۔ بعدازاں آپ کو کس قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا؟

جواب: ہم خوش قسمت ہیں کہ ۲۰۰۴ء میں بی جے پی الیکشن ہارگئی۔ ہم نے پھر آرکیالوجیکل سروے کے مالی تعاون سے دو قدیم جگہوں پر کھدائیاں کیں، لیکن آج محکمہ آثارِ قدیمہ ہمیں ایک لحاظ سے بلیک لسٹ کر چکا۔ ہمیں کسی جگہ بھی کھدائی کرنے کی اجازت تک نہیں ملتی، مالی امداد دینا تو دور کی بات ہے۔

سوال: آرکیالوجیکل سروے کے سرکاری ماہرین نے اپنی رپورٹ میں مندر کے بارے میں کیا لکھا؟

جواب: آپ پوری رپورٹ پڑھ لیجیے، اِس میں بابری مسجد کے نیچے موجود خود ساختہ مندر کا کہیں ذکر نہیں۔ وہ ایک عام سی 'رپورٹ' ہے۔ اِس میں ہمیں خندقوں، مختلف تعمیرات اور زمانوں کے ابواب ملتے ہیں، قدیم برتنوں پر بھی ایک باب ملتا ہے، لیکن رپورٹ سے ہڈیوں اور ڈھانچوں کے متعلق باب غیر حاضر ہے۔ مسجد کی تہ سے انھیں ہڈیاں بھی ملی تھیں، مگر انھوں نے اِن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

رپورٹ میں ہر باب کے آخر میں اِن ماہرین کا نام درج ہے جنہوں نے اِسے قلم بند کیا، لیکن رپورٹ کے آخری باب میں کسی ماہرِ آثارِ قدیمہ کا نام نہیں لکھا۔ اِسی باب کے آخری پیراگراف میں یہ ذکر موجود ہے کہ تہِ مسجد سے مغربی دیوار، ستونوں کی بنیادیں اور تعمیرات کے ٹکڑے ملے ہیں اور یہ کہ بابری مسجد کے نیچے ایک مندر بھی موجود تھا۔

سرکاری ماہرینِ اثریات نے محض تین جملوں میں یہ معلومات فراہم کر دیں، لیکن پوری رپورٹ میں مغربی دیوار، ستونوں کی بنیادوں اور تعمیراتی ٹکڑوں کا تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی کسی قسم کے مندر کی موجودگی کا علم ہوتا ہے، لیکن ہم دونوں ماہرین نے کھدائی سے ملنے والی اثریاتی شہادتیں دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا ہے کہ بابری مسجد کے نیچے دو یا تین چھوٹی مساجد بنائی گئی تھیں۔

سوال: گویا آپ کی رائے کے مطابق بابری مسجد کے نیچے کوئی مندر موجود نہ تھا؟

جواب: جی بالکل، بابری مسجد کے نیچے کبھی کوئی مندر تعمیر نہیں ہوا۔ اگر ہم بہت پیچھے جائیں یعنی گپتا دور میں، تو تب مسجد کی جگہ بدھوں کا ایک اسٹوپا موجود تھا۔ یہ اسٹوپا چوتھی صدی سے چھٹی صدی عیسوی کے دوران تعمیر ہوا۔ گویا اِس جگہ سب سے پہلے بدھیوں نے اپنی عبادت گاہ بنائی۔ الیگزینڈر کنگھم نے بھی اپنی رپورٹ میں یہی بات لکھی ہے۔

ایودھیا میں بابری مسجد والے ٹیلے کے نزدیک کئی ٹیلے موجود ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انھی ٹیلوں پر بدھیوں نے اپنے اسٹوپا اور دِیگر تعمیرات بنائی تھیں۔ ممکن ہے کہ ایودھیا میں جینی مت کے پیروکاروں کی عبادت گاہیں بھی موجود ہوں۔ اِس مذہب کے اہم رہنماؤں کا بھی ایودھیا سے تعلق رہا ہے۔

ایودھیا سے ملنے والے آثارِ قدیمہ عیاں کرتے ہیں کہ دو ہزار سال پہلے ایودھیا بدھیوں کا بڑا مرکز تھا۔ بدھی اِس شہر میں دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی عیسوی تک آباد رہے۔ بعدازاں برہمنوں کی لُوٹ مار کے باعث یہ شہر ویران ہو گیا۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں اِسے مسلمانوں نے دوبارہ آباد کیا۔

ایودھیا میں بسنے والے مسلمانوں نے اپنی بستی بنائی، تو ایک چھوٹی مسجد بھی تعمیر کر لی۔ جب مسلم آبادی بڑھی، تو ساتھ ساتھ مسجد بھی وسیع ہوتی گئی۔ آخرکار ۱۵۲۸ء میں بابر یا اِس کے گورنر (میر باقی) نے وہاں ایک بڑی اور عالی شان مسجد تعمیر کروا دی۔

سوال: مطلب یہ کہ اِس داستان میں کوئی صداقت نہیں کہ بابر یا میر باقی نے بابری مسجد بنانے کے لیے ایک مندر ڈھایا تھا؟

جواب: آپ نے درست کہا۔ کوئی اثریاتی شہادت اِس روایت کی تصدیق نہیں کرتی۔ ہمارے علم کے مطابق اِس روایت نے اٹھارہویں یا انیسویں صدی میں جنم لیا۔ بعدازاں انگریزوں نے اپنی کتب کے ذریعے اِس روایت کو مشہور کر دیا۔ تاہم یہ روایت انیسویں صدی کے اواخر سے زبان زدِ عام ہوئی۔

یہی وجہ ہے، الیگزینڈر کنگھم نے ایودھیا کی کھدائی پر مرتب کردہ اپنی رپورٹ میں اِس روایت کا تذکرہ نہیں کیا کہ بابری مسجد ایک مندر گرا کر بنائی گئی۔ وہ دو سال (۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۲ء) ایودھیا میں رہا تھا۔ اُس نے تین مندروں کا ضرور تذکرہ کیا جنہیں روایات کی رو سے مسلم حکمرانوں نے گرایا تھا، مگر کوئی مندر بابری مسجد کے نیچے نہ تھا۔

سوال: محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ نے مقدمے پر اثرات مرتب کیے؟

جواب: الہ آباد ہائی کورٹ کے جس بینچ نے مقدمہ سنا، وہ تین ججوں پر مشتمل تھا۔ ایک جج، ایس یو خان مسلمان تھے اور دو ہندو۔ مسلم جج نے اثریاتی شہادتوں کی جانب زیادہ

توجہ نہیں دی۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ یہ ٹائٹل (Title) مقدمہ ہے، لہٰذا اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہاں (بابری مسجد کی جگہ) ماضی میں کون رہتا تھا۔ اِس کے اصل مالک حال میں رہنے والے تھے۔

ہم دونوں ماہرینِ اثریات کی بھی یہی رائے تھی کہ مقدمے میں تاریخ اور آثارِ قدیمہ کو گھسیٹ کر درست قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ججوں کو بس یہ دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ جب (۱۹۵۰ء سے) مقدمہ شروع ہوا، تب (بابری مسجد کی) جگہ کس کی ملکیت تھی۔

لیکن دونوں ہندو ججوں، ڈی وی شرما اور سدھیر اگروال کا کہنا تھا کہ آرکیالوجیکل سروے کی رپورٹ کہتی ہے، مسجد کے نیچے مندر موجود تھا۔ ہمیں اِن کا استدلال تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ وہ ماہرِ آثارِ قدیمہ ہیں۔

(بعد ازاں جب مقدمہ بھارتی سپریم کورٹ میں پہنچا، تو وہاں بیٹھے ہندو ججوں نے یہی دلیل دی کہ آرکیالوجیکل سروے کے ماہرین تجربے کار ہیں، لہٰذا اُنھوں نے ضرور تہِ مسجد کوئی مندر ڈھونڈ لیا ہے۔ اِس دلیل کے تحت بھی بابری مسجد کی جگہ مندر بنانے کا فیصلہ دیا گیا۔)

سوال: رپورٹ میں مندر کو رام مندر کہا گیا ہے؟

جواب: جی نہیں، بس یہ لکھا گیا ہے کہ مسجد کے نیچے ایک مندر کے آثار ملے ہیں۔ اِسے اُنھوں نے رام جنم بھومی مندر نہیں کہا۔

سوال: ہم نے سنا ہے کہ آپ نے سرکاری ماہرینِ اثریات کی تحقیق پر کچھ اعتراضات بھی کیے تھے۔

جواب: جی ہاں، سرکاری ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے بعد ازاں دعویٰ کر دیا کہ بابری مسجد کے نیچے رام مندر موجود تھا۔ گویا وہ وشنو دیوتا کی عبادت گاہ ہوئی۔ وشنو کے پیروکار ماس (گوشت) نہیں کھاتے۔ اِس لیے عقل یہ کہتی ہے کہ بابری مسجد کے نیچے سے سبزیوں اور پھلوں کی باقیات ملنی چاہئیں۔

ماہرین کو مگر مسجد کی تہ سے جانوروں کی ہڈیاں بھی ملیں۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ وشنو مندر میں جانوروں کی ہڈیوں کا کیا کام؟ سرکاری ماہرین اِن ہڈیوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اِسی لیے اُنھوں نے کھدائی کرنے والے مزدوروں کو حکم دیا کہ اگر ہڈیاں ملیں، تو وہ کوڑے میں پھینک دی جائیں۔

دوسری اَنہونی بات یہ ہے کہ انھیں بابری مسجد کے نیچے سے شفاف تہ رکھنے والے چمکیلے برتنوں کے ٹکڑے بھی ملے۔ ماضی میں ایسے برتن مسلمان استعمال کرتے تھے۔ سرکاری ماہرینِ اثریات اِن سرامک ٹکڑوں کا بھی ریکارڈ مرتب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اِس لیے اِن قیمتی آثار کو بھی تلف کر دیا گیا۔

ہم نے باقاعدہ طور پر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو تحریری شکایت دی اور لکھا کہ کھدائی کرنے والے ماہرین نے دانستہ حیوانی ہڈیوں اور چمکیلے برتنوں کے ٹکڑوں کا ریکارڈ نہیں رکھا۔ یہ علمی بددیانتی تھی، لیکن ہمارا اِحتجاج بیکار گیا اور قدامت پسند مودی حکومت نے عدلیہ سے ویسا فیصلہ لے لیا جیسا وہ پانے کی خواہش مند تھی۔

◆◆◆

"تاریخی ہستیاں"

تاریخ کی کچھ نامور اور دلچسپ شخصیات کا

پُرلطف اور پُرمزاح تذکرہ،

پڑھیے صفحہ نمبر 137 پر

ولی

اُس نے سنا تھا کہ مرشد بھی رزق کی طرح ملتا ہے... اور وہ اپنا ''رزق'' ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا

مہرین ارشد

اس ویرانے میں چارسو اندھیرا تھا اور درمیان میں وہ زی روح۔ مسلسل چلنے سے اس کے پاؤں شل اور جسم جواب دینے لگا تھا۔ جیسے ہی وہ ہانپنے لگتا، روشنی کی لکیر اسے بہت قریب آتی دکھائی دیتی۔ خوشی سے بے قابو ہوتے وجود کے

ساتھ وہ اس کی طرف بڑھنے لگتا تو وہ اسے اپنے پیچھے لگا لیتی یہاں تک کہ وہ اپنے قدموں کی رفتار آہستہ کرتا اور اپنی سانسوں کو ہموار کرنے میں ہلکان ہوتا۔

''اللہ تیری مشک بھری رکھے۔''

یہ سلسلہ جانے کب تک چلتا کہ اس کی ساعتوں سے یہ آواز ٹکرائی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

☆☆☆

پروین بی بی کے جھونپڑے نما گھر میں صبح شام کافی رونق ہوتی۔ ان کا مٹی وگارے سے بنا گھر پُرنور ہوجاتا یا شاید اسے لگتا، پر وہ اپنے روز وشب سے مطمئن وشاد نظر آتی۔ جب سے مولوی صداقت علی کا انتقال ہوا تھا، اس نے گھر کو ہی مسجد بنالیا اور بچوں کو قرآن پاک پڑھانے لگی۔ بچوں کی مائیں اس سے دم بھی کرواتیں کہ بچہ بہت بے قابو ہوتا جارہا ہے۔ اس پر کچھ پڑھ کر پھونک دیں۔ بڑا ہوکر نہ جانے کون سے گل کھلائے۔ وہ بغیر کچھ کہے اپنی تسبیح پہ ورد کیے جاتی اور بچوں کی

روشن پیشانی کو چوم لیتی۔

☆☆☆

چلتی کا نام زندگی.....اب پروین بی بی بوڑھی ہونے لگی تھی۔ ڈھلتی عمر میں بڑے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا خواب دیکھا تو آنکھوں میں سفید موتیے کے ساتھ ایک چمک بھی اُترنے لگی۔ گھٹنوں نے چلنے کی اجازت نہ دی تو چھوٹی بہن کو بلاوا بھیجا اور اس کی منجھلی بیٹی کو اپنے بڑے بیٹے رفیق عرف فیکے کے لیے مانگ لیا۔ دو ہی بیٹے تھے اس کے۔ چھوٹا ولی فیکے سے پانچ سال چھوٹا تھا اس لیے فی الحال وہ فیکے کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی۔

☆☆☆

مدرسے سے ملحق قدرے سنسان گوشے میں بیٹھا وہ سوچوں کے تانے بانے بن رہا تھا۔ پروین بی بی نے تو کوئی خاص تعلیم لی نہ تھی لیکن چاہتی تھی ولی اپنے باپ کی طرح تبلیغ کرے سو اُسے مدرسے داخل کروادیا۔

''سیدھے راستے پر چلنے کے لیے مرشد کی راہنمائی لازمی چاہیے۔''

''اگر کوئی راستہ دکھانے والا نہ ہو تو انسان سیدھے راستے سے بھی بھٹک سکتا ہے۔''

امام صاحب کی باتیں اسے جستجو دیتیں۔ دوستوں سے الگ وہ سوچ میں گم تھا کہ صبح ہر حال میں ان سے مرشد کا پتا پوچھے گا۔ امام صاحب جیسے ہی فجر کی نماز سے فارغ ہو کر نکلے وہ چپ چاپ اُن کے پیچھے ہولیا۔ جب انھیں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' اپنی حیرت پس پشت ڈالتے انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

''امام صاحب! میرے مرشد کہاں ملیں گے؟'' وہ آنکھوں میں تجسس لیے پوچھنے لگا۔

''بیٹا رزق کی طرح مرشد بھی لکھے ہوتے ہیں۔ مرید در در کی خاک چھاننے کے بعد بھی فیض وہیں سے وصولتا ہے جہاں اس کا حصہ پہلے سے طے شدہ ہو۔''

اُس نے پوری بات سنے بغیر دوڑ لگا دی۔ اس کے کم سن ذہن نے یہی سنا کہ در در کی خاک چھاننے کے بعد مرشد مل جائے گا اور وہ چل دیا سامان باندھنے۔ اسے اپنے مرشد کے پاس جانا تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ پروین بی بی کے گھر چھمو دلہن بن کر آ گئی۔ اسے اس گھر میں گزارا کرنا مشکل دکھائی دینے لگا۔ فیکا ایک معمولی موٹر مکینک تھا۔ اس کی محدود تنخواہ میں وہ گزارا کر بھی کیسے سکتی تھی۔ اس نے اپنے لیے ہمیشہ پُرآسائش زندگی کا تصور کیا تھا پھر کیونکر وہ پروین کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے بچوں کو قرآن پڑھاتی اور ساری زندگی غربت کی چکی میں پستی رہتی۔ اس نے سنجیدگی سے فیکے کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ کیسے وہ راتوں رات امیر ہو سکتے تھے۔ جلد ہی اس نے باپ دادا کی زمین کو بیچنے کا شوشہ چھوڑ دیا۔

''کیسی باتیں کرتی ہے تو چھمو! وہی تو باپ دادا کی نشانی ہے ہمارے پاس۔ سارے گاؤں میں جو عزت سے بلاتے ہیں ہمیں، تو انھی زمینوں کی وجہ سے۔'' وہ الجھا تھا۔

''جب ہم بڑے بنگلے میں رہیں گے تو یہی لوگ آگے پیچھے گھومیں گے۔'' اپنی بات کا خود ہی لطف لیتے ہوئے اسے قائل کرنے لگی۔ اُسے منانا تو ہر حال میں تھا۔ ولی ا پروین آسان اہداف تھے۔ ان کی بے ضرر طبیعت سے انھیں کسی بھی قسم کی پریشانی ہونے کا امکان نہ تھا۔

فیکے نے ساری زمین بیچ دی۔ ایک ہی گھر بچا تھا۔ بی نے اس کی بولی نہیں لگنے دی۔ اس کے مرحوم شوہر کی یہی نشا تھی اس کے پاس اور وہ مرتے دم تک یہیں رہنا چاہتی تھی چھمو سکون سے مسکرا دی۔ ساس کے بوجھ سے بھی نجات

یعنی وہ اُن کے ساتھ نہیں رہے گی۔ خس کم جہاں پاک۔ اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔

☆☆☆

مدتیں بیت گئیں اُسے اِس سفر میں۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جہاں کسی نے پیر و مرشد کا پتا دیا، وہ چل پڑتا مگر ہر ایک نے صرف پیر کا چولا پہن رکھا تھا۔ کسی نے پیسے کمانے کے لیے تو کسی نے اپنے کالے دھندوں کو چھپانے کے لیے۔ یہ بدصورت حقیقت دیکھ کر اس کا دل بدظن ہوتا اور وہ نئے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ یہ اس کا معمول تھا مگر اب جیسے وہ تھکنے لگا۔

''مسافر لگتے ہو۔'' پیاس کی شدت سے وہ ہانپ رہا تھا جب اپنے کندھے پر اس نے کسی کی تھپکی محسوس کی۔

''جی! وہ مسافر جو بھٹکتا پھر رہا اور اُسے کسی منزل کا نشان تک نہیں ملتا۔'' پیاس کی شدت سے اس کی سانس اُکھڑ رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھ لیے وہ مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ ٹھنڈا مشروب پینے کے بعد وہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔

''کس منزل کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہو برخوردار؟'' انھوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا جیسے کوئی نتیجہ اخذ کر رہے ہوں۔

''ایک ایسے مرشد جو مجھے راستہ دکھائے، اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ آ کر مجھ بھٹکے ہوئے کو تھامتے ہی نہیں۔'' وہ افسردہ ہوا۔

''انھیں تلاش مت کرو۔ وہ تمہاری راہنمائی کرنے خود کبھی نہ کبھی تمہیں مل جائیں گے۔'' وہ نرمی سے گویا ہوئے۔

''مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں آخر کس راستے پر گامزن ہوں؟'' آنکھوں میں نا اُمیدی بھر آئی۔

''ماں باپ حیات ہیں؟'' پانی کا گلاس تپائی پر رکھتے ہوئے وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

''ابا تو میرے بچپن میں انتقال کر گئے تھے۔ ماشاءاللہ اماں حیات ہیں مگر اب ان کی صحت گرنے لگی ہے۔ ضعیف ہو گئی ہیں۔ اللہ ان کی لمبی حیاتی کرے۔''

ماں کا شفقت بھرا وجود یاد آتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک اُتر آئی۔ عرصہ ہو گیا تھا اُسے ماں کے ساتھ بیٹھے۔ جانا، پل دو پل کو ملنا اور پھر نکل پڑنا۔

''تو کیا ان کی خدمت تم پر فرض نہیں؟ اگر ماں کو راستے سے ہٹا دو گے تو پھر منزل کبھی نہیں ملے گی جبکہ انھیں تمہاری ضرورت بھی ہے۔'' وہ اس کا جواب سنے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انھیں نمازِ ظہر کی تیاری کرنا تھی۔

☆☆☆

بہت خوش تھے دونوں میاں بیوی۔ فیکا گیراج کا مالک بن گیا تھا۔ اتنا بڑا اور خوبصورت بنگلہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ جس دن سے وہ شہر آئے تھے، رشیداں (چھمو کی ماں) اس کے ساتھ ہی تھی۔ بیٹی کے نصیب پہ رشک کرتی اور بڑی بہن کو دعائیں دیتی نہ تھکتی کہ کیسی اللہ لوک بہن ہے۔ اب بھی انڈین سیریل دیکھتے ہوئے کھانا تناول فرما رہی تھی کہ فیکا داخلی دروازے سے آتا دکھائی دیا۔ وہ سب کام چھوڑ کر اس کے واری صدقے ہونے لگی۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اسے افراتفری مچاتے دیکھ کر فوراً اپنی بیٹی کو آواز دی۔ چھمو گہری نیند سے اُٹھ کر بے زاری کے ساتھ آ بیٹھی۔

''میں گاؤں جا رہا ہوں۔ تو بھی ساتھ چل۔'' چھمو سخت بیزار ہوئی۔

''کیوں جانا ہے گاؤں؟ کیا رہ گیا ہے تیرا جو مڑ مڑ پیچھے جاتا ہے۔'' یہ تو طے تھا کہ اسے اب واپسی کا راستہ کبھی نہیں تکنا تھا۔

''اری بے وقوف عورت! مٹھائی لے کر جاؤں گا۔ گیراج کا مالک بن گیا ہوں۔ رعب ہو گا گاؤں میں بھی۔ سب کو بتانے ہی جا رہا ہوں اور لگے ہاتھ ماں کا بھی حال پوچھ لوں گا۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ خیر خبر ہی نہیں لی۔'' وہ سمجھاتے ہوئے

بولا۔

''تُو اکیلا ہی چلا جا۔ میرے سر میں درد ہے۔'' وہ نتھنے پھلائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور وہ دانت کچکچاتا گاؤں کے لیے نکل پڑا۔ جانتا تھا کہ اس کی نہ اب ہاں میں بدلنے والی نہیں۔

☆☆☆

سرمئی شام رات کی سیاہی میں گم ہونے کے قریب تھی۔ پرندوں کے غول اب اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ گاؤں میں قدم رکھتے ہوئے اس کا دل کانپ رہا تھا جیسے کوئی بہت پیاری شے اس کے ہاتھ سے کھو گئی ہو۔ شاید لوٹنے والے نے بہت دیر کر دی تھی۔ اس کے قدم من من بھاری ہو رہے تھے۔ وہ اپنا وزن نہیں سہار پا رہا تھا مگر آج اسے نا مراد نہیں لوٹنا تھا۔ خود میں توانائیاں بڑھاتا، اپنی شکستگی کا ماتم کسی اور دن پر رکھتا وہ مولوی صداقت کے بنائے ہوئے کچے گھر کی طرف بڑھنے لگا جس کی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں سے ٹکراتی تو رگوں میں زندگی دوڑنے لگتی تھی۔ ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹ ہی آتی ہے۔ وہ بھی لوٹ آیا تھا۔ لکڑی کا بوسیدہ دروازہ پار کرتے اس کے ہاتھ کانپے۔ گھر ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر گیا تھا۔ دھریک کا درخت اپنی تمام تر ویرانیاں سمیٹے اس کا استقبال کر رہا تھا۔ دُور کہیں بلیوں کے رونے کی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔ وہ جھرجھری لیتا آگے بڑھا۔

بان کی چارپائی پہ پڑا نحیف وجود دروازے پر ہی نظر ٹکائے ہوئے تھا۔ آنکھوں میں اُمید و آس کے دیے جلائے وہ بہت کمزور نظر آتا تھا۔ پڑوسن اسے دیکھ کے اپنے گھر کو پلٹ گئی۔ گھر کا مکین لوٹ آیا تھا تو اس کے رُکنے کا جواز بھی ختم ہو گیا۔ بی بی کو اکیلے چھوڑنے کا حوصلہ نہیں تھا اس لیے جب وہ چارپائی سے لگیں، وہ سارا دن وہیں رہتی۔

☆☆☆

بڑے کروفر سے اس نے چمکتی پجارو سے اپنے قدم باہر نکالے۔ اردگرد ایسے نگاہ دوڑائی جیسے وہ دُور کہیں کا باسی ہو اور غلطی سے یہاں آ گیا ہو۔ غرور سے گردن اکڑائے اس نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بج اُٹھا۔ اس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے فون کان سے لگایا مگر گیراج میں آگ لگنے کی خبر نے اسے منجمد کر دیا۔ اس نے گھر گروی رکھ کر یہ قدم اُٹھایا تھا۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سماعتوں پہ یقین کرنا دوبھر۔ اپنے پرانے آشیانے کو دیکھتا وہ حواسوں میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج وہ وہیں آن کھڑا ہوا تھا جہاں سے چلا تھا۔

اس کی اپنی لگائی آگ کے شعلوں نے پورا وجود اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ بے تابی سے ماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ بان کی چارپائی پر لیٹے وجود نے دروازے سے نظریں ہٹالیں اور چہرہ موڑ لیا۔ وہ دہلیز پر کھڑا یہ منظر ایسے دیکھتا رہ گیا جیسے کمرے میں داخلے کی اجازت نہ ملی ہو۔

ولی ماں کا ہاتھ تھامے انھیں ہوش میں لانے کے جتن کر رہا تھا۔ شاید دونوں بیٹوں کے ایک ہی دن واپس آنے کی خوشی میں باقی ماندہ قوت بھی ختم ہو گئی تھی۔ ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتا وہ نڈھال ہونے لگا تھا کہ ماں آنکھوں نے حرکت کی۔ اس کی اُمید بڑھی۔ انھیں اپنے ساتھ لگاتے وہ گھونٹ گھونٹ پانی پلانے لگا۔ بمشکل دو گھونٹ پانی ان کے حلق سے اندر اُتارے۔

''اللہ تیری مشک بھری رکھے۔'' ماں نے آخری بار آنکھیں کھولیں۔ اُکھڑتی سانسوں میں اسے دعا دی۔ ولی کے ہاتھوں سے پیالہ گر گیا۔ اک وجود بھی اس کے کندھے پر آ گرا تھا۔ بالکل ساکت..... بالکل جامد..... جہاں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی تھی، بس وہ آخری دعا..... اب متاع جاں تھی۔

◆◆◆

مبارک ہو! آپ 50 سال کے ہو گئے

سید عاصم محمود

ایک عربی کہاوت ہے: ''جو انسان صحت مند ہو، وہ اُمید رکھتا ہے اور جس کے پاس اُمید ہو، وہ امیر ترین شخص ہے۔''

یہ کہاوت تندرستی کی اہمیت بخوبی اُجاگر کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمدہ صحت بہترین دولت ہے۔ جب ایک انسان صحت کھو بیٹھے، تبھی اِس پر آشکارا ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی قیمتی ترین متاع سے محروم ہو چکا۔

ہمارے ملک میں مرد کی متوقع عمر ۶۶ سال جبکہ ایک خاتون کی ۶۹ سال ہے۔ گویا پاکستان میں جو مرد و خواتین ۳۵ سال کی عمر پار کر جائیں، وہ اپنی آدھی زندگی گزار لیتے ہیں۔ جبکہ ۴۵ برس کا ہوتے ہی اِن کے بدن میں مختلف طریقوں سے زوال کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً معمولی سا بھاری کام کرنے پر سانس پھول جانا، کوئی نہ کوئی حصّۂ جسم درد کرنے لگنا خصوصاً جوڑ دُکھنے لگتے ہیں۔ انسان پہلے کی طرح تیز و طرار نہیں رہتا۔

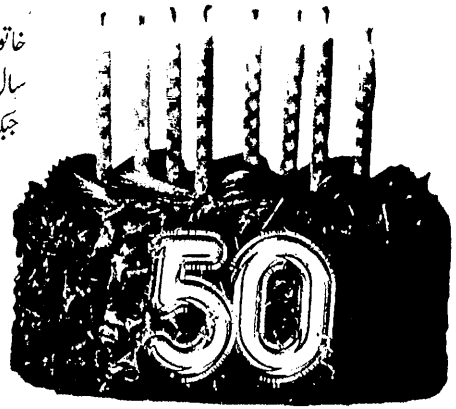

پاکستان میں کم از کم دس کروڑ مرد و خواتین کی عمر ۴۵ برس سے تجاوز کر چکی جبکہ بہت سے پاکستانی ۵۰ سال کا ہوتے ہی خود کو بوڑھا سمجھنے لگتے ہیں۔ تب وہ کوئی سخت کام کرنے سے گھبراتے اور مایوسی و پژمردگی کا نشانہ بن جاتے ہیں، لیکن اب جدید طبی سائنس انھیں مایوسی کے اندھیرے سے نکال کر اُمید کی روشنی عطا کر رہی ہے۔

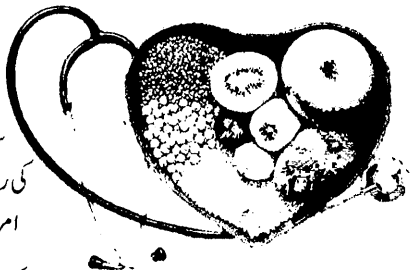

امریکا کی ہارورڈ یونیورسٹی کا شمار دُنیا کی بہترین درس

عمرِ عزیز نصف سے زائد گزرنے پر مت گھبرائیے، مثبت طرزِ زندگی اپنا کر بقیہ ماہ و سال خوشگوار اور پُر لطف بنا لیجیے

گاہوں میں ہوتا ہے۔ اِس یونیورسٹی سے منسلک ماہرینِ طب نے حال ہی میں ایک نہایت مفید کتابچہ شائع کیا ہے۔ کتابچے کی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں اُن مرد و خواتین کو تندرست رہنے کے گُر بتائے گئے ہیں جو پچاس سال کی طویل مسافت طے کر لیں۔ ماہرینِ طب کا دعویٰ ہے کہ اِن کی تجاویز اور مشوروں پر عمل کر کے انسان ادھیڑ عمری ہی نہیں، بڑھاپے میں بھی خود کو تندرست اور چاق و چوبند رکھ سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تندرستی کی دولت و نعمت پا کر وہ اِس قابل ہو جاتا ہے کہ خود کو مفید شہری ثابت کر سکے۔ گویا وہ بڑھاپے میں بھی کسی طرح اپنے پیاروں پر بوجھ نہیں بنتا بلکہ اِن کے کام ہی آتا ہے۔

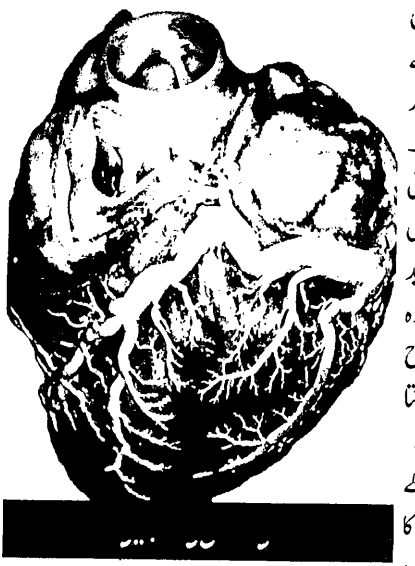

ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہرینِ طب ۵۰ سال کا ہندسہ چھو لینے والے مرد و خواتین کو پیغام دیتے ہیں کہ اِس عمر میں پہنچ کر گھبرانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کوئی منفی تاثر اپنے اُوپر حاوی ہونے دیں۔ موت برحق ہے، مگر غیر صحت مندانہ سرگرمیاں اپنا کر اُسے جلد لانے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ ادھیڑ عمری میں داخل ہوتے ہی ہر انسان کو مثبت طرزِ زندگی اختیار کر لینا چاہیے تاکہ وہ اپنی بقیہ عمر خوش باش اور اچھے طریقے سے گزار سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام موذی امراض مثلاً دل کی بیماریاں، بلند فشارِ خون (ہائی بلڈ پریشر)، ذیابیطس، سرطان (کینسر)، دمہ وغیرہ منفی طرزِ زندگی سے جنم لیتے ہیں۔ اگر انسان اُسے ترک کر دے، تو ۵۰ سال کی عمر کے بعد بھی کئی برس اپنے آپ کو تندرست و توانا رکھ سکتا ہے۔ منفی طرزِ زندگی کیا ہے؟ یہی کہ مضرِ صحت غذا کھائی جائے، ورزش سے دُوری، مناسب نیند نہ لینا، مسلسل کام کرنا اور سگریٹ نوشی۔ انسان اگر اِن خرابیوں سے دُور ہو جائے، تو نہ صرف اِس کی صحت عمدہ ہوتی، بلکہ عمر میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

شاید آپ ماہرینِ طب کے دعویٰ کو خاطر میں نہ لائیں، مگر تحقیق و تجربات اِنھیں درست ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً۔ آج سے آپ ہفتے میں پانچ دن روزانہ آدھ گھنٹہ تیز پیدل چلنا شروع کر دیں۔ چھے ماہ بعد آپ کو ذیابیطس چمٹنے کا خطرہ ''۵۷ فی صد'' کم ہو جائے گا۔ اِسی طرح اگر آپ سگریٹ نوش ہیں، تو اِس نشے سے جان چھڑا لیں۔ ایک سال تک آپ سگریٹ سے دُور رہنے میں کامیاب رہے، تو امراضِ قلب چمٹ جانے کا خطرہ آدھا کم کر دیں گے۔ یہ کوئی خالی خولی بات نہیں، ہزارہا سائنسی تجربات اِس امر کو درست ثابت کر چکے۔

عوامل جو کنٹرول میں نہیں

تندرستی کے گُر جاننے سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ انسان اِس ضمن میں بعض عوامل چاہتے ہوئے بھی کنٹرول نہیں کر سکتا۔ مثلاً یہ کہ وہ عمر روکنے کا اختیار نہیں رکھتا..... وقت لمحہ بہ لمحہ اُسے ادھیڑ عمر اور پھر بوڑھا کر دیتا ہے۔ یہ عمل تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود اِنسان اپنے قابو میں نہیں کر پایا۔ انسان کو عمر رسیدہ کرنے میں جسمانی خلیوں کی شکست و ریخت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

جب کوئی آپ کا پیارا مثلاً بھائی، بہن یا والدین کسی

موذی مرض مثلاً کینسر میں مبتلا ہو جائیں، تو یہ خطرناک بات ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تب آپ کو بھی یہ بیماری لاحق ہونے کا خطرہ جنم لیتا ہے۔ دراصل تمام قریبی عزیز و اقارب میں جین (Gene) مشترکہ ہوتے ہیں، لہٰذا اِن کے باعث مرض ایک سے دوسرے میں منتقل ہوسکتا ہے۔ اگر مریض کے منفی طرزِ زندگی سے ملتا جلتا آپ نے بھی اختیار کر رکھا ہے، تو خطرے میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

خوشی کی بات یہ کہ اگر عمر کے کسی بھی وقت صحت مندانہ طرزِ زندگی اپنا لیں، تو طبی لحاظ سے آپ کو فائدہ پہنچے گا۔ وجہ یہ کہ عمدہ طرزِ حیات صحت کو نقصان پہنچانے والے جین سرگرم نہیں ہونے دیتا جبکہ اچھے جین کی کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے۔ ایک بہترین طرزِ زندگی اپناتے ہوئے آپ کو خود سے یہ سوالات کرنے چاہئیں:

❁ کیا میں سگریٹ نوشی کرتا ہوں؟ ..... پاکستان میں لاکھوں کروڑوں لوگ کوئی نہ کوئی نشہ کرتے ہیں۔ وہ تمباکو پیتے، نسوار لیتے یا چرس، ہیروئین وغیرہ سے صحت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر آپ بھی خصوصاً سگریٹ نوش ہیں، تو فوراً اِس عادتِ بد سے چھٹکارا پالیں۔ مہینوں نہیں چند ہفتوں میں آپ کی صحت میں مثبت تبدیلیاں جنم لیں گی۔

❁ آپ کیا کھاتے ہیں؟..... غذائیت بھری غذائیں کھانا امراض کو دُور رکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔ صحت بخش غذا کھانے سے انسان امراضِ قلب، ذیابیطس اور دیگر بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

❁ آپ کتنے متحرک ہیں؟..... یہ صدیوں پرانا آزمودہ طبی فارمولا ہے کہ خود کو چست و چالاک رکھیے اور طویل عمر پایئے۔ یہی نہیں، حرکت کرنے والے مرد و زن کی صحت بھی آخر دم تک اچھی رہتی ہے۔ تحقیق و تجربات مسلسل بتاتے ہیں کہ ورزش سے صحت میں بہتری آتی ہے۔

آیئے اب اِن بیماریوں کے بارے میں جانتے ہیں جو چالیس، پچاس برس کی عمر کے بعد انسان پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ اِن میں سب سے اہم امراضِ قلب ہیں۔

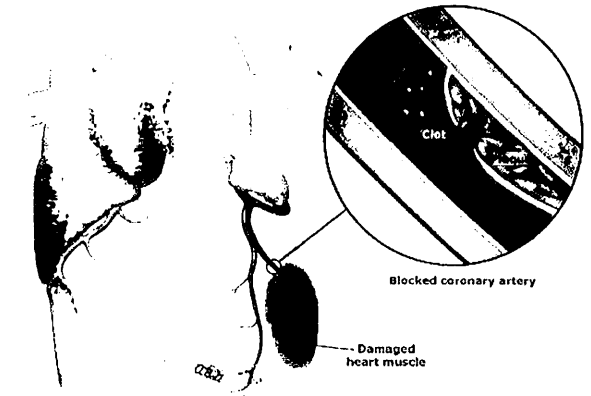

دل کی بیماریاں

دنیا بھر میں ہر سال لاکھوں مرد و زن اِن بیماریوں کے باعث چل بستے ہیں۔ یہ بیماریاں دل یا خون کی قلبی شریانوں (Blood Vessels) میں خرابیاں ہونے سے جنم لیتی ہیں۔ ہمارا دِل دو مٹھیوں کے برابر ایک عضو ہے۔ اِس عضو سے ہمارے بدن میں خون کی سب سے بڑی شریان ''اورٹا'' (Aorta) جڑی ہے۔ یہ باغ میں پانی دینے والی نالی جتنا قطر رکھتی ہے۔ اورٹا سے کئی چھوٹی بڑی شریانیں نکل کر دل میں پھیل جاتی ہیں۔ اپنی شریانوں کے ذریعے دل کے خلیوں

خون کی نس میں جما کولیسٹرول

کو آکسیجن اور غذائیت ملتی ہے۔ یہ ''کلیلی شریانیں'' (Coronary Arteries) کہلاتی ہیں۔

اکلیلی شریانِ مرض:

یہ دل کی عام بیماری ہے۔ نام سے عیاں ہے کہ یہ دل کی اکلیلی شریانوں سے وابستہ ہے۔ دل کے دونوں جانب دو بڑی اکلیلی شریانیں واقع ہیں۔ یہ دریا کے مانند ہیں۔ ان سے چھوٹی نسیں پھوٹ کر دل میں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ خلیوں تک آکسیجن اور گلوکوز پہنچاتی ہیں جبکہ خلیوں کا پیدا کردہ فضلہ خون کی گردش کے ذریعے گردوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ان اکلیلی شریانوں میں اگر کسی وجہ سے بھی خون کا بہاؤ رُک جائے یا اس میں رکاوٹ آ جائے، تو دل کی بیماری جنم لیتی ہے۔

اکلیلی شریانوں میں عموماً چربی جمع ہونے سے خون کی روانی متاثر ہوتی ہے۔ چربی کا جماؤ طبی اصلاح میں ''پلاک'' (Plaque) کہلاتا ہے پلاک سے پیدا شدہ بیماری کو ''atherosclerosis'' کہتے ہیں۔ یہ بیماری جنم دینے میں کولیسٹرول اور ہمارا دِفاعی نظام (Immune System) اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

آغاز میں کسی اکلیلی شریان میں ہائی بلڈ پریشر، سگریٹ نوشی یا کسی چھوت کے باعث ورم پیدا ہوتا ہے۔ جلد اِس ورم پر کولیسٹرول جمع ہونے لگتا ہے۔ کولیسٹرول کی دو اقسام ہیں:

ایل ڈی ایل (LDL) اور ایچ ڈی ایل (HDL)۔ ایل ڈی ایل کے ذرات ہمارے تمام جسمانی خلیوں تک کولیسٹرول پہنچاتے ہیں۔ ایچ ڈی ایل کے ذرات جسم میں موجود زائد کولیسٹرول جذب کر کے اِسے جگر تک لے جاتے ہیں تاکہ وہاں وہ ضائع ہو جائے۔ ہمارے بدن کو کولیسٹرول کی دونوں اقسام درکار ہیں تاکہ وہ بخوبی اپنا کام کر سکے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر جسم میں ایل ڈی ایل بہت زیادہ بڑھ جائے یا ایچ ڈی ایل کم ہو، تو زائد کولیسٹرول اکلیلی شریانوں کی دیواروں خصوصاً ورم پر جمنے لگتا ہے۔

جب کسی اکلیلی شریان میں کولیسٹرول کی تہ جم جائے، تو ہمارا مامون نظام حرکت میں آتا ہے۔ وہ تب کولیسٹرول کو دشمن تصور کرتا ہے، کیونکہ اِس کی وجہ سے شریان میں خون کی روانی متاثر ہوتی ہے۔ مامون نظام پھر سفید خونی خلیے تہ کی سمت بھیجتا ہے۔ یہ خلیے تہ کا کولیسٹرول چٹ کرنے لگتے ہیں۔ اِس عمل سے مگر کئی خلیے اتنی چکنائی ہڑپ کر جاتے ہیں کہ وہ حرکت کے قابل نہیں رہتے، چنانچہ وہ بھی تہ میں جا شامل ہوتے ہیں اور وہ پہلے سے زیادہ موٹی ہو جاتی ہے۔

اگر مامون نظام یہ پَرت نہ ہٹا سکے، تو وہ مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ اسی دوران انسان چکنائی والی اشیا زیادہ کھاتا رہے، تو تہ مزید پھیل جاتی ہے۔ آخر ایک دن ایسا آتا ہے کہ کولیسٹرول کی تہ خون کی روانی روک دیتی ہے۔ تب دل تک مطلوبہ خون نہیں پہنچتا، لہٰذا اِس کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ وہ خون درست طریقے سے پمپ نہیں کر پاتا۔ اِس حالت میں انسان سینے میں درد محسوس کرتا ہے جسے طب میں ''انجائنا'' کہتے ہیں۔ اگر خون کا بہاؤ مکمل طور پر رُک جائے اور تادیر

یہی کیفیت رہے، تو انسان حملۂ قلب (ہارٹ اٹیک) کا شکار ہوجاتا ہے۔

اکلیلی شریانوں میں کولیسٹرول کی تہ جمنے سے مگر زیادہ تر حملۂ قلب جنم نہیں لیتے۔ اکثر ہارٹ اٹیک اُس وقت ہوتے ہیں جب کولیسٹرول کی تہ پھٹ جائے۔ اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ موٹی ہے یا پتلی، دونوں خطرناک ہوتی ہیں۔ جب تہ پھٹ جائے، تو شریان میں چربیلے تھکّے (Clots) بن کر خون کی روانی روک دیتے ہیں۔ اِسی باعث انسان کو حملۂ قلب ہوتا ہے۔

ماضی میں ڈاکٹروں کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایک انسان کئی میل لمبی میراتھن بھاگا ہے، مگر چند دن بعد وہ ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔ حالانکہ موت کی وجہ سادہ تھی، اُس کی اکلیلی شریان میں کولیسٹرول کی پَرت پھٹ جاتی جو حملۂ قلب کا باعث بنتی اور اِنسان کو اگلے جہاں پہنچا دیتی۔

امراضِ قلب کی دیگر اقسام

اکلیلی شریان مرض کی وجہ سے مریض میں دل کی دیگر بیماریاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ یہ زیادہ عام نہیں، مگر جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ اِن کی بابت تفصیل آپ امراضِ قلب کی مخصوص کتب میں پڑھ سکتے ہیں۔

ہارٹ اٹیک جنم لینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دل تب خون صحیح طرح پمپ نہیں کر پاتا۔ اِس باعث انسان سانس لینے میں دِقت محسوس کرتا ہے۔ اس پر تھکن طاری ہوجاتی ہے اور وہ بے ہوش ہوجاتا ہے۔ اگر مریض کو فوری طبی امداد نہ ملے، تو وہ چل بستا ہے۔ آکسیجن کی کمی انسان کو دنیا مافیہا سے بیگانہ کر ڈالتی ہے۔

خطرہ جنم لینے کی وجوہ

انسان مختلف وجوہ کی بنا پر امراضِ قلب میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایک اہم وجہ ''عمر'' ہے۔ جوں جوں انسان کی عمر بڑھے، دل کی بیماریاں چمٹنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں حملۂ قلب سے مرنے والے ہر پانچ انسانوں میں تین کی عمر ۶۵ سال سے زیادہ ہوتی ہے۔ مردوں میں تو ۴۵ سال کی عمر سے ہارٹ اٹیک ہونے کا خطرہ بڑھنے لگتا ہے۔

خاندانی تاریخ: جن مرد و زن کے والدین یا بہن بھائی دل کی بیماریوں میں مبتلا ہوں، تو اُنھیں بھی یہ چمٹ سکتی ہیں۔ لہٰذا خصوصاً وہ مرد و خواتین جن کے والدین امراضِ قلب کے مریض ہوں، اُنھیں نوجوانی ہی میں صحت مندانہ طرزِ زندگی

سگریٹ نوشی اپنی قبر خود کھودنے کے مترادف

اختیار کرلینا چاہیے۔

کولیسٹرول کی بلند شرح:

انسانی جسم میں کولیسٹرول کی شرح ۲۴۰ ملی گرام سے کم ہونی چاہیے۔ اگر اِس شرح سے کولیسٹرول بڑھ جائے، تو آپ امراضِ قلب کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ جدید ماہرینِ طب کا کہنا ہے کہ بہتر ہے، یہ شرح ۲۴۰ ملی گرام سے کم رکھی جائے۔

مزید براں جسم میں ایل ڈی ایل اور ایچ ڈی ایل کی شرح مقدار بھی نظر میں رکھیے۔ ایل ڈی ایل برا کولیسٹرول ہے۔ اِس کی مقدار جتنی زیادہ ہوئی، حملۂ قلب ہونے کا امکان

بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا جبکہ ایچ ڈی ایل اچھا کولیسٹرول ہے۔ یہ انسان کو ہارٹ اٹیک سے محفوظ رکھتا ہے، لہٰذا اِس کی مقدار جسم میں زیادہ ہونا اچھی علامت ہے۔

ہائی بلڈ پریشر:

اِس طبی خلل کو ''ہائپرٹینشن'' بھی کہتے ہیں۔ دنیا کے کروڑ ہا مرد وزن میں یہ طبی خلل پایا جاتا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ پورے بدن میں پھیلی خون کی نالیوں میں دیواروں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر بعض اوقات امراضِ قلب سے جنم لیتا ہے، مگر یہ طبی خلل خود بھی دل کی بیماری پیدا کر سکتا ہے۔

سگریٹ نوشی:

یہ امراضِ قلب جنم لینے کا بہت بڑا سبب ہے۔ گو اَب پاکستان میں پہلے کی نسبت سگریٹ کم پیا جاتا ہے، مگر یہ نشہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکا۔ یاد رکھیے، تمباکو پھیپھڑوں کے علاوہ دل کو بھی متاثر کرتا ہے۔ سگریٹ نوش مرد و خواتین نہ پینے والوں کی نسبت دو یا تین گُنا زیادہ خطرے میں ہوتے ہیں۔ نیز حملۂ قلب سے اکثر مرنے والے سگریٹ نوش بھی ہیں۔ یاد رَہے کہ سگریٹ کا دھواں بھی اَز حد خطرناک ہے۔ اگر کسی کے جسم میں مسلسل یہ دھواں پہنچتا رہے، تو اِس میں دل کی بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ ۲۵ فی صد بڑھ جاتا ہے۔

خوش قسمتی سے سگریٹ نوشی کے ذریعے ہوئے نقصان کو ختم کرنا ممکن ہے۔ اگر تمباکو چھوڑ دیں، تو ایک سال میں امراضِ قلب چمٹنے کا خطرہ آدھا کم ہو جاتا ہے۔ جبکہ پندرہ سال بعد خطرہ بالکل نہیں رہتا۔ اب وہ بھی سگریٹ نہ پینے والوں کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔

> سگریٹ نوش والدین کے بچوں کو دمہ یعنی استھما کی بیماری ہونے کے امکانات عام بچوں کی نسبت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ پڑھیے استھما اور بچوں کی مشکلات سے متعلق مضمون......
>
> ''آؤ تمھیں سانس دوں'' صفحہ 132 پر

ذیابیطس:

دورِ جدید میں لاکھوں پاکستانی ذیابیطس کا نشانہ بن چکے۔ جبکہ کئی لاکھ مرد وزن میں یہ پوشیدہ ہے۔ ذیابیطس خون میں شکر جذب کرنے کے عمل سے وابستہ بیماری ہے، مگر یہ خون کی نالیوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ اِس باعث ذیابیطس کے بہت سے مریض دل کی بیماری، فالج یا خون کی شریان میں جنم لینے والے خلل سے چل بستے ہیں۔ یہ بیماری گردے بھی خراب کرتی ہے، لہٰذا اَمراضِ قلب جنم لینے کا خطرہ دگنا بڑھ جاتا ہے۔

موٹاپا:

یہ بھی ایک مرض ہے، بلکہ موٹاپے سے مختلف بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ لاکھوں پاکستانی اِس موذی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ایک انسان کا وزن صحت مندانہ حد تک رہنا چاہیے۔ اِس حد سے زیادہ جتنا وزن بڑھے گا، امراضِ قلب چمٹنے کا خطرہ اتنا ہی بڑھ جائے گا۔ موٹاپا، ہائی بلڈ پریشر بھی پیدا کرتا اور ایل ڈی ایل کولیسٹرول کی سطح خطرناک حد تک بڑھا دیتا ہے۔ ماہرینِ طب کے نزدیک کولھوں سے زیادہ پیٹ پر چربی کی تہیں جمنا دل کے لیے زیادہ خطرناک بات ہے۔

اس کی ایک وجہ ہے۔ ماضی میں خیال تھا کہ چربی کیلوریز (حرارے) جمع کرنے کا فطری طریق کار ہے، مگر اب انکشاف ہوا ہے کہ چربی حیاتیاتی طور پر سرگرم شے ہے۔ یہ مخصوص ہارمون اور کیمیکل خارج کرتی ہے۔ یہ کیمیائی مادے خون کے دباؤ اور خون میں موجود شکر پر منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ اِس باعث امراضِ قلب جنم لینے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ورزش کی عدم موجودگی:

پاکستان میں بہت سے مرد وزن ورزش نہیں کرتے

اِس کی اہم وجہ نقل وحرکت سے عاری طرزِ زندگی اختیار کرلینا ہے۔ آج کسی کو قریبی دکان پر بھی جانا ہو، تو وہ کار یا موٹر سائیکل پر جاتا ہے۔ پیدل چلنا گویا حرام ہو چکا، مگر حرکت سے محرومی دل کی بیماریاں چمٹنے کا خطرہ بڑھاتی ہے۔ خاص طور پر جو مرد وزن دِن کا بیشتر حصّہ بیٹھے ہوئے گزارتے ہیں، وہ جلد یا بدیر امراضِ قلب کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

باقاعدگی سے ورزش کرنے کے کئی فوائد ہیں۔ یہ جسمانی چربی جلاتی ہے۔ اچھے ایچ ڈی ایل کولیسٹرول کی سطح میں اضافہ کرتی ہے۔ خون کے دباؤ میں کمی لاتی اور خون میں شکر کی سطح گھٹاتی ہے۔ مزید برآں ذہنی دباؤ بھی کم کر دیتی ہے۔ نسان پریشان اور مایوس و، تو دل کی بیماریاں پیدا ونے کا خطرہ بڑھتا ہے۔

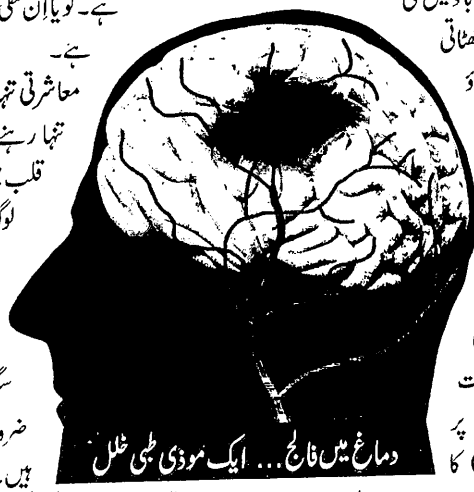

نفسیاتی وجوہ:

انسان کی ذہنی صحت بھی مراضِ قلب میں بہت اہمیت تی ہے۔ مثال کے طور پر سان ذہنی دباؤ (Stress) کا کار ہو، تو اِس کے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ں تک کم خون پہنچتا ہے، لہٰذا پمپ کرنے کی صلاحیت متاثر تی ہے۔ نیز جسم میں سوزش بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹروں کی رو سے ڈپریشن اور اَمراضِ قلب کا قریبی لق ہے۔ یہ روحانی مرض دل کی بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ نا بڑھاتا ہے۔ ماہرینِ طب اب تک نہیں جان سکے کہ وں امراض کیونکر قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ایک نظریہ ہے کہ ریشن کے مریض ورزش نہیں کرتے، غذائیت بھری غذا ں کھاتے اور اَدویہ بھی نہیں لیتے، اِسی باعث امراضِ قلب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دوسرا نظریہ ہے کہ ڈپریشن کی وجہ سے انسانی جسم میں ''دباؤ ردِعمل نظام'' (Stress response System) بگڑ جاتا ہے۔ اِسی لیے دل کی بیماریاں چمٹ جاتی ہیں۔

غصّہ اور نفرت:

جدید طبی تحقیق سے آشکارا ہوا ہے کہ جو لوگ زیادہ غصّہ کریں، نفرت اور حسد میں مبتلا رہیں، تو عام لوگوں کے برعکس اِن میں امراضِ قلب جنم لینے کا خطرہ دو تین گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ گویا اِن منفی جذبات سے بچنے میں عافیت ہے۔

معاشرتی تنہائی:

تنہا رہنے والے مرد وزن بھی امراضِ قلب میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہیں، اِن میں دل کی بیماریاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ دراصل تنہا رہنے والے عموماً سگریٹ نوشی کرتے اور ضرورت سے زیادہ کھاتے ہیں۔ اِن میں کولیسٹرول کی سطح بلند ہوتی ہے۔ یہ عوامل انھیں کسی نہ کسی قلبی مرض میں گرفتار کرا دیتے ہیں۔ جبکہ دیکھا گیا ہے کہ جو بوڑھے دوستوں کے ساتھ تعلق رکھیں، اِن میں امراضِ قلب سے بچاؤ بڑھ جاتا ہے۔

دماغی فالج (Stroke)

دماغ انسانی جسم کا اہم ترین عضو ہے۔ یہ مختلف کام انجام دیتا ہے، مثلاً سوچنا، دیکھنا، سننا، سونگھنا، محسوس کرنا، جسم کو حرکت دینا وغیرہ۔ یہ تمام کام دیگر اعضا کی مدد سے انجام پاتے ہیں۔ دماغ مگر اُسی وقت اپنی ذمے داریاں بخوبی ادا کرتا ہے جب اُسے آکسیجن سے بھرپور خون مسلسل ملتا رہے۔

بھی اتنا ہی زیادہ ہو گا جبکہ ایچ ڈی ایل اچھا کولیسٹرول ہے۔ یہ انسان کو ہارٹ اٹیک سے محفوظ رکھتا ہے، لہٰذا اس کی مقدار جسم میں زیادہ ہونا اچھی علامت ہے۔

ہائی بلڈ پریشر:

اس طبی خلل کو ''ہائپر ٹینشن'' بھی کہتے ہیں۔ دنیا کے کروڑہا مرد وزن میں یہ طبی خلل پایا جاتا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ پورے بدن میں پھیلی خون کی نالیوں میں دیواروں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر بعض اوقات امراضِ قلب سے جنم لیتا ہے، مگر یہ طبی خلل خود بھی دل کی بیماری پیدا کرسکتا ہے۔

سگریٹ نوشی:

یہ امراضِ قلب جنم لینے کا بہت بڑا سبب ہے۔ گو اَب پاکستان میں پہلے کی نسبت سگریٹ کم پیا جاتا ہے، مگر یہ نشہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکا۔ یاد رکھیے، تمباکو پھیپھڑوں کے علاوہ دل کو بھی متاثر کرتا ہے۔ سگریٹ نوش مرد وخواتین نہ پینے والوں کی نسبت دو یا تین گنا زیادہ خطرے میں ہوتے ہیں۔ نیز حملۂ قلب سے اکثر مرنے والے سگریٹ نوش بھی ہیں۔ یاد رہے کہ سگریٹ کا دھواں بھی اَز حد خطرناک ہے۔ اگر کسی کے جسم میں مسلسل یہ دھواں پہنچتا رہے، تو اِس میں دل کی بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ ۲۵ فی صد بڑھ جاتا ہے۔

خوش قسمتی سے سگریٹ نوشی کے ذریعے ہوئے نقصان کو ختم کرنا ممکن ہے۔ اگر تمباکو چھوڑ دیں، تو ایک سال میں امراضِ قلب چمٹنے کا خطرہ آدھا کم ہو جاتا ہے۔ جبکہ پندرہ سال بعد خطرہ بالکل نہیں رہتا۔ اب وہ بھی سگریٹ نہ پینے والوں کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔

ذیابیطس:

دورِ جدید میں لاکھوں پاکستانی ذیابیطس کا نشانہ بن چکے۔ جبکہ کئی لاکھ مرد وزن میں یہ پوشیدہ ہے۔ ذیابیطس خون میں شکر جذب کرنے کے عمل سے وابستہ بیماری ہے، مگر یہ خون کی نالیوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ اس باعث ذیابیطس کے بہت سے مریض دل کی بیماری، فالج یا خون کی شریان میں جنم لینے والے خلل سے چل بستے ہیں۔ یہ بیماری گردے بھی خراب کرتی ہے، لہٰذا امراضِ قلب جنم لینے کا خطرہ دگنا بڑھ جاتا ہے۔

موٹاپا:

یہ بھی ایک مرض ہے، بلکہ موٹاپے سے مختلف بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ لاکھوں پاکستانی اس موذی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ایک انسان کا وزن صحت مندانہ حد تک رہنا چاہیے۔ اس حد سے زیادہ جتنا وزن بڑھے گا، امراضِ قلب چمٹنے کا خطرہ اتنا ہی بڑھ جائے گا۔ موٹاپا، ہائی بلڈ پریشر بھی پیدا کرتا اور ایل ڈی ایل کولیسٹرول کی سطح خطرناک حد تک بڑھا دیتا ہے۔ ماہرینِ طب کے نزدیک کولہوں سے زیادہ پیٹ پر چربی کی تہیں جنم دل کے لیے زیادہ خطرناک بات ہے۔

اس کی ایک وجہ ہے۔ ماضی میں خیال تھا کہ چربی کیلوریز (حرارے) جمع کرنے کا فطری طریقِ کار ہے، مگر اب انکشاف ہوا ہے کہ چربی حیاتیاتی طور پر سرگرم شے ہے۔ یہ مخصوص ہارمون اور کیمیکل خارج کرتی ہے۔ یہ کیمیائی مادے خون کے دباؤ اور خون میں موجود شکر پر منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ اس باعث امراضِ قلب جنم لینے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ورزش کی عدم موجودگی:

پاکستان میں بہت سے مرد وزن ورزش نہیں کرتے۔

سگریٹ نوش والدین کے بچوں کو دمہ یعنی استھما کی بیماری ہونے کے امکانات عام بچوں کی نسبت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ پڑھیے استھما اور بچوں کی مشکلات سے متعلق مضمون..... ''آؤ تمہیں سانس دوں'' صفحہ 132 پر

اِس کی اہم وجہ نقل وحرکت سے عاری طرزِ زندگی اختیار کرلینا ہے۔ آج کسی کو قریبی دکان پر بھی جانا ہو، تو وہ کار یا موٹر سائیکل پر جاتا ہے۔ پیدل چلنا گویا حرام ہو چکا، مگر حرکت سے محرومی دل کی بیماریاں چمٹنے کا خطرہ بڑھاتی ہے۔ خاص طور پر جو مرد وزن دِن کا بیشتر حصّہ بیٹھے ہوئے گزارتے ہیں، وہ جلد یا بدیر امراضِ قلب کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

باقاعدگی سے ورزش کرنے کے کئی فوائد ہیں۔ یہ جسمانی چربی جلاتی ہے۔ اچھے ایچ ڈی ایل کولیسٹرول کی سطح میں اضافہ کرتی ہے۔ خون کے دباؤ میں کمی لاتی اور خون میں شکر کی سطح گھٹاتی ہے۔ مزید برآں ذہنی دباؤ بھی کم کر دیتی ہے۔ انسان پریشان اور مایوس ہو، تو دل کی بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ بڑھتا ہے۔

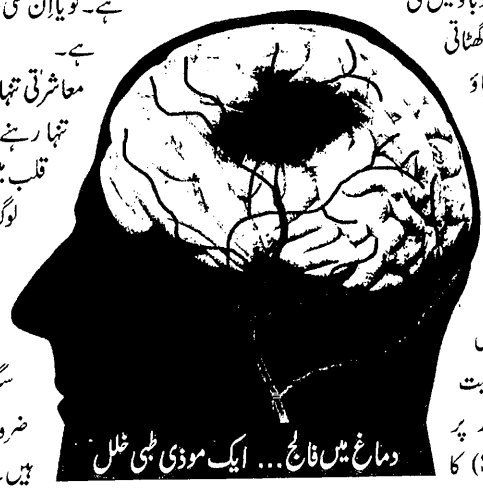

نفسیاتی وجوہ:

انسان کی ذہنی صحت بھی امراضِ قلب میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان ذہنی دباؤ (Stress) کا شکار ہو، تو اس کے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں دل تک کم خون پہنچتا ہے، لہٰذا پمپ کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ نیز جسم میں سوزش بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹروں کی رو سے ڈپریشن اور امراضِ قلب کا قریبی تعلق ہے۔ یہ روحانی مرض دل کی بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ دگنا بڑھاتا ہے۔ ماہرینِ طب اب تک نہیں جان سکے کہ دونوں امراض کیونکر قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ایک نظریہ ہے کہ ڈپریشن کے مریض ورزش نہیں کرتے، غذائیت بھری غذا نہیں کھاتے اور اَدویہ بھی نہیں لیتے، اِسی باعث امراضِ قلب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دوسرا نظریہ ہے کہ ڈپریشن کی وجہ سے انسانی جسم میں ''دباؤ ردِعمل نظام'' (Stress response System) بگڑ جاتا ہے۔ اِسی لیے دل کی بیماریاں چمٹ جاتی ہیں۔

غصّہ اور نفرت:

جدید طبی تحقیق سے آشکارا ہوا ہے کہ جو لوگ زیادہ غصّہ کریں، نفرت اور حسد میں مبتلا رہیں، تو عام لوگوں کے برعکس اِن میں امراضِ قلب جنم لینے کا خطرہ دو تین گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ گویا اِن منفی جذبات سے بچنے میں عافیت ہے۔

معاشرتی تنہائی:

تنہا رہنے والے مرد وزن بھی امراضِ قلب میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہیں، اِن میں دل کی بیماریاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ دراصل تنہا رہنے والے عموماً سگریٹ نوشی کرتے اور ضرورت سے زیادہ کھاتے ہیں۔ اِن میں کولیسٹرول کی سطح بلند ہوتی ہے۔ یہ عوامل انھیں کسی نہ کسی قلبی مرض میں گرفتار کرا دیتے ہیں۔ جبکہ دیکھا گیا ہے کہ جو بوڑھے دوستوں کے ساتھ تعلق رکھیں، اِن میں امراضِ قلب سے بچاؤ بڑھ جاتا ہے۔

دماغی فالج (Stroke):

دماغ انسانی جسم کا اہم ترین عضو ہے۔ یہ مختلف کام انجام دیتا ہے، مثلاً سوچنا، دیکھنا، سننا، سونگھنا، محسوس کرنا، جسم کو حرکت دینا وغیرہ۔ یہ تمام کام دیگر اعضا کی مدد سے انجام پاتے ہیں۔ دماغ مگر اُسی وقت اپنی ذمے داریاں بخوبی ادا کرتا ہے جب اُسے آکسیجن سے بھرپور خون مسلسل ملتا رہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسی لیے دماغ کو خون فراہم کرنے والی نالیوں یا نسوں کا نہایت مربوط و پیچیدہ نظام تخلیق کیا ہے۔ یہ کئی سو چھوٹی بڑی نالیوں کا مجموعہ ہے جو پورے دماغ میں کونے کونے تک جاتی ہیں۔ اِس عظیم الشان نیٹ ورک کا فائدہ یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی نالی خراب ہو جائے، تو دوسری نالیاں دماغ کو آکسیجن بھرا خون فراہم کرتی رہتی ہیں، مگر جب کسی بھی وجہ سے معمولی دماغی حصّے کو بھی خون نہ مل سکے، تو دماغ فالج کا نشانہ بن جاتا ہے۔

دماغ پر حملہ کرنے والے ۹۰ فی صد فالج (وقف الدم) (Ischemic) کہلاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب ایک دماغی نالی میں خون کی روانی رک جائے، تو فالج کا حملہ جنم لیتا ہے۔ تب وہ حصّہ جسم آکسیجن بھرا خون نہ پا کر مفلوج ہو جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے خون کی فراہمی کچھ دیر کے لیے بند ہوئی، تو ایک ڈیڑھ دن بعد فالج کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں، مگر یہ عارضی حملہ انتباہی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اگر انسان احتیاطی تدابیر نہ کرے، تو اس پر دماغ کا مکمل فالج بھی گر سکتا ہے۔

دماغی فالج کی ایک قسم خون کی نالی پھٹنے سے جنم لیتی ہے۔ یہ حالت زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ نالی سے نکلنے والا خون دماغی خلیوں کو نقصان پہنچاتا ہے، نیز وہ دماغ میں دباؤ بھی پیدا کرتا ہے۔ اِس باعث نالی کے اردگرد واقع بافتیں (ٹشوز) بھی خراب ہو سکتی ہیں۔

عام طور پر خواتین زیادہ دماغی فالج کا شکار ہوتی ہیں۔ اِن میں اِس طبی خلل سے مرنے کی شرح بھی زیادہ ہے۔ اِس کے باوجود ہر سال لاکھوں مردوں پر بھی دماغی فالج گرتا ہے۔ درج ذیل عوامل مرد و زن میں دماغی فالج پیدا ہونے کا خطرہ بڑھاتے ہیں:

عمر:

انسان جتنا زیادہ بوڑھا ہو، وہ اتنا ہی دماغی فالج میں مبتلا ہوتا ہے۔ ۵۵ برس کا ہوتے ہی ہر دس سال بعد دماغی فالج گرنے کا خطرہ دگنا ہو جاتا ہے۔ اِس باعث دماغی فالج ۵۰ برس کی عمر کے بعد ہی چمٹتا ہے۔

خاندانی تاریخ: اگر والدین، بھائی، بہن یا کوئی قریبی رشتے دار دماغی فالج میں مبتلا ہو، تو خصوصاً امراضِ قلب کے مریضوں پر بھی یہ مرض حملہ کر سکتا ہے۔ جینیاتی اثرات کے باعث خون میں تھکے جمنا اور ہائی بلڈ پریشر ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ مزید براں یکساں مضرِ صحت طرزِ زندگی خطرات میں اضافہ کر دیتا ہے۔

ہائی بلڈ پریشر: دل کی بیماریاں اور ہائی بلڈ پریشر دماغی فالج کو دعوت دیتی ہیں۔ جیسا کہ بتایا گیا ہائی بلڈ پریشر کا علاج نہ ہو، تو وہ خون کی نالیوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اِس باعث دماغی فالج پیدا ہونے کا خطرہ بڑھتا ہے۔

سگریٹ نوشی: یہ منفی عادت انسان پر دماغی فالج گرانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وجہ یہی کہ اِس عادتِ بد کے نتیجے میں انسان ہائی بلڈ پریشر، امراضِ قلب اور کولیسٹرول کی زیادتی کا نشانہ بنتا ہے۔ اور یہ تمام بیماریاں مل کر دماغی فالج گرا دیتی ہیں۔ یہ دھیان رہے کہ سگریٹ کے دھوئیں میں طویل عرصے رہنے والا صحت مند انسان بھی درج بالا عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔

کولیسٹرول: اگر مرد یا عورت کے جسم میں ایل ڈی ایل کولیسٹرول کی سطح بڑھ جائے، تو یہ کیفیت دماغی فالج چمٹنے کا خطرہ پیدا کرتی ہے۔ چاہے آپ امراضِ قلب اور ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا نہ ہوں۔

ورزش کی کمی: جسمانی سرگرمی نہ ہونا بھی دماغ فالج کے حملے کو دعوت دیتا ہے، مگر انسان باقاعدگی سے ورزش کرے، تو خون کی نالیوں میں رکاوٹ جنم لینے کا خطرہ کافی کم ہو جاتا ہے۔

موٹاپا:

فربہ انسان جلد دماغی فالج کا شکار ہوتا ہے۔ ایسا انسان

عموماً امراضِ قلب، ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس میں مبتلا ہوتا ہے۔ نیز زائد وزن خون کی گردش کے پورے نظام پر شدید دباؤ ڈال دیتا ہے۔ ایسی حالت دماغی فالج گرنے کا خطرہ کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔

ذیابیطس:

اگر انسان اِس مرض میں مبتلا ہے، تو دماغی فالج جنم لینے کا خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

پھیپھڑے کا کینسر

لاکھوں مرد وزن میں یہ مرض اموات کا بڑا سبب ہے۔ ہر سال پاکستان اور دُنیا کے دیگر ممالک میں لاکھوں مرد و خواتین اِس بیماری کے ہاتھوں جاں بحق ہوتے ہیں۔ تمباکو نوشی یہ سرطان پیدا کرنے کی اہم وجہ ہے۔ ماحول میں ملنے والے زہریلے کیمیائی عناصر مثلاً ایسبیٹوس بھی اِسے جنم دیتے ہیں۔

پروسٹیٹ (Prostate) کینسر

یہ سرطان مردوں کو نشانہ بناتا ہے۔ مختلف وجوہ کی بنا پر جنم لیتا ہے۔ مثلاً مرد کی عمر ۷۰ برس ہوجائے، تو اِسے چمٹنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ مرض ۵۰ سال کی عمر کے بعد ہی مرد کو اپنا شکار بناتا ہے۔ اگر مریض کا باپ، بھائی یا بیٹا اِس کینسر میں مبتلا ہے، تو وہ اِسے بھی چمٹ سکتا ہے۔

بعض غذاؤں کا زیادہ استعمال بھی اِس کینسر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مثلاً جو مرد زیادہ سرخ گوشت کھائیں یا ڈیری مصنوعات استعمال کریں، تو وہ وہ پروسٹیٹ کینسر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح زیادہ کیلشیم لینا اور اِس پر مشتمل غذائیں کھانا خطرناک ہے۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جن غذاؤں میں لائکوپین (lycopene) غذائی مادہ موجود ہو، وہ پروسٹیٹ کینسر سے بچاتی ہیں۔ اِن میں ٹماٹر، تربوز اور پپیتا شامل ہیں۔ موٹاپا بھی سرطان کی یہ قسم لاحق ہونے کا خطرہ بڑھاتا ہے۔

(مزمن مزاحم رویی مرض)

Chronic Obstructive Pulmonary Disease

یہ پھیپھڑوں کا مرض ہے۔ اِس کی وجہ سے انسان سانس لینے میں تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اِس کی دو اَقسام ہیں۔ (مزمن کھانسی) (Chronic Bronchitis) میں پھیپھڑوں کی ہوائی نالیاں سُوج جاتی ہیں اور اِن میں غلیظ مواد بھر جاتا ہے۔ ''نفاخ'' Emphysema قسم میں پھیپھڑوں میں ننھی منی ہوائی تھیلیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔ یہ مرض کئی برس کے عرصے میں مختلف خرابیوں (مثلاً سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے جنم لیتا ہے)۔

ہمارے ماحول میں مختلف کیمیائی وغیر کیمیائی مضرِ صحت مادے پائے جاتے ہیں۔ یہ سانس کے ذریعے ہمارے جسم میں داخل ہو کر پھیپھڑوں تک پہنچتے ہیں۔ وہاں یہ عضو کی دیواروں سے چمٹ کر اِسے مختلف انداز میں نقصان پہنچاتے ہیں۔ اِن دیواروں کے خلیے تھوڑی مقدار میں لیس دار مادہ (Mucus) خارج کرتے ہیں تاکہ وہ چکنی رہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ جب کیمیائی مادے پھیپھڑوں کے خلیوں پر حملہ آور ہوں، تو ہمارا مامون نظام اِن کا مقابلہ کرنے کی خاطر سوزشی (Inflammatory) خلیے بھجواتا ہے۔ یہ خلیے بھی کیمیکل خارج کرتے ہیں۔ اِس باعث پھیپھڑوں کی دیواریں مزید لیس دار مادہ پیدا کرتی ہیں۔ اِس کی وجہ سے ہوائی تھیلیوں میں ہوا (آکسیجن) گزرنے کی تھوڑی جگہ بچتی ہے اور اِنسان سانس لینے میں تکلیف محسوس کرتا ہے۔

کیمیائی مادوں اور سوزشی خلیوں کی باہمی جنگ سے پھیپھڑوں میں بعض مضرِ صحت خامرے (انزائم) بھی جنم لیتے ہیں۔ یہ خامرے رفتہ رفتہ عضو کی بافتیں تباہ کر ڈالتے ہیں۔ اِس تباہی سے کھانسی اور رَیشہ پیدا ہوتا ہے، مگر جب مرض ظاہر ہو، تو عموماً پھیپھڑوں کی بیشتر بافتیں تباہ ہوجاتی ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ ۸۰ سے ۹۰ فی صد مریضوں کو یہ مرض

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

سگریٹ اور تمباکو نوشی سے چمٹتا ہے۔ مزید براں تمباکو کا دھواں، ہوائی آلودگی، کارخانے کا دھواں، کیمیائی مادے اور مٹی بھی یہ مرض پیدا کرتی ہے۔ وراثتی جین بھی اِسے جنم دینے کے ذمے دار ہیں۔

الزائمر مرض

یہ مرض مردوں سے زیادہ خواتین کو نشانہ بناتا ہے۔ دماغ کی یہ بیماری عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ دنیا میں لاکھوں مرد وخواتین اِس طبی خلل میں مبتلا ہیں۔ یہ بیماری عموماً انسان کی روزمرہ زندگی ختم کرڈالتی ہے۔ انسان سب کچھ بھول بھال کر زندہ لاش بن جاتا ہے۔

ماہرین اب تک یہ جان نہیں پائے کہ الزائمر مرض کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ ایک نظریہ ہے کہ دماغ میں پائے جانے والے پروٹین مادوں میں خرابی اسے پیدا کرتی ہے۔ ان خرابیوں کے سبب دماغ کے خلیے (نیورون) رفتہ رفتہ مرجاتے ہیں۔ مزید براں ان کے مابین رابطہ بھی نہیں رہتا جس سے کہ دماغ میں یادداشت جنم لیتی ہے اور دِیگر دماغی فعل بھی انجام پاتے ہیں۔

دماغ میں خصوصی کیمیکل، نیوروٹرانسمیٹر پائے جاتے ہیں۔ یہی کیمیکل اربوں دماغی خلیوں کے مابین پیغامات کی ترسیل کرتے ہیں۔ الزائمر مرض میں اِن کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے۔ جب مرض کی شدت بڑھ جائے، تو دماغ سکڑ جاتا ہے۔ یہ مرض بھی مختلف وجوہ کی بنا پر جنم لے سکتا ہے۔

ایک وجہ عمر ہے۔ ۶۰ سال کی عمر کے بعد یہ بیماری جنم لینے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ وراثت بھی اہم کردار اَدا کرتی ہے۔ ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ جن مردوزن میں APOE نامی جین پایا جائے، وہ بڑھاپے میں الزائمر مرض چمٹا سکتا ہے۔ امراضِ قلب، ذیابیطس، کولیسٹرول میں اضافہ اور سگریٹ نوشی بھی یہ بیماری پیدا کرنے میں معاون بنتے ہیں۔ سر پہ چوٹ بھی پیش خیمہ بنتی ہے۔ اِسی باعث باکسر عموماً بوڑھے ہوکر الزائمر مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ذیابیطس

شکر (گلوکوز) ہمارے جسم کا بنیادی ذریعۂ توانائی ہے۔ جب ہمارا جسم شکر سے توانائی نہ بنا پائے، تو خون میں اِس مادے کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ یہی کیفیت ذیابیطس پیدا کرتی ہے۔ پچھلے چند عشروں سے یہ طبی خلل دنیا میں کروڑوں مردوزن کو اپنا شکار بنا چکا۔

ذیابیطس کے ضمن میں خطرناک بات یہ ہے کہ اگر اِس کا علاج نہ ہو، تو یہ انسان کو دیگر عوارض میں گرفتار کرا دیتا ہے۔ مثلاً گردوں کی خرابی، ہاتھ پیروں سے محرومی اور اَندھاپن۔ مزید براں یہ امراضِ قلب، الزائمر مرض اَور دماغی فالج چمٹنے کا خطرہ بھی بڑھاتا ہے۔ اِس باعث یہ طبی خلل ہر سال لاکھوں مردوں اَور عورتوں کی جان لے لیتا ہے۔

موٹاپا اور مضرِ صحت طرزِ زندگی ذیابیطس پیدا کرنے کے اہم ذمے دار ہیں۔ وراثتی جین بھی کچھ کردار اَدا کرتے ہیں۔ نیز یہ مرض عموماً ۴۰ سال کی عمر کے بعد چمٹتا ہے۔ بیشتر

شوگر انسان کو کھا جاتی ہے بالکل ویسے ہی، جیسے انسان بداحتیاطی کرتے ہوئے بے تحاشا الم غلم خوراک کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنالیتا ہے اور اس کا مقصدِ حیات صرف اور صرف کھانا اور بہت زیادہ کھانا ہی رہ جاتا ہے۔ نتیجتاً شوگر کی موذی بیماری اس کے گلے آن پڑتی ہے اور پھر ساتھ لے کر ہی ٹلتی ہے۔

اپنا طرزِ زندگی اور خوراک کی عادات بدل کر اسے اسے جڑ سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ مگر کیسے؟

پڑھیئے صفحہ نمبر 105 پر سلسلہ وار مضمون کا آخری حصہ اور کہہ دیجیے ذیابیطس کو الوداع

"گڈ بائے شوگر"

مرد وزن ذیابیطس قسم ۲ کا نشانہ بنتے ہیں۔

انفلوئنزہ اور نمونیا

ماضی میں انفلوئنزہ (فلو)، نمونیا اور دیگر چھوتی امراض کروڑوں اَفراد کو موت کے منہ میں پہنچا دیتے تھے۔ طبی سائنس کی ترقی نے مگر اِن کا پھیلاؤ محدود کر دیا، مگر بوڑھے مرد وزن کے لیے یہ چھوتی امراض اَب بھی خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً ۵۰ سال کی عمر کے بعد چھوتی امراض چمٹ جانے کا خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

فلو ایک انتہائی چھوتی وائرس پیدا کرتا ہے۔ جب وائرس سے متاثرہ انسان چھینک مارے یا کھانسے، تو وہ دوسرے کو بھی اِس کا شکار بناڈالتا ہے۔ (فلو کے وائرس لعابِ دہن کے ساتھ چھے فٹ دُور تک جاسکتے ہیں)۔ مزید برآں وائرس کسی جگہ موجود ہو، تو اُسے چھونے سے بھی چمٹ جاتا ہے۔ انسانی جسم میں پہنچتے ہی یہ وائرس بہ سرعت اپنی تعداد بڑھاتا اور اِنسان کو مختلف تکالیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مثلاً سانس لینے میں دشواری، تھکن، سر درد، بخار، عضلات میں درد اَور گلا خراب ہوجانا۔

فلو کے وائرس کی ایک خطرناک بات یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تیزی سے تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اِسی باعث ہر سال فلو وائرس کے توڑ کی خاطر نئی ویکسین تیار کرنا پڑتی ہے۔ یہ وائرس بوڑھے مرد وزن کو عموماً مار ڈالتا ہے۔

نمونیا بھی سانس کی بیماری ہے، تاہم یہ وائرس کے علاوہ جرثومے یا کیمیائی مادے سے بھی جنم لیتی ہے۔ اِس مرض میں مبتلا انسان بخار، کھانسی اور سانس لینے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ بچوں اور بوڑھوں کا مامون نظام کمزور ہوتا ہے۔ اِسی لیے وہ نمونیے میں اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں۔

مزمن گردہ مرض

گردے ہمارے بدن کا اہم عضو ہیں۔ یہ ہمارے جسم سے زہریلے مادے اور فضلہ نکالتے ہیں، مگر یہ مٹھی جتنے دو اعضا بہترین منتظم بھی ہیں۔ یہ ہمارے جسم میں خون کا دباؤ متوازن رکھتے ہیں، مائع مادوں کو حد سے زیادہ نہیں بڑھاتے اور معدنیات کا توازن نہیں بگڑنے دیتے۔ اِس باعث یہ ضروری ہے کہ گردے تندرست وتوانا رہیں۔

گردے مختلف طریقوں سے کسی خرابی کا شکار ہوتے ہیں۔ عام طور پر خرابیاں گردوں میں موجود خون کو گردش دینے والی ننھی منی نالیوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ یہ نالیاں بخیر وخوبی کام کریں، تبھی گردے بھی اپنا کام درست طریقے سے انجام دیتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق دو سے تین کروڑ پاکستانی گردوں کے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہیں، لیکن اکثر کو اِس بات کا علم نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ بیشتر امراضِ گردہ رفتہ رفتہ جنم لیتے ہیں، بعض تو مرض بنتے ہوئے کئی سال لگا دیتے ہیں۔ مزید براں آغاز میں گردے کی بیماری علامات ظاہر نہیں کرتی۔ آہستہ آہستہ مریض تھکن، پیشاب کی زیادتی اور کم بھوک لگنا محسوس کرتے، تو تب بھی وہ نہیں جان پاتا کہ یہ خرابیٔ گردہ کی علامتیں ہیں۔ اِسی باعث جب مزمن گردہ مرض خطرناک حالت میں داخل ہوجائے، تبھی اکثر مریضوں کو اِس موذی کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ خون یا پیشاب کے ٹیسٹ سے مرض کا پتا چلتا ہے۔

☆فلو کی عام علامات☆

جن لوگوں کو فلو ہوتا ہے ان میں یہ کچھ یا ساری علامات ہوتی ہیں۔ بخار پٹھوں میں درد سر، جسم میں درد، گلے میں خراش، کھانسی، کمزوری۔

(انفلوئنزا کی موجودہ بگڑی شکل کو اب دنیا کورونا یا کووڈ کے نام سے بھی جانتی ہے۔ یہ بیماری انفلوئنزا ہی کے خاندان سے ہے)

جب گردے اپنا کام صحیح طریقے سے نہ کریں، تو خون میں زہریلے مادے جمع ہونے لگتے ہیں۔ یہی کیفیت آخرکار مزمن گردہ مرض کو جنم دیتی ہے۔ خون میں زہریلے مادے بڑھ جائیں، تو پھر مرض کی علامات سامنے آتی ہیں، مثلاً تھکن ہوجانا، کمزوری اور سوچنے میں دشواری۔ مزید برآں پورا جسم سُوج جاتا ہے۔

خوش قسمتی سے گردے محفوظ کرنے کی خاطر مختلف اقدامات کرنا ممکن ہے۔ پہلا قدم یہی ہے کہ آپ اِن خطرات سے آگاہ ہوں جو امراضِ گردہ پیدا کرتے ہیں۔

پہلا بڑا خطرہ ''ذیابیطس'' ہے۔ اِس مرض میں مبتلا چالیس، پچاس فی صد مرد وزن کے آخرکار گردے بھی خراب ہوجاتے ہیں۔ مزید برآں ہائی بلڈ پریشر بھی رفتہ رفتہ گردوں کی نالیوں کو نقصان پہنچاتا ہے، چنانچہ وہ خون کو درست طور پر چھان کر زہریلے مادے نہیں نکال پاتے۔

عمر کا بڑھنا بھی ایک خطرہ ہے۔ ۶۰ سال سے بڑے مرد وزن اگر صحت مندانہ طرزِ زندگی اختیار نہ کریں، تو وہ جلد امراضِ گردہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ طویل عرصے تک ادویہ کا استعمال بھی گردوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ دل کی بیماریاں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

☆☆☆

حرفِ آخر

قارئین، زیرِ مطالعہ مضمون کے ذریعے آپ نے تفصیل سے جانا ہے کہ ۵۰ برس کی عمر کے بعد کون سی بیماریاں مرد وزن کو اپنا نشانہ بناتی ہیں۔ اگر نوجوانی میں اِن امراض کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل کرلی جائیں، تو ادھیڑ عمری میں اِن سے بچاؤ آسان ہوجاتا ہے۔ اِسی لیے اِن کے بارے میں آپ کو تفصیلی طور پر آگاہ کیا گیا۔

اِن شاء اللہ اگلے ماہ ہم مزید ایسی دس بیماریوں کے بارے میں مفید معلومات فراہم کریں گے جو ۵۰ سال کے بعد لاکھوں مرد وزن کی زندگی اجیرن بنا ڈالتی ہیں۔ اِن بابت جان کر قارئین اس قابل ہوسکیں گے کہ ادھیڑ عمری میں مناسب تدابیر اپنا کر موذی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔

◆◆

خواتین بڑھاپے اور بڑھتی عمر کو لے کر مردوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ ماں بننے کے مراحل، جسم میں مناسب خوراک کی عدم موجودگی، اولاد کی ذمہ داریاں اور شوہر کے حقوق و فرائض پورے کرتے نیز اخراجات اور آمدنی کا حساب رکھتے، فکریں پالتے، کب وہ بوڑھی ہو جاتی ہیں پتا ہی نہیں چلتا۔ فکریں انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہیں جبکہ سدا جوان نظر آنا اور خوبصورت لگتے رہنا عورت کی جبلّی خواہشوں میں سے ایک ہے۔

خواتین میں سے بعض اس بڑھتی عمر کے اثرات کو روکنے کے لیے میک اپ اور مصنوعہ کا سہارا لیتی ہیں جبکہ بیشتر اس کے صحیح استعمال یا بے جا استعمال کے مضر اثرات سے ناواقف ہوتی ہیں۔

نتیجتاً مثبت اثرات کے بجائے اُلٹ اثر ہوتا ہے اور ان کے چہرے پر وقت اور عمر سے پہلے ہی، مزید جھریاں آنے لگتی ہیں۔ چہرہ عمر کو دھوکا دینے کے لیے بہترین ہتھیار ہے اگر خواتین یہ جان جائیں کہ کس عمر میں انھیں کون سی کریم، لوشن اور مصنوعات استعمال کرنی ہیں تو یقیناً وہ اپنے آپ کو تر و تازہ اور جوان رکھنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔

ہاتھ، پاؤں اور چہرہ تا دیر جواں، تر و تازہ اور ہشاش بشاش رکھنے کے لیے ایک ایسا ہی مضمون صفحہ نمبر 175 پر موجود ہے جسے پڑھ کر آپ بھی کہہ اُٹھیں گے کہ:

''خواتین اور بڑھاپا؟..... ناممکن!''

☆☆☆

دردِ ماضی

منیر احمد شیخ

ایک عجیب خوشبو چہار سُو مجھے گھیرے ہوئے تھی اور میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے... کیوں؟

ایم اے کے امتحان سے فارغ ہو کر میں نے سوچا کہ واپس اپنے شہر چلا جاؤں جہاں سے نکلے ہوئے مجھے پانچ چھے برس ہونے کو آئے تھے۔ امتحان کی فکر سے میری صحت بہت گر گئی تھی اور لگاتار محنت کی وجہ سے میرا اعصابی نظام بگڑ چکا تھا۔ بازار میں چلتے چلتے یہ وہم ہونے لگتا کہ ابھی یہیں کہیں کسی دکان کے سامنے گر جاؤں گا۔ گھر سے اکیلے نکلنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ بس یہی محسوس ہوتا کہ اکیلے میں کہیں گر گیا، تو مجھے کون سنبھالے گا اور کون گھر پہنچائے گا؟

بھرے بازاروں میں میری حالت اور بھی بگڑ جاتی۔ میں بازار کے عین وسط میں چلنے کے بجائے اطراف میں دکانوں اور دیواروں کے ساتھ ہو کر چلتا کہ گروں گا، تو دیوار کو تھام لوں گا۔ پتا نہیں یہ صرف اعصابی نظام کے کمزور ہونے کی بنا پر تھا یا پھر کوئی نفسیاتی مرض تھا جو مجھے لاحق ہو گیا تھا، لیکن اتنا پتا ہے کہ اس تکلیف کے ہاتھوں میں جسم کے علاوہ ذہنی طور پر بھی بہت دُبلا ہوتا جا رہا تھا اور اِس قدر عاجز آ گیا تھا کہ کئی دفعہ میں نے خواہش کی کہ اِس عذاب سے جینے کی نسبت موت آ جائے تو وہ میرے لیے کہیں آسان ہو گی۔

فوری طور پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے شہر میں واپس جاؤں اور وہاں جا کر مکمل فراغت سے رہوں۔ بچپن کے دوستوں سے ملوں، اپنے پرانے اسکول میں جاؤں، اپنی گلیوں اور بازاروں میں گھوموں اور بےفکری کے کچھ دن گزار کر کھوئی ہوئی صحت بحال کروں۔ اِس فیصلے سے مجھے یک گونہ تقویت پہنچی اور یوں محسوس ہوا جیسے میں نے واپس اپنے شہر میں جانے کے فیصلے سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہو اور اَب میں دیواروں کے سہارے ڈھونڈنے کے بجائے اپنے

انسان کی زندگی میں بہت سے ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ اپنے ماضی کو ڈھونڈتا اور بچپن سے جوانی تک کی تمام منازل طے کرنے والے اُن رشتوں کو ایک بار پھر کھوجتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی کے راستے پر ہمیں کچھ لوگ دو دفعہ ضرور یاد آتے ہیں اور ہم ان سے ایک بار پھر ملنا چاہتے ہیں۔ ایک تب جب ہماری زندگی کی نئی نئی شروعات ہوئی اور ایک تب جب ہم ایک منزل پر پہنچ کر دم لینے کو رُکتے ہیں۔ یہ کہانی ایسے ہی تانے بانے بُنتی نظر آئے گی۔

پاؤں پر خود اِعتمادی سے کھڑا ہو سکوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی پنڈلیوں میں باقاعدہ ایک طاقت محسوس کی جو مجھے کھڑا ہونے اور چلنے بلکہ دوڑنے پر اُبھار رہی تھی۔

جب واپس اپنے شہر پہنچا، تو میں نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ میرے سارے جسم میں طاقت آ رہی ہے اور اُپنے بچپن کی فضا سے گھل مل کر میری رگوں میں خون پھر سے دوڑنے لگا ہے۔ اِتنے برسوں کے بعد میں نے ان دوستوں کی تلاش کی جو میرے ساتھ سکول میں پڑھا کرتے تھے، مگر پھر غربت اور تنگ دستی کے ہاتھوں درمیان ہی میں سلسلۂ تعلیم چھوڑ گئے تھے اور ان کی شکلیں دیکھے مدت ہو گئی تھی۔

ان میں اسلم تھا جس کو ہم سب کلاس میں ''اسلو'' کہہ کے بلاتے۔ نصیر اتیلی تھا، فقیر محمد عرف پھیرو نائی تھا۔ اس بیچارے نے تو کبھی کسی کی حجامت نہ کی تھی، مگر اس کا باپ چونکہ حجامتوں کا کام کرتا تھا، اِس لیے فقیر محمد کو یہ خطاب ورثے میں قبول کرنا پڑا تھا۔ عبدالواحد لکڑ پاڑ تھا جس کے باپ کا لکڑیوں کا ٹال تھا۔ پھیرو نائی کی طرح عبدالواحد عرف واحدے لکڑ پاڑ کو بھی یہ خطاب اپنے باپ کی اِس خطا پر ملا ہوا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے لکڑیاں پھاڑتا اور بیچتا تھا۔

ایک دن شام کے وقت گھومتے گھماتے میں جی ٹی روڈ پر سینما کی عمارت کے سامنے کھڑا تھا، تو میں نے دیکھا کہ میرے سامنے تکّے کبابوں کی ایک دکان پر خوب رونق ہے۔ مسالوں میں گندھے ہوئے گوشت کو آگ پر رکھنے سے ایک ایسی خوشبو دھوئیں کے ساتھ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی کہ بے اختیار میرے منہ میں پانی آ گیا اور میں نے ارادہ کیا کہ اِس دکان سے تکّے کباب کھائے جائیں۔

دکان کے سامنے پہنچا، تو کیا دیکھا کہ دہکتے ہوئے کوئلوں کی ایک بڑی سی انگیٹھی کے سامنے ایک لحیم شحیم پہلوان نما قسم کا آدمی بیٹھا ہے۔ اُس کی شیو تین چار دِن کی بڑھی ہوئی تھی مگر اُس کے گھنے بالوں کی سیاہی میں سے اُس شخص کی جلد کی روشنی جھلکیاں مار رہی تھی۔ جگمگ جگمگ کرتا چوڑا ماتھا پسینے کی بوندوں سے چمک رہا تھا۔ اِس کے مضبوط کندھوں پر نمایاں چیز اس کی موٹی گردن تھی جو بغیر کسی لچک کے چہرے اور کندھوں کے درمیان نصب ہوئی نظر آتی تھی۔

میں نے اُسے مخاطب ہو کر کہا مجھے ایک درجن تکّے اور درجن کباب تیار کر دو۔ وہ ایک دم چونکا۔ پھر اُس نے میری طرف یوں دیکھا کہ جیسے میری آواز کے راستے سے وہ میرے خدوخال پہچان رہا ہو۔ وہ ذرا سا مسکرایا اور گرم سیخ کو پانی کی بالٹی میں ڈالتے ہوئے مجھے کہا:

''تم باؤ منیر تو نہیں؟''

میں نے کہا: ''ہاں! میں منیر تو ہوں، مگر باؤ سے میری میل ملاقات نہیں۔''

اس نے کہا، ''جو پتلون پہنے اور پڑھ لکھ جائے، وہ باؤ بن جاتا ہے۔ مجھے پہچانا یا نہیں؟''

میں نے جو اَب غور سے دیکھا، تو وہ اسلو تھا جو پانچویں جماعت میں سالانہ امتحان سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ کر اپنے باپ کی دکان پر اس کے ساتھ کام میں لگ گیا تھا۔ باپ

تھوڑا بہت کام تو وہ اسکول سے چھٹی کے بعد بھی کیا کرتا۔ جب ہم جماعت میں اُس سے پوچھتے کہ تمہارے ہاتھوں سے پیاز کی بُو کیوں آتی ہے؟ تو وہ بتلایا کرتا کہ وہ ہر روز گھر جا کر کئی کئی سیر پیاز چھیلتا ہے۔ اس سے صبح تک اس کی آنکھوں سے پانی بہتا رہتا ہے۔

باپ کا کاروبار بڑھ گیا تھا اور اُسے اپنے ساتھ مددگار کی ضرورت تھی۔ اُسلو پانچویں جماعت سے اُٹھا اور باپ کے ساتھ کباب لگانے لگا۔ اس کا باپ بوڑھا ہو چکا تھا اور اَب وہ انگیٹھی کے سامنے نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ حج کرنے کے بعد جب واپس آیا، تو اس کا بس یہی کام تھا کہ اپنی دکان کے باہر کرسی لگا کر بیٹھا رہتا اور صرف گاہکوں کا خیال رکھتا کہ انھیں سودا حاصل کرنے میں کوئی دِقت تو نہیں ہوتی۔

میں نے اسلم سے پوچھا کہ تم اُسلو تو نہیں؟

اُس نے خوش ہو کر کہا کہ آخر پہچان ہی لیا تم نے باؤ۔ پھر اُس نے بالٹی میں سے ایک بھیگی ہوئی سیخ نکالی اور تیار شدہ قیمے کا ایک چھوٹا سا گولہ بنا کر اُس میں چڑھایا اور اَپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو ملا کر گولے کو سیخ پر پھیلاتے ہوئے پوچھا:

''اتنے سالوں بعد ملے ہو! کتنی جماعتیں پڑھ چکے؟''

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اگر میں نے یہ کہا کہ ایم۔اے کا امتحان دے کر آیا ہوں، تو اِس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ میں نے اسے کہا:

''سولہ جماعتیں پڑھ کے آیا ہوں۔''

''سولاں جماعتیں۔'' اس نے زیرِ لب دہرایا، پھر میری طرف نظر بھر کے یوں دیکھا جیسے میرا جائزہ لے رہا ہوں اور کہا:

''کوئی سواد تے نہ آیا۔ ذرا اَپنی جان وکھ تے ساڈی وکھ۔'' (یعنی کوئی لطف نہ آیا، اس لیے کہ ذرا اَپنی جان کو بھلو اور ہماری صحت بھی ملاحظہ کرو۔)

اُس کی اِس بے ساختگی پر میں جھوم اُٹھا اور ایک لمحے کے لیے مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر پڑھائی لکھائی کے بعد یہی حالت ہو جاتی ہے جو اس وقت میری ہے، تو کباب لگا لگا کر جان بنانا اس سے کہیں بہتر ہے۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا کہ تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ آج میں اپنے یار کے لیے ایسی چانپیں لگاؤں گا کہ ساری عمر یاد کرتے رہو گے کہ اسلم کی دکان پر گئے تھے۔

واقعتاً جب پلیٹیں میرے سامنے آئیں، تو ان میں رکھی ہوئی گرما گرم چانپوں کی خوشبو اور اُن کی خستگی سے وہ لطف آیا کہ میں ہونٹ چاٹتا رہ گیا۔ اُٹھ کے جب جانے لگا، تو میں نے پوچھا:

''بھئی کتنے پیسے؟'' اِس پر اسلم نے سیخیں چھوڑ کر دھوتی کے پلّو سے اپنے چہرے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے صرف اتنا کہا:

بہترین دوست

انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بہترین دوست اپنے دوست کو ہمیشہ اچھی صلاح و مشورہ دیتا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے بہترین دوست وہ ہے جس کے لیے تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔ دوست سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا مگر وہ ہمارے لیے سب رشتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دوستی بے غرض ہونی چاہیے۔ دوست کی مدد کر کے اس سے بدلے کی توقع رکھنا دوستی کے مفہوم سے ناواقفیت ہے۔ ہمیں اچھے انسان کی طرح اپنے دوست کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہیے۔

(شائلہ نعیم بٹ، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی)

☆☆☆

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ اتنے برسوں بعد ملے اور پیسوں کا پوچھتے ہو۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ سولہ جماعتوں کا قصور ہے۔"

میں یہ جواب سن کر شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے اسے بڑا سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے کوئی ایسی بُری بات نہیں کی اور اُسے اس کا اتنا برا بھی نہیں منانا چاہیے، مگر اُس کی شکل سے معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے کوئی ناقابلِ معافی جرم کر دیا ہے۔

دو چار دن بعد ریلوے کراسنگ کے پاس نصیرے تیلی سے ملاقات ہو گئی جو ریلوے پھاٹک کے ساتھ ریڑھی لگائے گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ گنڈیریوں پر پانی چھڑکتے ہوئے وہ "ٹھنڈے تے میٹھے پیڑے" کی ہانک لگا رہا تھا۔ دو چار تازہ موتیے کے ہار بھی اس نے گنڈیریوں پر پھیلا رکھے تھے۔ نصیرے تیلی کو پہچاننے میں ذرا دقت نہ ہوئی کہ اس کی شکل اتنے برسوں میں بھی ذرا نہ بدلی تھی، سوائے آواز کے جو اَب پیشہ ور ریڑھی لگانے والوں جیسی ہو گئی تھی۔

اُس نے ریڑھی چھوڑ کر مجھے زور سے اپنے گلے لگا لیا اور کافی دیر کے بعد الگ کر کے بولا:

"ٹھنڈ پے گئی اے"۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اُس نے چُن چُن کے "مٹھ والے حصّے" کی گنڈیریاں میرے آگے رکھیں اور اصرار کر کے کھلاتا رہا۔ جب میں چلنے لگا، تو اس نے گنڈیریوں پر سے ایک ہار اُٹھا کر میرے گلے میں ڈال دیا اور کہا کہ یہ اپنے غریب دوست کا تحفہ سمجھو۔ میں نے دیکھا کہ نصیرے تیلی کی آنکھوں سے فخر اور خوشی کی جھلک روشنی کی لہر کی طرح باہر نکلی، مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے بجھ گئی۔ جدا ہوتے وقت اُس نے اتنا کہا:

"تم نے میرے پاس آ کر میرا سر اُونچا کر دیا ہے۔ میری زندگی میں ٹھنڈی میٹھی گنڈیریوں کے علاوہ اور کیا رہ گیا ہے۔"

میں نے اس کے موتیے کے ہار کو گلے سے اُتار کے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا اور گھر جا کر ایک کتاب کے صفحوں میں رکھ کر بند کر دیا۔

اسی طرح آہستہ آہستہ واحدے لکڑ پاڑ اور پھیرو نائی سے بھی ملاقاتیں ہو گئیں۔ واحدے لکڑ پاڑ نے کمیٹی میں دارو غے کی نوکری کر لی تھی اور لمبی لمبی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ پھیرو نائی حجامتیں کرنے کے بجائے جراّحی کی دکان کرتا تھا اور سیاسی گفتگو بڑے ذوق شوق اور اعتماد سے کرتا۔ واحدے لکڑ پاڑ اور پھیرو جراّح نے مجھے گھر بلا کر بڑی خاطریں کیں۔ آخری دن تک ہاتھ تھام تھام کے روکتے تھے کہ کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ اپنے شہر کی بہاریں روز روز کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ میرا جی بھی ایسا لگ گیا تھا کہ ان کو چھوڑنے کے خیال ہی سے مجھے یوں لگتا کہ میں پھر اکیلا اور کمزور ہو جاؤں گا۔

پتا نہیں کیا بات ہے، مگر ایمان داری سے کہتا ہوں کہ روز بروز ان بچپن کے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر، جنہیں میں بھلا چکا تھا، مجھے یوں لگا جیسے میری کھوئی ہوئی طاقت آہستہ آہستہ پھر پلٹنے لگی ہے اور اَسلم کشمیری، نصیرا تیلی، عبدالواحد لکڑ پاڑ اور پھیرو نائی میرے دست و بازو، میری طاقت اور میری توانائی ہیں۔ اب میں بھرے بازار کے عین درمیان سینہ تان کے چلنے لگا تھا اور اِس تلاش میں رہتا کہ کوئی گرنے لگے تو اُسے اپنے ہاتھوں میں تھام لوں۔

میں یہ بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ مجھ میں یہ اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ اس سے پہلے میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا تھا۔ آج کوئی بیس برس بعد میں نے اپنی الماری میں سے پڑھنے کے لیے ایک کتاب نکالی۔ اُسے جب کھولا، تو صفحوں کے درمیان نصیرے تیلی کے دیے ہوئے موتیا ہار کے مرجھائے ہوئے پھول ملے ہیں۔ یہ پھول دیکھ کر مجھ پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔

مجھے یوں لگا کہ میرا ماضی ان پھولوں کی طرح مرجھا کر خشک ہو گیا ہے اور وہ پھول جن کے رنگوں اور خوشبو نے مجھے تازگی بخشی تھی، وقت کی کڑی دھوپ میں جل گئے ہیں۔ ان کی زرد خوشبو میرے اردگرد پھیل گئی ہے اور میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ ایک مدت کے بعد میں پھر اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کر رہا ہوں، اتنا کمزور کہ شاید کوئی دیوا بھی مجھے سہارا نہ دے سکے۔

◆◆◆

روشن ضمیر، مردِ مومن

جسٹس (ر) سید افضل حیدر

علامہ محمد اقبالؒ

پروردگارِ عالم نے عہدِ الست کے روز تمام مخلوقات کو اپنے سامنے حاضر کر کے ایک سوال پوچھا:

کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے یک زباں اقرار کیا:

''ہاں! کیوں نہیں۔''

اس روز اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم الشان منصوبے کے تحت تمام انسانوں کے لیے یہ اَمر طے کر دیا کہ وہ کس انسان کو کب، کہاں اور کتنے وقت کے لیے دنیا میں بھیجے گا۔ اس منصوبے میں انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ یہاں اس کی حیثیت مجبورِ محض کی سی ہے۔ اس منصوبے کے تحت ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں جب مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ مسلم معاشرہ ہر پہلو سے نکبت اور افلاس کی گہرائیوں میں اُتر گیا تو اللہ کی مرضی، مسلمانانِ برصغیر کی بیداری اور راہ نمائی کے لیے سرسید احمد خاں، سید امیر علی، علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح جیسے نابغوں نے اسی مٹی سے جنم لیا۔

برطانوی دور میں اِسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے سید امیر علی، سرسید احمد خاں اور بعدازاں سر ڈاکٹر محمد اقبال کا فکری کام انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستان کا قابلِ ذکر باب ہے۔ یہ افراد بلاشبہ اپنے وقت کے اہلِ بصیرت تھے جنھوں نے نہ صرف اپنے عہد کے معاملات کو سمجھا بلکہ ان کا تجزیہ کر کے حل بھی پیش کیا۔

علامہ محمد اقبالؒ ایسی ہی ایک ہستی ہیں جنھیں اپنے عہد کے مسلمانوں کے مسائل کا نہ صرف ادراک تھا بلکہ وہ ماضی اور حال کا جائزہ لے کر مستقبل کی راہ بھی دکھاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی بطور شاعر اور نظریاتی شاعرِ عظمت مسلم ہے۔ انھوں نے اپنے پیغام کا مخاطب مسلم نوجوان کو بنایا۔ بالِ جبریل میں مسلمانوں کے فکری زوال کا نوحہ کہتے ہوئے اقبالؒ گویا ہوئے:

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی

لیکن میرے نزدیک اقبالؒ کی فکر کے نثری مجموعہ کی اہمیت بھی کم نہیں۔ اگرچہ اس طرف دھیان کم دیا گیا ہے۔ حکومت کو تعلیمی نصاب میں اقبال کا نثری مجموعہ شامل کرنا چاہیے تاکہ اقبال شناسی تشنہ نہ رہے اور اس عمل میں ہم زندگی کا سراغ حاصل کرسکیں۔

اقبال کے نثری کام میں ان کی کتاب..... Reconstruction of Religious Thoughts in Islam'' اور ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''The Development of Metaphysics in Persia، کے علاوہ کتاب الاقتصاد، مختلف مواقع پر دیے گئے خطبات، مقالات، اخبارات میں شائع شدہ مضامین، تقاریر اور افکار شامل ہیں جو بعض محققین کی کوشش سے شائع تو ہو چکے لیکن ابھی عوام تک پہنچانے کا بہت سا کام باقی ہے۔

علامہ اقبالؒ کو اپنے عہد میں جنگِ عظیم کی ہولناکیاں، بلقان کے حصے بخرے، برطانوی سازش کے تحت اسرائیل کا قیام، خلافت کا ترکی میں خاتمہ، ہندوستان میں تحریکِ خلافت کی ناکامی کے علاوہ ہندوستان پر برطانوی تسلط کا جبر بھی محسوس ہوا۔ جمہوریت، سوشلزم، قومیت، وطن پرستی، مغربی فکر اور بدلتی دنیا کے اسباب و محرکات اور نتائج پر بھرپور تبصرہ کیا اور غور وفکر کے بعد راہ نمائی بھی کی۔

اقبالؒ صحیح معنوں میں ایک نابغۂ عصر مفکر تھے۔ انھوں نے ماضی اور حال کا تجزیہ کر کے اہلِ عالم کو آنے والے دنوں کی تصویر بھی دکھائی۔ ایران میں ملوکیت کا ایک عالم دین کے ہاتھوں اختتام اور افیمی چینیوں کے بیدار ہونے کی پیش گوئی سب سے پہلے اقبالؒ نے ہی کی تھی۔

اقبالؒ کی نظم اور نثر کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے جب بیرونی دنیا (خارجی کیفیت) ان کی داخلی کیفیت سے ٹکرائی تو وہ خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے اس پر واضح اور دوٹوک ردِعمل دیا۔ اقبالؒ نے غلامی، غفلت، بے عملی، مادہ پرستی، منافقت اور ہوا و ہوس کے خلاف بھرپور احتجاج کرتے ہوئے ہمیں یہ درس دیا کہ دنیا کی منفی قوتوں کے خلاف اُٹھنا بہت ضروری ہے۔ اقبالؒ شرار بولہبی سے چراغ مصطفوی کا ٹکرانا بہت ضروری تصور کرتے ہیں۔ اسی موقع پر اقبالؒ کہتے ہیں کہ انھوں نے حسینؓ کے کردار سے رمزِ قرآن سیکھی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے نثری مجموعہ میں آپؒ کے مختلف شخصیات کو لکھے جانے والے خطوط میری نظر میں بہت اہم ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے ہم مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک علیحدہ وطن کے حصول کے ان محرکات کو سمجھ سکتے ہیں جو علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھے۔ اس کے علاوہ ان میں دین و دنیا، علم الکلام، شرعی اور فلسفیانہ مسائل پر بھی علامہؒ کا نکتۂ نظر سامنے آتا ہے۔

مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک علامہ اقبالؒ نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام تیرہ خطوط لکھے۔ ان خطوط کا موضوع تحریک آزادی اور مسلمانوں کے مطالبات تھا۔ ان خطوط کی سیاسی، آئینی، قانونی اور فکری حیثیت قابل غور ہے۔

جب آل انڈین نیشنل کنونشن کے اجلاس میں پنڈت نہرو نے کہا کہ دو قومی نظریہ بے حقیقت ہے اور ہندوستان میں متحدہ قومیت ہے۔ مسلمانوں کا مسئلہ اقتصادی ہے۔ انھیں نوکریاں درکار ہیں۔ اس موقع پر علامہ اقبالؒ نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء کو قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ پنڈت نہرو کو اس بات کا مناسب جواب دینا چاہیے۔ اس خط کا مطالعہ ہمیں مسلم برصغیر کے کئی اہم آئینی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں سے روشناس کرواتا ہے۔

آپ نے لکھا کہ ۱۹۳۵ء کا آئین خرابیوں کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی تنظیم سازی کر کے کئی گروہوں میں بٹنے کے بجائے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوسکیں۔ مسلمان ہندوستان کی دیگر ترقی پسند جماعتوں سے اتحاد ضرور کریں لیکن اس حقیقت کو فراموش

نہ کریں کہ ایشیا میں اخلاقی و سیاسی قوت کے طور پر اسلام کے مستقبل کا انحصار برّصغیر کے مسلمانوں کی تنظیم پر ہے تاکہ اسلام کو عملی شکل میں نافذ کیا جاسکے۔ مسلمانوں کا کنونشن منعقد کر کے ملک کے اندر اور باہر یہ پیغام دیا جائے کہ مسلمانوں کا مسئلہ معاشی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے تہذیبی مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ہندوؤں پر واضح ہونا چاہیے کہ ان کی سیاسی چالیں ہندی مسلمانوں کو تہذیبی تشخص سے بیگانہ نہیں کرسکتیں۔

قائداعظمؒ کے نام دوسرا اہم خط ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کا ہے۔ اس میں علامہؒ نے قائداعظمؒ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

''آپؒ نے سوال اُٹھایا کہ مسلمانوں کی افلاس سے نجات کیونکر ممکن ہو؟ میرے نزدیک اسلامی قوانین کے نفاذ میں اس کا حل موجود ہے۔ اگر شریعت کے احکام کو صحیح طور پر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کی معمول کی معاشی ضروریات پوری ہوسکتی ہیں لیکن ایسا ہونا ایک آزاد مسلم ریاست کے بغیر ممکن نہیں۔''

علامہؒ نے مزید یہ لکھا: ''اگر سوشل ڈیموکریسی کے تصور کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو اسے شریعت کی تائید حاصل ہوسکتی ہے۔ اس طرح کوئی انقلاب نہ ہوگا بلکہ ہم اسلام کی تعلیمات کی طرف رجوع کریں گے۔''

خط کے آخر میں علامہؒ نے سوال اُٹھایا کہ کیا اب وقت نہیں آچکا کہ ہندوستان میں ایک سے زیادہ مسلم ریاستیں قائم ہوں جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں۔ اقبالؒ نے قائداعظمؒ سے کہا کہ آپ کی طرف سے یہ مطالبہ پنڈت نہرو کے بیان کا بہترین جواب ہوگا۔

علامہ اقبالؒ اتحادِ اُمت کے بہت بڑے داعی تھے۔ موتمر عالم اسلامی بیت المقدس میں اپنے خطبہ میں انھوں نے کہا کہ ہم حضور ﷺ کے اُمتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر ہم آنحضرت ﷺ کے عطا کردہ نُور کو اپنے اندر جذب کر لیں تو حضور ﷺ ہم پر فخر کرسکیں گے۔

اپنے بیانات پر مشتمل کتاب ''معرکہ دین ووطن'' میں علامہ اقبالؒ قومیت کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت عرب ایک قوم تھے اور اگر وطنیت کا جذبہ اہم ہوتا تو آپ ﷺ کے رشتے دار آپ ﷺ کے مخالف نہ ہوتے۔

آپ ﷺ نے قومیت کی بنیاد پر اپنے سگے چچا ابولہب اور قریبی رشتے دار ابوجہل کی دل جوئی نہ کی اور انھیں اپنے ساتھ نہ رکھا اور نا ہی عربوں کے معاملات میں ان سے مشورہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بعثت کے بعد رسالت کا دور شروع ہوا تو قوم کے بجائے اُمتِ مسلمہ کا تصور اُبھرا اور اس طرح قومیت کا تصور ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ علامہؒ نے یہ دلیل بھی دی کہ سیدنا ابراہیمؑ نے وطن اور قوم کے تصور کو بالائے طاق رکھ کر نوعِ انسانی کی صرف ایک تقسیم کی، موحد یا مشرک، تیسری کوئی ملت نہیں۔

علامہؒ مزید فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ اگر قومیت کو اہمیت دیتے تو آپ ﷺ کے لیے آسان تھا کہ اپنے رشتہ داروں سے کہتے کہ وہ بے شک اپنے دین پر قائم رہیں اور لیکن میرے ساتھ مل کر وحدت عربیہ قائم کریں لیکن آنحضرت ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ علامہؒ نے فرمایا کہ اُمت مسلمہ کا خطاب حاصل ہوجانے کے بعد ایسی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی کہ ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ عربی، ایرانی، افغانی یا ہندی قومیت میں جذب ہوجائے۔ اُمت مسلمہ کے مقابلے میں صرف کفر ہی ملت ہے۔ تحریکِ پاکستان کے محرکات سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بصیرت افروز ہے۔ ان مضامین کو ہمارے نصاب کا حصہ بنانا چاہیے تاکہ ہماری نسل معلوم ہوسکے کہ قوم پرستی کے مغربی تصور نے جنگ عظیم اوّل کے بعد کس طرح مشرق وسطیٰ کا نقشہ بدل کر مسلمانوں کی وحدت کو عرب طالع آزماؤں کے ذریعے پارہ پارہ کر دیا اور اب یہی زہر ہمیں پاکستان میں صوبائی عصبیت کے شکل میں نظر آرہا ہے۔ ◆◆◆

کشمیر کی ماؤں کا درخشندہ کردار نہ صرف زمانے کی آنکھ سے اوجھل رہا بلکہ ہماری قومی بے حسی اور حکومتی بے اعتنائی کی وجہ سے منظر عام پر نہ آ سکا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آغوشِ مادر سے اُٹھنے والا انقلاب کبھی تھک کر نہیں رُکتا یہی

شمعیں ہیں فروزاں!

تحریکِ آزادی میں عزم و ہمت کی پیکر یہ مائیں، بہنیں، بیٹیاں

بیگم تنویر لطیف (تمغۂ امتیاز)

وجہ ہے کہ کشمیر کی تحریکِ مزاحمت اب عالمی سطح پر سندِ اعتراف حاصل کر رہی ہے جسے کشمیر کی نازک اندام عورت کے آہنی کردار نے نشانِ منزل بنا دیا ہے۔ کشمیری خواتین کا کردار تاریخ کے ہر دور میں بے مثال رہا ہے۔ اس خطۂ گل پوش کی جن فضاؤں کو حبہ خاتون اور للہ عارفہ (لل دید) نے اپنے محبت بھرے نغموں، معراجِ تصوف اور عظمتِ کردار کی داستانوں سے مزین ہوا کی تازگی بخشی، انھی فضاؤں میں آزادیٔ وطن کے نعروں کی گونج میں کشمیری خواتین کے عزم و حوصلے اور صبر و استقامت نے ہر دور کے غاصب اور ظالم سامراج کو شرمسار اور سرنگوں کیا۔

16 مارچ 1846ء کو انگریزوں نے پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کی شکست کے بعد پوری ریاست جموں و کشمیر والیٔ جموں گلاب سنگھ ڈوگرہ کو ساتھ بطور تاوان 75 لاکھ نانک شاہی سکوں کے عوض فروخت کر دی۔ 14 جولائی 1846ء کو اس نے کشمیر پر قبضہ

حاصل کرنے کے لیے ڈوگرہ فوج سری نگر روانہ کی۔ اس وقت گورنر کشمیر شیخ امام دین تھا جس کے ساتھ ایک تحریری معاہدے کے ذریعے عہد نامہ امرتسر پر عملدرآمد اور کشمیر کا مکمل قبضہ مقصود تھا۔ گورنر کشمیر کی بیوی وکیلاں بی بی ضلع مظفر آباد کے موضع چکار کے راجگان سے تھی۔ یہ بے حد دلیر، زیرک، معاملہ فہم اور جہاندیدہ خاتون تھی۔ لیفٹیننٹ ایڈورڈ نے اس کے لیے سفارتکار اور دلیر حرم (Politician) اور جہاندیدہ خاتون کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

کشمیر کی اس خاتونِ اوّل کا کشمیر کے فوجی لشکر اور افسران میں بے پناہ اثر ورسوخ تھا۔ اس نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لے کر اعلیٰ فوجی افسران کو دلائل سے قائل کر لیا کہ ڈوگروں کو کاغذی کارروائی کے ذریعہ کشمیر کا قبضہ دے کر غلامی قبول کرنے کے بجائے فوجی حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے مزاحمت کو اس وقت تک طول دیا جائے جب چند ماہ کے اندر کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں پر شدید برف باری کے طوفان کی صورت میں تمام راستے مسدود ہو جائیں گے اور درہ بانہال بند ہونے کے بعد ایک بھی غاصب واپس زندہ نہ جا سکے گا۔ چنانچہ اس حکمت عملی کے تحت مائی صمہ کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ڈوگرہ وزیر لکھپت مارا گیا اور فوج کے سپہ سالار رنتوں نے تخت سلیمان کی پہاڑی میں بھاگ کر پناہ لی۔

وکیلاں بی بی کی جرأت مندانہ مشاورت نے کشمیری قوم اور فوج کو یہ باور کرا دیا تھا کہ اگر آج قوم نے آزادی اور غیرت کا یہ پُرفریب اور شرمناک سودا قبول کر لیا تو پھر صدیاں اپنی بے وقعتی اور غلامی پر ماتم کرتی رہیں گی لیکن افسوس کہ گورنر کشمیر شیخ امام دین اپنی بہادر اور معاملہ فہم بیوی کے جرأت مندانہ مشورے پر فوری عمل نہ کر سکا اور ہاتھ سے پھسلنے والے قیمتی لمحات کو مذاکرات میں الجھا دیا۔ ملک محمد خان ٹوانہ کو سازش کے لیے کشمیر بھیجا گیا تاکہ حکومت کشمیر اور عسکری حکام کے درمیان پھوٹ ڈلوائی جا سکے۔ نتیجتاً دشمن کو بساطِ سیاست پر نئی طرح ڈالنے کے لیے وقت مل گیا۔

ان نام نہاد مذاکرات کے دوران کشمیر کی ہر دلعزیز اور طاقتور خاتونِ اوّل وکیلاں بی بی کو ایک کمرے میں مقفل کر دیا گیا۔ شیخ امام دین ایک خفیہ معاہدے کے تحت کشمیر میں ڈوگرہ راج کا نفاذ تسلیم کر کے اپنے ساز وسامان سمیت بظاہر بڑی عزت کے ساتھ لاہور منتقل ہو گیا اور کشمیری لشکر فتح مند ہو کر بھی نئے حاکموں کے قانون کے تابع ہو گیا۔

کشمیر کی کہانی یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ سقوطِ ڈھاکا سے لے کر سقوطِ سری نگر تک ایک ہی تمثیل چل رہی ہے۔ صدیوں سے کشمیر کی مائیں اپنے برہان وانی میدان میں اُتار رہیں اور بہنیں، بیٹیاں شیخ عبداللہ کے بوئے ہوئے کانٹے ہاتھوں سے چن رہی ہیں۔ زندہ قومیں احساس زیاں کی تپش سے چراغ اُمید روشن کرتی ہیں اور غلامی کے دور میں آزادی کے احساس کا لگایا ہوا بیج اپنی جڑیں بناتا رہتا ہے۔ چنانچہ وکیلاں بی بی نے جو پیغام دیا تھا وہ کشمیری خواتین میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔

خواتین پونچھ کا المیہ: وادی کے عوام گلاب سنگھ کے بہیمانہ طرزِ حکمرانی سے بخوبی واقف تھے۔ 1836ء میں پونچھ کے لوگوں نے مداخلت فی الدین ٹیکسوں کی بھرمار اور مالیہ کی من مانی جبری وصولی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور سردار شمس خان کی کمان میں پونچھ کے مجاہدین نے متعدد قلعے فتح کر کے ڈوگرہ فوج میں تباہی مچا دی۔ پونچھ کی خواتین اس بغاوت میں مجاہدین کی دوسری دفاعی لائن کی طرح مدد کر رہی تھیں۔ گلاب سنگھ نے خود راولاکوٹ پہنچ کر ڈوگرہ فوج کو عوام کے قتل عام کا حکم دیا۔ ڈوگروں نے انتہائی مکاری اور عیاری سے گھس کر دونوں شیروں کا شکار کیا۔ سردار شمس خان کو ان کے بھتیجے راج ولی اور دوست سبز علی سمیت گرفتار کر کے تیرہ سرکردہ جانبازوں کی زندہ کھالیں کھنچوائیں اور ان کے سر کاٹ کر پنجروں میں بند کر کے درختوں کے ساتھ لٹکا دیے۔ ڈوگرہ

فوجیوں نے گھروں کے اندر گھس کر عورتوں اور بچوں کو بے دردی سے مار پیٹ کر باہر نکالا اور جانوروں کی طرح پلندری کیمپ میں بند کر دیا۔ انگریز مصنف (Mr. Smith) کے مطابق دو ہفتوں میں پانچ ہزار عورتیں اور بچے پیاس اور دم گھٹنے سے شہید ہوئے۔ سات سو قیدی عورتیں اور بچے گھڑسوار فوج کی نگرانی میں پیدل جموں جاتے ہوئے شہید ہوئے اور جو نو سو مظلوم خواتین زندہ جموں پہنچ سکیں ان کا حشر اس سے بھی المناک ہوا۔ عفت مآب خواتین کی اتنی بڑی تعداد بھیڑ بکریوں کی طرح روندی گئی۔

کشمیری خاتونِ اوّل وکیلاں بی بی کے تمام خدشات سو فیصد درست ثابت ہوئے۔ ڈوگروں نے اپنے عہد حکومت میں اہلِ کشمیر کے ساتھ وہی سلوک کیا جو زمانہ جاہلیت میں خریدے گئے غلاموں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ 75 لاکھ نانک شاہی سکوں کے عوض خریدا گیا کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے بقول فی کشمیری اڑھائی روپے میں معہ زمین و مکان کے فروخت ہوا۔ یہ رقم معہ سود وصول کرنے کے لیے اس نے انتہائی بے ہودہ قسم کے ٹیکسوں کی صورت میں کشمیریوں کی ہڈیاں نچوڑ لیں۔ نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔ بالآخر 1931ء میں خطبۂ عید پر پابندی اور قرآن پاک کی توہین کے واقعات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور کشمیر میں علمِ بغاوت بلند کر دیا گیا۔

مجاہد عبدالقدیر خان کے مقدمۂ بغاوت کی پیشی کے موقع پر سنٹرل جیل سرینگر کے باہر عوام کا ہجوم جمع ہو گیا۔ اس پر پولیس نے گولی چلا دی اور 22 مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس واقعہ کے بعد حالات بے قابو ہو گئے۔ مردوں سے جیلیں بھر گئیں اور خواتین لاکھوں کی تعداد میں احتجاج کے لیے باہر نکل آئیں اور سارے محاذ سنبھال لیے۔ لاکھوں کی تعداد میں خواتین کا جلوس نکلتا تو بھاری تعداد بچوں کی بھی ساتھ ہوتی۔ ان جلوسوں پر ڈوگرہ پولیس نے بے پناہ گولیاں چلائیں اور بے شمار خواتین نے جامِ شہادت نوش کیا۔

پاکستان کا قیام اور جموں کا المناک سانحہ: 14 اگست 1947ء کو پوری ریاست جموں و کشمیر میں پاکستان کے سبز ہلالی پرچم گھروں کی چھتوں پر بہار کی پریوں کی طرح محوِ رقص تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو فرطِ جذبات سے گلے مل کر مبارکبادیں دے رہے تھے۔ خواتین نے اپنے ڈوپٹے سبز رنگ میں ڈبو کر گوٹے کے چاند ستارے سے پرچم بنا لیے تھے لیکن رات بارہ بجے جب اعلانِ قیامِ پاکستان ہوا تو اس میں ریاست جموں و کشمیر کا نام نہیں تھا۔ اس واضح بے انصافی پر پوری ریاست میں فسادات پھوٹ پڑے۔

جموں، آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کا گڑھ تھا۔ اس کے قائد ممتاز قانون دان اور وکیل رئیس الاحرار چودھری غلام عباس خان تھے۔ جبکہ وادیٔ کشمیر میں شیخ عبداللہ نے پنڈت نہرو کے دباؤ اور کچھ کٹر قسم کے ہندو کانگرسیوں کو خوش کرنے کے لیے مسلم کانفرنس توڑ کر کانگرس کے چربے کے طور پر نیشنل کانفرنس بنالی جس نے پیر پنجال کے دونوں طرف ریاست کے 80% مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دشمن کو صوبہ جموں اور وادیٔ کشمیر باری باری صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جموں شہر میں بیگم چودھری غلام عباس، چودھری حمید اللہ اور دیگر قائدین کی گرفتاری کے بعد ان کی بیگمات نے خواتین کو منظم کر کے مدافعانہ سرگرمیوں کی تربیت اور اسلحہ کے استعمال کی ٹریننگ کا محاذ بھی کھول دیا۔ چنانچہ مہاسبھائی غنڈوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے جتھوں نے ان خواتین کے گھروں کو نشان زد کر دیا اور منظم ہو کر مسلمانوں کے محلّوں پر دھاوا بول دیا اور لوٹ مار، لڑکیوں کا اغواء اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ مردوں کی غالب اکثریت جیلوں میں تھی لیکن خواتین کی طرف سے دشمن کو حیرت انگیز مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران المناک واقعات رونما ہوئے۔ مسلم کانفرنس کے پُرجوش کارکن عبداللہ کی چار بیٹیاں تھیں۔ جب آر ایس ایس کے

غنڈوں نے اس کا دروازہ توڑنا شروع کیا تو لڑکیوں کی التجا پر اس نے خود اپنے ہاتھ سے تین نوجوان بیٹیوں کو شہید کیا اور ان کے خون سے گھر کی دیواروں پر 'پاکستان زندہ باد' لکھا اور سب سے چھوٹی بیٹی کو مردانہ لباس پہنا کر کھڑکی سے کود گیا۔

اس قسم کے واقعات کے بعد دشمن نے ایک خطرناک چال چلی اور صلح کا چکمہ دے کر جموں کی گلیوں اور محلوں میں یہ اعلان کروایا گیا کہ آپ سب کو بحفاظت پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ عورتوں اور بچوں سے ناخن کٹر اور بوڑھوں سے چھڑیاں تک چھین لی گئیں اور نوجوان مردوں کو ریلوے اسٹیشن پر اہل خانہ سے الگ کر دیا گیا۔ بعد ازاں ان سب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریائے توی کے کنارے تہ تیغ کیا گیا۔

5 اور 6 نومبر کو جب یہ گاڑیاں جسنا روڈ اور مہوہ کے مقام پر پہنچیں تو اچانک انھیں روک کر آر ایس ایس کے غنڈوں نے حملہ کر دیا، ہر طرف سکوتِ مرگ طاری تھا۔ جنگل سے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں ایسے گونج رہی تھیں جیسے لکڑیاں کاٹی جا رہی ہوں۔ اس قتل عام میں جموں کے ڈھائی لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ ہزاروں نوجوان لڑکیاں اغواء کر لی گئیں اور جنگل میں معصوم بچوں کے ٹکڑے ہوا میں اُڑا دیے گئے۔

بیگم چودھری غلام عباس کی داستان غم: چودھری غلام عباس جموں کے چوٹی کے وکیل اور مسلم کانفرنس کے بانی صدر تھے۔ ان کی گرفتاری کے بعد بیگم صاحبہ نے قیادت کے فرائض سنبھال لیے تھے اور ان گھر خواتین کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ حکومت نے ان کی تمام جائیداد ضبط کر کے بیگم صاحبہ اور بچوں کو گھر سے باہر نکال دیا اور مکان سیل کر دیا گیا بیگم صاحبہ نے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ڈی سی آفس کی سیڑھیوں کے نیچے ٹاٹ ڈال کر بچوں کے ہمراہ پناہ لی۔ جب لاؤڈ سپیکر پر مسلمانوں کو سیالکوٹ پہنچانے کا اعلان ہوا تو سب سے پہلے انھوں نے پاکستان پہنچنے کی تیاری پکڑ لی اور بے سروسامانی کے عالم میں بچوں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئیں۔

مہوہ کے مقام پر آر ایس ایس کے غنڈوں نے قتلِ عام کا حشر برپا کیا تو زخمی بچوں نے لاشوں کے نیچے چھپ کر جان بچائی لیکن ان کی بڑی بیٹی کو اغواء کر لیا گیا جو بعد ازاں خواتین کے تبادلہ میں چار بچوں اور شوہر سمیت پاکستان آئیں۔ شوہر نے اسلام قبول کر لیا اور لندن میں سکونت اختیار کر لی۔

چودھری غلام عباس جنہیں حضرت قائداعظمؒ نے رئیس الاحرار کا خطاب دیا تھا عمر بھر حکومت کا کوئی عہدہ لینے سے گریزاں رہے اور انتہائی سادگی اور خاموشی کے ساتھ راولپنڈی میں شاہراہِ کشمیر کے کنارے دفن ہو گئے۔

بیگم چودھری حمید اللہ کا المیہ: چودھری حمید اللہ جموں کے ممتاز وکیل اور مسلم کانفرنس کے روح رواں تھے۔ 19 جولائی 1947ء کو چودھری غلام عباس کی گرفتاری کے بعد سردار محمد ابراہیم کے گھر مجاہد منزل سرینگر میں مسلم کانفرنس کا چوٹی کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت چودھری حمید اللہ نے کی۔ اس اجلاس میں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد منظور کی گئی جو کانگریسی لیڈروں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ چودھری حمید اللہ کو گرفتار کر کے سیالکوٹ کے ایک ریسٹ ہاؤس میں قید کر دیا گیا۔ ان کی عدم موجودگی میں بیگم حمید اللہ نے خواتین کا محاذ سنبھال لیا اور جموں کی خواتین کو منظم کرنے میں دن رات ایک کیا۔ ان کے لیے عسکری اور مزاحمتی تربیت کا بھی اہتمام کیا۔ ان کا گھر مسلم کانفرنس کی خواتین کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس وجہ سے آر ایس ایس کے غنڈوں نے ان کے گھر پر سرخ کراس کا نشان لگا دیا۔ خطرے کو بھانپتے ہوئے انھوں نے بچوں کے ہمراہ سیالکوٹ کے لیے روانہ ہونے والے قافلے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

5 نومبر کی شام مہوہ کے مقام پر قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ ان کے سامنے ان کے دو پھول سے بیٹوں کو پتھر پر لٹا کر ذبح

کیا گیا۔ سہمی ہوئی بارہ سالہ بیٹی جو ماں کے آنچل میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی گھسیٹ کر دُور لے گئے اور پھر اس کا سراغ نہ مل سکا۔ گود کے بچے شاہد حمید کو پتھر پر لٹایا ہی تھا کہ قاتلوں کی نظر ہاتھ میں چمکتی ہوئی انگوٹھی پر پڑی۔ ظالموں نے انگلی کاٹ کر انگوٹھی ہتھیائی اور تلاشی لینے لگے۔ بیگم حمید اللہ نے کٹا ہوا ہاتھ جیب میں ڈال کر پوٹلی ان کی طرف پھینکی اور چیتے کی سی تیزی کے ساتھ پتھر سے اُٹھا کر برق رفتاری سے دریائے توی میں کود گئیں۔ دن بھر گدلے پانی میں آہستہ آہستہ سر کرنے کے بعد رات کو چھپ چھپا کر چلتیں۔ اس طرح صوبۂ جموں کے گورنر اور ممتاز شاعر چودھری خوشی محمد ناظر کی بہو، کمشنر جموں کی بھابھی اور کشمیر کے ممتاز سیاستدان اور کہنہ مشق قانون دان چودھری حمید اللہ کی شریکِ حیات مہوہ کے مقتل سے سیالکوٹ تک 40 میل کا سفر ننگے پاؤں طے کر کے اس حال میں لٹے پٹے وجود کے ساتھ پاک سرزمین کی سرحد پر سجدہ ریز ہوئیں کہ آنکھیں بیٹی کی جدائی کے غم میں پتھرائی ہوئی، جھولی خالی اور خرمن تار تار تھا۔ کئی برسوں کی خاک چھاننے کے بعد بیٹی اغواء شدہ خواتین کے تبادلے میں آئی بھی تو ماں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

محترمہ پروفیسر عظمت یزدانی کا ناقابل فراموش کردار:

محترمہ عظمت یزدانی کا وجود مصیبت زدہ مغوی مسلمان بچیوں اور بزرگ خواتین کے لیے فرشتۂ رحمت سے کم نہ تھا۔ وہ 6 نومبر 1947ء کے قافلے میں اپنے والدین اور دو بہنوں خورشیدہ اور رحمت بی بی کے ساتھ پاکستان آنے کے لیے روانہ ہوئیں جبکہ 5 نومبر کے قافلے کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا۔ اچانک ان کی گاڑیاں وشنا روڈ پر روک لی گئیں اور بچوں کے قتل عام اور عورتوں کے اغوا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یہ ایک ہولناک منظر تھا۔ آپا جی عظمت نے کسی طرح چھپ کر اپنی جان اور آبرو بچائی۔ رات کی سیاہی پھیل گئی تو انھیں اپنی بہن رحمت بی بی کی گمشدگی کا علم ہوا۔ رات بھر کی آبلہ پائی کے بعد صبح طلوع ہوئی تو انھوں نے اپنا سفر پاکستان کے بجائے واپس جموں کی طرف شروع کر لیا۔ وہ دن رات ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے تعاقب اور گمشدہ لڑکیوں کی تلاش میں پیدل چلتی رہیں۔ راستے میں اُدھ جلے بچوں کے جسم اور دلہنوں کی برہنہ لاشیں دیکھ کر اپنی پیاری بہن کی تلاش ثانوی حیثیت اختیار کر گئی اور ملت کی آبرو کا تحفظ اور قوم کی بیٹیوں کی بازیابی ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔

بھوک، پیاس اور تھکاوٹ سے چُور یہ غیرت مند اور بہادر خاتون برس ہا برس فوجی کیمپوں اور بعض گھروں کے خفیہ ٹھکانوں تک پہنچتی اغوا شدہ لڑکیوں کو دشمنوں سے چھین کر محفوظ کیمپوں میں پہنچاتی رہیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے غدّاری کے عوض ریاست کی سسکتی ہوئی حکومت سنبھال لی تھی۔ جب محترمہ عظمت یزدانی کی کارروائیوں کی شہرت حکومتی ایوانوں تک پہنچی تو کشمیر کی اس وقت کی سیکولر حکومت نے نیشنل گارڈز کے کچھ سپاہی، چند ایک مسلح رضا کار، ایک جیپ اور ایک ٹرک آپا جی عظمت کے حوالے کیے جو ذاتی معلومات اور مختلف طریقوں سے مخبری کر کے اغوا شدہ لڑکیوں کا سراغ لگا رہی تھیں۔ یہ پرعزم اور دردمند خاتون شیرنی کی طرح 6 نومبر 1947ء سے جولائی 1950ء تک مسلسل جموں کی اغواء شدہ مسلمان خواتین کی برآمدگی کا کام کرتی رہیں۔ انھوں نے 1500 خواتین کے آخری قافلے کے ساتھ، جو 46 بسوں پر مشتمل تھا، شیخ عبداللہ کے پرنسپل سیکرٹری پنڈت رانا صاحب اور انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر بھاکھڑی کی نگرانی میں پاکستان کی سرحد اس حالت میں عبور کی کہ پاؤں سوجے ہوئے، جسم زخموں سے چُور، آنکھوں میں بے خوابی کے سنّاٹے اور ذہن چنگیزی دور کے مناظر سے سُن تھا۔ ان کے اپنے پرائے سب بچھڑ چکے تھے۔ ہزاروں خواتین کو سینے سے لگا کر پاکستان پہنچانے کے باوجود وہ تنہا تھیں۔

انھوں نے 1953ء تک مہاجر کیمپوں میں رہ کر دن رات زخمیوں اور لٹے پٹے مہاجرین کی خدمت کی۔ اس دوران ایک کیمپ میں انھیں اپنے والدین اور چھوٹی بہن بھی مل گئیں۔ بعدازاں رحمت بی بی بھی خواتین کے تبادلہ میں ان سے آن ملیں جو شادی کے مختصر سے عرصے کے بعد اپنی اکلوتی بچی آپا عظمت کے حوالے کر کے دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ پروفیسر عظمت یزدانی نے آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد میں بڑی بھرپور زندگی گزاری اور بحیثیت پرنسپل گرلز کالج مظفر آباد سے ریٹائر ہوئیں۔ عمر بھر وہ کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے نام پر جتی رہیں۔

پاکستان کے عشق میں صوبۂ جموں کے ڈھائی لاکھ مسلمانوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ یہ عشق آپا جی کی رگ رگ میں رواں تھا۔ وزیراعظم پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے بعد نواز شریف کی (قرض اُتارو ملک سنوارو) مہم شروع ہوئی تو میں اپنی حقیر پونجی کے ساتھ نیشنل بینک شہید چوک میں گئی۔ وہاں آپا جی عظمت پہلے سے موجود تھیں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کو چند دن ہوئے تھے اور وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھیں۔ پیسے جمع کرانے والے لوگوں کی تعداد خاصی طویل تھی۔ میں بھی آپا جی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بینک منیجر آپا جی کو دیکھ کر احتراماً ان کے پاس آیا اور پوچھا، ''آپا جی آپ بھی 'قرض اُتارو ملک سنوارو مہم' کے لیے آئی ہیں؟'' انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ہم ہمیں کاؤنٹر پر لے گئے۔ جب آپا جی نے چیک کاؤنٹر پر رکھا تو منیجر چیخ اُٹھا۔ ''آپا جی یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ ابھی کل ہی تو آپ کو عمر بھر کی پونجی، ریٹائرمنٹ کا چیک ملا تھا۔ آپ نے وہی چیک انڈورس کر دیا ہے۔ آپ بیمار بھی ہیں اور گھر بار، بال بچہ کچھ بھی تو آپ کے پاس نہیں۔ بہتر ہے آپ نیا چیک کاٹ کر اپنی آرزو پوری کر لیں۔'' آپا جی نے صرف اتنا کہا، ''بیٹا! میرا سب کچھ پاکستان ہی ہے۔ آج اللہ نے پاکستان کا سر اُونچا کر کے اسے مسلم دنیا کی پہچان بنایا ہے تو میں بھی مالا مال ہوں۔ تم چیک جمع کرو۔ رسید بعد میں لے لوں گی میں اب بہت تھک گئی ہوں۔ لیکن آپا جی کب تھکی تھیں وہ ہر مہینے سی ایم ایچ میں بیماروں کے لیے اپنا خون دے کر ہشاش بشاش رہتی تھیں۔ حکومت پاکستان اور حکومتِ آزاد کشمیر کے احوال آپا جی کی موت تک چلتے رہے۔ ہر 14 اگست کو پاکستان میں اور ہر 24 اکتوبر کو آزاد کشمیر میں تمغے تقسیم ہوتے رہے لیکن کسی تمغے پر پروفیسر عظمت یزدانی کا نام نہیں تھا۔

ام المجاہدین حسینن بی بی شہید رجمنٹل سنٹر 24:11720

اکتوبر 1947ء کو مجاہدین کی مسلح جدوجہد کے نتیجے میں پونچھ، مظفر آباد، باغ، کوٹلی اور میر پور کے پہاڑی علاقوں پر مشتمل آزاد ریاست جموں و کشمیر کا قیام عمل میں آیا لیکن اقوام متحدہ میں پنڈت نہرو کی جنگ بندی کی اپیل اور رائے شماری کے وعدہ پر شورش زدہ علاقے میں اقوام متحدہ کے مبصرین کی تعیناتی تک کئی ہفتوں تک سرحدی علاقوں کے ایک ایک انچ کے لیے جنگ جاری رہی جس میں کشمیر کی خواتین نے بھی برابر کا حصہ لیا۔ پونچھ کی آزادی کے لیے تھوراڑ کا محاذ انتہائی اہمیت کا حامل تھا اور آزادی اور غلامی کے درمیان چند ساعتوں کے فاصلے پر تھا۔ مجاہدین کے پاس اسلحہ تھا نہ راشن۔ 3 اے کے رجمنٹ کی مختصر سی نفری پرانی طرز کی رائفلوں کے ساتھ بھاری اسلحہ سے لیس کئی گنا زیادہ دشمن کے ساتھ تین دن سے پہاڑ کی چوٹی پر نبرد آزما تھی۔

مجاہدہ حسینن بی بی بیوہ تھی اور اپنی یتیم بیٹیوں کے ساتھ پہاڑی کے قریب ہی ایک کچے مکان میں رہتی تھی۔ جب محاذ کے حالات بہت خراب ہوئے تو اس نے ضد کر کے آزاد کشمیر ریگولر فورسز کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ بالآخر 3 اے کے رجمنٹ میں رجمنٹل نمبر 11720 کے تحت اسے باقاعدہ سپاہی کی حیثیت سے فوج میں شامل کر لیا گیا۔ 6 اور 7 اکتوبر کی درمیانی شب وائرلیس آپریٹر نے فوری امداد کے لیے زور

سے چلانا شروع کیا۔

مائی حسین بی بی جس کا کام مجاہدین کے لیے روٹیاں تیار کرنا تھا، فوراً وہاں پہنچی اور اپنی خدمات پیش کیں۔ ایک نوجوان نے اماں مجاہدہ کو محاذ کی نازک صورتحال سمجھاتے ہوئے بتایا کہ ہماری فوج محاصرے میں ہے اور سب لوگ تین دن سے بھوکے پیاسے بھی ہیں۔ میرے پاس اسلحہ گولہ بارود کی ایک پیٹی ہے لیکن میں وائرس لیس کی ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ مجاہدہ حسین بی بی ہر وقت سبز لباس زیب تن کیے رکھتی تھیں۔ اس نے اپنی بڑی سی چادر زمین پر بچھائی اور اس پر اسلحہ کی پیٹی اور روٹیوں کی گٹھڑی باندھ کر نوجوان سے کہا کہ یہ گٹھڑی میرے سر پر رکھ دو۔ اماں مجاہدہ کی عمر اور دھان پان سے سراپے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے جوان نے ان کے حکم کی تعمیل کی کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اماں مجاہدہ اس بوجھ کو اُٹھائے چوٹی پر چڑھتی گئی۔ دشمن کی گولیاں اس کے جسم کو چھیدتی رہیں اور خون کی پھوار میں وہ آگے بڑھتی رہی۔ چوٹی کے قریب پہنچ کر اس نے خون کے آخری قطرے کی طاقت سے گٹھڑی مورچے کی طرف لڑھکا دی جو اللہ کی مشیت سے سیدھی نشانے پر لگی۔ مجاہدین نے اسلحہ کھول کر چاروں طرف پھیل کر فائر کھول دیا۔ دشمن کا منظم لشکر بھوکے پیاسے تھکے ہوئے مجاہدین کو تازہ کمک پہنچنے کی غلط فہمی میں حواس باختہ ہو گیا اور 100 لاشیں چھوڑ کر راولاکوٹ اور قرب و جوار کا سارا علاقہ چھوڑ کر پسپا ہو گیا۔ ام مجاہدہ حسین بی بی نے فتح کی خوشخبری سنی اور الحمدللہ کہہ کر کلمہ طیبہ پڑھتی ہوئی شہادت کے درجہ اولیٰ پر فائز ہو گئی۔ دراصل وہی فاتح تھوراڑ تھی جس نے جان کی بازی لگا کر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

دخترانِ ملت کے کارہائے نمایاں: دخترانِ ملت خواتین کشمیر کی سب سے فعال اور منظم تنظیم ہے جس کی شاندار کارکردگی کی شہرت اب کشمیر سے نکل کر دُور دُور تک پھیل چکی۔ یہ تنظیم کئی دہائیوں سے مصروف عمل ہے۔ دخترانِ ملت کے نظم وضبط اور تعلیم وتربیت کے تحت ریاست جموں وکشمیر کی خواتین نے مکمل اتحاد اور یکجہتی کے ایسے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں کہ آزادیٔ کشمیر کی تاریخ سدا فخر کرتی رہے گی۔

1989ء کے بعد جب کشمیر کی تحریک مزاحمت اپنے عروج پر تھی اور ہزاروں کی تعداد میں نوجوان بچے کالجوں اور اسکولوں سے نکل کر بلند و بالا برفانی چوٹیاں عبور کرتے ہوئے مقبوضہ اور آزاد کشمیر کے درمیان کھنچی ہوئی جعلی خونیں لکیر کو روند رہے تھے تو حالات پاکستان اور ہندوستان دونوں کے قابو سے باہر نکل گئے تھے۔ پوری ریاست جموں وکشمیر 'بھارتی غاصبو! کشمیر سے نکل جاؤ' اور ہم 'لے کے رہیں گے آزادی' کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ ان حالات میں ریاست کی خواتین تحریک مزاحمت کی دوسری دفاعی لائن ثابت ہوئیں۔ ان کے عزم و ہمت اور صبر و وقار کے سامنے تاریخ عالم کے سب صفحات ہیچ ہیں۔ اس تحریک مزاحمت کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ کشمیر جس کو بھارت اپنی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے، اس کے پھول جیسے نرم و نازک اور خوبصورت بچے اور جوان بسوں پر دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے سرحد عبور کر رہے تھے تو کسی سیاستدان، پولیس یا فوجی نے نہیں روکا اور انھیں آسانی سے سرحد عبور کرنے دی گئی لیکن جب یہ دنیا بھر میں امن کا پیغام پہنچا کر واپس گھروں کو جا رہے تھے تو بھارتی فوج نے جگہ جگہ گھات لگا کر ان معصوم کلیوں کا شکار کیا اور ہزاروں کی تعداد میں انھیں شہید کیا۔ جو معاملہ دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت سے حل ہو سکتا تھا اسے بندوق سے حل کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کا چارا کشمیریوں کی تین نسلیں بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر میں مسلح بغاوت پھوٹ پڑی۔ جیلیں مردوں سے بھر گئیں اور بھارتی فوج کو عورتوں کی آبروریزی کی کھلی اجازت دے دی گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں کو ہر وقت تلاشی دینے کے لیے دروازے کھلے رکھنے کا حکم

جاری کیا گیا۔ اس شورش زدہ ماحول میں دخترانِ ملت کی خواتین کارکنان نے اس طرح منظم طریقے سے حالات کو سنبھالا اور مردوں کی عدم موجودگی کا کلاء بھی پورا کیا کہ بھارتی حکومت کے تمام حلقے انگشت بدنداں رہ گئے۔

محترمہ آسیہ اندرابی: دخترانِ ملت کی روحِ رواں اور جانثارو بے مثال راہنما محترمہ آسیہ اندرابی ہی ہیں۔ انھوں نے اپنے اُجلے اور فولادی کردار سے الجزائر کی جمیلہ موہیرہ اور فلسطین کی زرقاء کے کرداروں کو زندہ کر دیا۔ ان کی ساتھی مجاہد خواتین ناہیدہ نسرین اور فہمیدہ صوفی ان کے شانہ بشانہ قدم بقدم پا بہ رکاب رہیں۔ آسیہ اندرابی نے سید علی گیلانی کی دعاؤں کے سائے میں انتہائی مشکل حالات میں تحریک مزاحمت کا محاذ سنبھال لیا۔ ریاست میں لامتناہی کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ محترمہ آسیہ اندرابی کی بہترین حکمت عملی کی وجہ سے کرفیو کے دوران ہر طرح کی سپلائی لائن جاری رہی۔ زخمیوں کو علاج معالجے کی سہولت میسر رہی اور مجاہدین اور فوج کے درمیان مسلح جھڑپوں کے باوجود راشن کا معقول انتظام رہا۔ دخترانِ ملت کرفیو توڑتے ہوئے نہ صرف خواتین کے عظیم الشان جلوس منظم کیے بلکہ میڈیا کے ذریعے بیرونی دنیا تک پوری قوت سے اپنا آزادی کا مطالبہ اور مسئلہ کشمیر کی حقیقت واہمیت کو اُجاگر کیا۔

5 فروری 1991ء کو انھیں شوہر قاسم اور سات ماہ کے بیٹے محمد بن قاسم سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ ننھے محمد بن قاسم نے اپنی پہلی سالگرہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے منائی۔ آج بھی ۲۳ مارچ اور ۱۴/ اگست کے دن ہر دفعہ آسیہ اندرابی کی سرکردگی میں کشمیری خواتین پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا اور پاکستان کا قومی ترانہ پڑھ کر سڑکوں پر مارچ کرتیں اور یوم پاکستان کی تقریبات مناتی ہیں۔ دخترانِ ملت کی عظیم الشان تنظیم کے تحت ۳۰ ہزار خواتین عسکری کارروائیوں اور مجاہدین کشمیر کی معاونت کے لیے شریکِ جہاد ہوئیں۔ ان پاکباز خواتین نے معاشرتی اور ثقافتی محاذ پر بھی گراں قدر خدمات انجام دیں اور کشمیر میں اسلامی تہذیب وتمدن اور خواتین کے پردے کے تصور کو فروغ دیا۔ جب ظلم حد سے بڑھ گیا تو دخترانِ ملت نے خواتین کو گھروں میں دَر اندازی کرنے والے بھارتی فوجیوں کے ساتھ دست بدست مقابلہ کرنے کی تربیت دینا شروع کر دی۔

پرویز حمیدہ بانو: کشمیر یونیورسٹی سرینگر کی پروفیسر محترمہ حمیدہ بانو اور ان کے شوہر نعیم احمد جس طرح سرینگر مقبوضہ کشمیر کے ماحول میں رہتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کو Document کر کے اپنی تحریروں، تقریروں اور مختلف ذرائع ابلاغ سے دنیا بھر میں اُجاگر کر رہے، ایسی محنت شاقہ، اخلاص، جذبۂ حب الوطنی، مقصد سے شدید لگاؤ اور جرأت رندانہ کے ساتھ تو پاکستان کی وزارتِ خارجہ یا کسی سفارتخانے نے بھی آج تک کشمیر کے لیے اس قدر سکہ بند کام نہیں کیا۔ مجھے سرینگر میں ایک کانفرنس کے دوران مسئلہ کشمیر پر پروفیسر حمیدہ بانو کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ میں اس بہادر اور جرأت مند خاتون کے علم ودانش، دلیل کی طاقت، زبان و بیان کی تاثیر، جذبہ حب الوطنی اور شعورِ آزادی سے حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ پاکستان کے نکتۂ نظر سے مقدمۂ کشمیر اس طرح پیش کر رہی تھیں جیسے اقوامِ متحدہ میں تقریر کر رہی ہوں جبکہ سامعین میں تمام دانشور، کشمیری پنڈت، بیوروکریٹس، صحافی، سیاستدان اور مختلف طبقاتِ فکر کی مسلم، سکھ اور ہندو شخصیات شامل تھیں۔

محترمہ زمرد انجم حبیب: یہ شیر دل مجاہدہ اسلامیہ کالج سرینگر میں لیکچرار کی آسامی پر فائز تھیں۔ جب کشمیر میں ظلم وستم حد سے بڑھ گیا تو یہ سب کچھ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ انھوں نے کالجوں کی طالبات، اساتذہ اور دیگر خواتین کو منظم کیا۔ موصوفہ حلقۂ خواتین کے نام سے خواتین کی تنظیم کی بانی ممبران میں شامل تھیں۔ جب جہاد زوروں پر تھا تو انھوں نے حریت کانفرنس میں شمولیت اختیار کر لی۔ بھارتی ایجنسیوں نے انھیں بے حد پریشان کیا۔ بیرونی ملک

سے ایک خواتین کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تو پاسپورٹ بنانے کے سلسلہ میں دہلی میں مصروفیات کے دوران انھیں حراست میں لے کر تہار جیل میں بند کر دیا گیا۔ ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ان کے بھائی سرینگر میں ڈاکٹر تھے جو یہ مقدمہ بھگتتے بھگتتے قلاش ہو گئے۔

دورانِ قید انھوں نے اپنی کتاب (قیدی نمبر 100) میں انھوں نے جو روئیداد تحریر کی، اس کا ایک ایک لفظ چونکا دینے والا ہے۔ قید کے دوران انھوں نے کیسی کیسی اذیتیں برداشت کیں۔ ٹی وی پر پاک بھارت کرکٹ میچ دیکھنے اور پاکستانی ٹیم کے لیے دعا کرنے کے جرم میں ان پر کس قدر تشدد کیا گیا، یہ سب تفصیل پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پروینہ آہنگو: پروینہ آہنگر کا سارا خاندان کشمیر کی تحریک مزاحمت میں پیش پیش تھا۔ ۱۹۹۰ء کی ذہائی میں اس کا جواں سال بیٹا اور شوہر بھارتی فوج نے پکڑ کر غائب کر دیے۔ اس دن سے آج تک وہ ان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اپنے پیاروں کی طویل گمشدگی کی جدوجہد میں انھوں نے گمشدہ کشمیریوں کی بازیابی کے لیے ایک تنظیم بنائی جس کی وہ صدر ہیں۔ اس تنظیم میں وہ تمام خواتین شامل ہیں جن کے لختِ جگر اور زندگی کے سہارے بھارتی فوج کے ہاتھوں غائب ہو چکے ہیں اور کئی دہائیوں سے ان کا سراغ نہیں مل رہا۔

حصولِ مقصد کے لیے پروینہ آہنگر کی جدوجہد بے مثال ہے۔ اپنا دل وجگر ہاتھ میں تھامے وہ کہاں کہاں نہیں گئیں۔ ہر قبرستان کی آبلہ پائی کی۔ جیلوں کے قیدیوں کی فہرستیں کھنگالیں، اجتماعی قبریں تک چھان ماریں۔ جنگل جنگل، وادی وادی، دریاؤں کے کنارے، برفانی چوٹیوں پر چل چل کر یہ خوبصورت مصیبت زدہ بیوی اور حرماں نصیب ماں ہڈیوں کا پنجر بن چکی لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ ہر محفل اور خواتین کے اجتماع میں تابش کا یہ شعر رو رو کر پڑھتیں

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

حلقۂ خواتین سرینگر: سرینگر میں حلقۂ خواتین کی سرکردہ اراکین میں تنظیم کی بانی رُکن فریدہ بہن جی نے شاندار خدمات انجام دیں اور کشمیر کا مقدمہ لے کر ہر جگہ گئیں۔ فزیکل انسپکٹر یس بی بی ہمدم جان کو کالج کی طالبات کو بھارت کا قومی ترانہ پڑھنے اور بھارتی ترنگے کو سلامی دینے سے منع کرنے پر ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ محترمہ زینب بٹ صاحبہ جو گورنمنٹ کالج سرینگر میں باٹنی کی لیکچرار تھیں کے ۱۹۶۵ء میں مجاہدین کی مدد اور انھیں پناہ دینے اور طالبات کو بغاوت پر اُکسانے کے جرم میں وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے لیکن وہ تنہا بے سروسامانی کی حالت میں آزاد کشمیر ہجرت کر گئیں۔ وہاں انھیں محکمہ تعلیم میں تعینات کیا گیا۔ انھوں نے محنت شاقہ سے گرلز ہائی سکول مظفر آباد کو آزاد جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ ٹیکسٹائل و ڈیزائننگ تک ترقی دی اور آزاد کشمیر میں بے حد عزت واحترام کا مقام حاصل کیا۔ اسی طرح پروفیسر صفیہ حسن شاہ بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ آزاد کشمیر آ گئیں۔ بعدازاں گرلز کالج پشاور کی پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔

خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تحریک آزادی کشمیر کی شہید خواتین:

شوپیاں کی شہید اول ساجدہ بانو: شوپیاں میں خواتین کے ایک جلوس کی قیادت ساجدہ بانو جن کی عمر پچیس برس تھی اور وہ اُمید سے تھیں، نے کی۔ فوج نے انھی عورتوں کے پُرامن جلوس پر فائر کھول دیا۔ ساجدہ بانو سب سے آگے تھیں۔ ان کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا اور چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ شوپیاں کے مزار شہداء میں ایک شہید ماں کی قبر کے ساتھ ایک ننھے شہید کی قبر کا اضافہ ہوا جس کی کوئی عمر نہ تھی اور جس کا ابھی کوئی نام نہ تھا۔

جان بیگم شہید خواجہ پورہ: ساجدہ بانو کی شہادت کے بعد خواتین کے جلوس پورے کشمیر میں پھیل گئے۔ خواجہ پورہ میں خواتین اور بچوں کا بہت بڑا جلوس آزادی کے نعرے لگاتا ہوا شاہراہ کی طرف آرہا تھا جس پر ڈوگروں نے فائر کھول دیا۔ جان بیگم جو جلوس کی قیادت کررہی تھیں موقع پر شہید ہوگئیں۔

فریژی بیگم شہید بارہ مولا: خواتین کی شہادتوں کے واقعات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ برفباری کا موسم شروع ہو چکا تھا لیکن خواتین کے عزم و ہمت اور غم وغصہ نے پوری ریاست کشمیر کو شعلہ بار بنا دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک بڑا ماتمی جلوس بارہ مولا میں منظم کیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر سروں کا سمندر نظر آنے لگا۔ اچانک ڈوگرہ فوج اور پولیس نے اس جلوس کو گھیرے میں لے لیا۔ اچانک ایک خاتون ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی اور آگ سے بھری ہوئی کانگڑی ایک سپاہی کے منہ پر دے ماری جس سے اس کا چہرہ جھلس گیا اور وردی نے آگ پکڑ لی۔ اس کے ساتھ کھڑے دوسرے فوجی نے فائر کھول دیا اور خاتون موقع پر ہی شہید ہوگئی۔ اس خاتون کا نام فریژی بیگم تھا۔

خواتین کی نارچو پلٹن اور فاضلی بیگم کی شہادت: خواتین کے جلوسوں پر اندھا دھند فائرنگ اور شہادتوں کے بعد میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ صاحب نے باضابطہ اعلانِ جہاد کر دیا جس پر پوری قوم نے لبیک کہا۔ نوجوان لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور نارچو سے مسلح ہو کر فوج اور پولیس کا مقابلہ کرنے لگے۔ نارچو مچھلی کا شکار کرنے والے نیزے کو کہتے ہیں۔ اس طرح ان گروپوں کا کام نارچو پلٹن پڑ گیا۔ مردوں کی تقلید میں عورتوں نے بھی نارچو پلٹن بنالی۔ جب خواتین کی یہ نارچو پلٹن مائی صمہ کے بازار سے گزر رہی تھی تو ان کا مقابلہ ڈوگرہ فوج سے شروع ہوگیا۔ اس معرکے میں مجاہدہ فاضلی بیگم نے شہادت پائی اور متعدد خواتین شدید زخمی ہوگئیں۔

جنوری ۱۹۹۰ء میں سترہ سالہ سکینہ نے اپنے گھر داخل ہونے والے تین بھارتی فوجیوں کو پھل کاٹنے والی چھری سے

اچانک حملہ کر کے واصل جہنم کیا اور خود بھی شہید ہو گئیں۔ کالج کی ایک طالبہ نے جلوس سے نکل کر بھارتی فوجی افسر کو گولی مار دی اور خود بھیڑ میں غائب ہو گئی۔ فروری ۱۹۹۰ء میں خلیفہ پورہ میں ۳۷ سالہ دلشاد بیگم کو بندوق کے بٹ مار کر شہید کر دیا گیا۔ ڈاؤن ٹاؤن میں ایک ۳۵ سالہ خاتون کو مزاحمت کے دوران بندوق کی سنگین سے ذبح کیا گیا۔

سرینگر میں ۲۲ سالہ لڑکی نے اپنی عزت بچانے کے لیے دو بھارتی فوجی افسروں کو ان کی بندوق چھین کر جہنم واصل کیا اور خود بھی رتبۂ شہادت پر فائز ہوئی۔ سرینگر میں دو سگی بہنوں نے تعاقب کرتے ہوئے فوجیوں سے اپنی عزت بچانے کے لیے جلتے ہوئے تنور میں چھلانگ لگا کر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ڈاؤن ٹاؤن، پہلگام، چھان پورہ اور بڈگام کی جلتی ہوئی بستیوں سے شہید خواتین کی سوختہ لاشیں کئی دنوں تک عالمی ضمیر کا ماتم کرتی رہیں۔

۲/اگست ۱۹۹۱ء کو وادی لولاب کے موضع پوش پورہ کے گرلز ہائی سکول میں راجپوت رائفلز کے مکروہ فوجیوں نے شب برأت کی اجتماعی عبادت میں مصروف خواتین پر دھاوا بول دیا اور ۲۰۰ سواتین کی اجتماعی آبروریزی کی۔ جن میں دس برس کی معصوم بچیوں سے لے کر ۶۰ برس کی بزرگ خواتین بھی شامل تھیں۔ ان میں دس شہید خواتین کی بریدہ لاشیں سڑک پر پھینک دی گئیں۔ ان کا مقدمہ لولاب کے کمشنر وجاہت حبیب اللہ کی مدعیت میں سری نگر ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھا جو آج تک راجپوت رائفلز کے وکیل کی درخواست پر حکم امتناعی پر ہے۔

ہندواڑہ کے ایک گرلز سکول کی گراؤنڈ میں کھڑی دو معلمات دلشاد بیگم اور نسرینہ بیگم کو بھارتی فوجیوں نے ان کے مجاہد بھائیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کے دوران بالوں سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ان کے ساتھ زیادتی کی گئی اور انھیں برہنہ حالت میں جلوس کی صورت میں بازاروں میں گھمایا گیا۔ اس دلدوز منظر کو دیکھ کر ہندواڑہ کی پوری آبادی کلہاڑیوں، ڈنڈوں اور چھریوں سے بھارتی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ بھارتی فوجی کیمپ لاشوں سے بھر گیا۔ شام تک اس بستی کے تین سو نوجوان شہادت کا اعزاز حاصل کر چکے تھے۔

جون ۱۹۹۸ء میں مظفر آباد سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر چکوٹھی کے قریب دریائے جہلم سے ایک سترہ سالہ دوشیزہ کی لاش نکالی گئی جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور پیٹ پر کئی کلو وزنی سٹیل کی پنوں سے لفظ پاکستان کھدا ہوا تھا۔ کشمیر کی ماؤں نے نہ صرف بہ صد خوشی اپنے جوان بیٹے ہاتھوں میں مہندی لگا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر مسلح جہاد کے لیے رخصت کیے بلکہ بذاتِ خود بھی مسلح ہو کر کارروائیوں میں حصہ لیا۔

شہید خواتین کے جو نام ہم تک پہنچ سکے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ سردار بیگم بٹ مالو، سمیرا احمد سرائے بالا، شریفہ بانو متصل محلہ چھتہ پل، صائمہ نمچہ مل، مالہ بی بی سندر باغ، فرحت جان کاڈلی پورہ، حلیمہ بیگم مول بازار، تاجہ بیگم بٹ مالو۔ اسکے بعد بھارتی حکومت کی طرف سے میڈیا اور جبر رسانی کے تمام ذرائع جن میں موبائل سروس، ٹیلی ویژن سروس، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ شامل ہیں پر شدید پابندی کی وجہ سے مستند حقائق سامنے نہ آسکے اور اب مودی سرکار کے خبط باطن کی وجہ سے خواتین کے ساتھ جو مظالم رو رکھے جا رہے ہیں اس کی گواہی دینے والا بھی کوئی نہیں۔

کشمیر کی ان بہادر اور بے مثال بیٹیوں، ماؤں او بہنوں نے اپنا فرض ناقابل یقین عزم و ہمت کے ساتھ ادا کر دیا ہے اب وہ کسی محمد بن قاسم کی راہ دیکھ رہی ہیں جس کا دل سیاسی مصلحتوں سے پاک، امت کے تاجدار اور نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے معمو اور قومی غیرت سے بھرپور ہو۔ ◆◆◆

عذرا فردوس

دادا جان دہرہ دون میں رہتے تھے۔ اُنھیں وہاں کے جنگلوں سے پوری واقفیت تھی۔ اس لیے اکثر شکار پارٹیاں اُنھیں اپنے ساتھ لے جایا کرتیں۔ ایک بار دادا جان شکار پارٹی سے کچھ فاصلے پر جنگل سے گزر رہے تھے کہ انھیں برگد کے ایک درخت کی جڑ میں شیر کا بچہ چھپا ہوا دکھائی دیا۔ دادا جان نے اندازہ لگا لیا کہ یہ بھٹکتا ہوا اس طرف آن نکلا اور

”پہچان“

شیرنی یعنی اپنی ماں سے بچھڑ چکا ہے۔

جب شکاری مہم اختتام کو پہنچی تو دادا جان شیر کا بچہ اپنے ساتھ ہرہ دون لے آئے۔ دادی نے شیر کا نام ٹموتھی رکھ دیا۔ وہ صرف یڑھ فٹ کا تھا۔ گھر میں ٹموتھی کی پسندیدہ جگہ بیٹھک تھی۔ وہ میںان سے صوفے پر دراز ہو جاتا اور پُروقار انداز میں ایک ایک ود یکھتا رہتا۔ غرّاتا صرف اُس وقت جب کوئی اس کی جگہ لینے ں کوشش کرتا۔ کھیلتے وقت اُس کا سب سے دلچسپ انداز یہ ہوتا

کہ وہ دبے پاؤں گھات لگانے کی طرح اپنے ساتھ کھیلنے والے کے پاس پہنچ کر اُس کے پیروں میں لوٹنے لگتا۔

میری ٹموتھی سے دوستی ہو گئی۔ جلد ہی ہم دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ وہ اپنی آنکھوں میں عیارانہ چمک لیے دبے پاؤں قلانچ بھرنے کے انداز میں میری طرف بڑھتا اور نزدیک آتے آتے اچانک میری جانب لپکتا پھر میرے قدموں میں لوٹتے ہوئے خوشی سے لاتیں چلاتا اور بظاہر میری پنڈلیاں کاٹنے کی کوشش کرتا۔

رفتہ رفتہ اُس کا ڈیل ڈول ایک شکاری کتے کے مانند بڑھتا گیا۔ میں اُسے ٹہلانے کے لیے شہر کی سڑکوں پر نکلتا تو لوگ خود بخود ہمیں راستہ دے دیتے۔ رات کو وہ ہمارے خانساماں کے کوارٹر میں سوتا۔ دادی جان اکثر کہتیں: ”درندہ آخر درندہ ہوتا ہے، دیکھ لینا کسی دن جب ہم محمود کے کوارٹر میں جائیں گے تو ٹموتھی اُس کے بستر پر سوتا ملے گا اور محمود کا نام ونشان نہ ہوگا۔“ واقعی ٹموتھی چھے ماہ کا ہوا تو اُس کے تیور خطرناک نظر آنے لگے۔ گھر کے نوکر چاکر اور تمام افراد محتاط ہو گئے۔ کسی کو اُس پر اعتبار نہ رہا۔ اُس کی نقل و حرکات مشکوک ہوتی چلی گئیں اور اُس نے محمود کے پیچھے اس طرح گھومنا شروع کر دیا جیسے موقع ملتے ہی اُس پر حملہ کر دے گا۔ مجبوراً دادا جان نے ٹموتھی کو کسی چڑیا گھر کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قریب ترین چڑیا گھر لکھنؤ میں تھا۔ دادا جان نے اپنے اور ٹموتھی کے لیے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ بک کرایا اور وہ دونوں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ چڑیا گھر کے منتظم ایک پلا پلایا قدرے مہذب شیر

وہ درندہ تھا مگر آج بھی اپنے محسن کو نہیں بھولا تھا

پا کر بے حد خوش ہوئے۔ دادا جان دہرہ دون لوٹ آئے۔ چھے ماہ تک دادا جان کو موقع نہ مل سکا کہ وہ ٹموتھی کی خیر خبر معلوم کرتے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ٹموتھی اپنے نئے گھر میں کس طرح رہ رہا ہے۔ ساتویں مہینے دادا جان اور دادی کچھ عزیزوں سے ملنے لکھنؤ گئے۔ دادا نے پہلی فرصت میں چڑیا گھر کا رُخ کیا اور سیدھے ٹموتھی کے پنجرے پر پہنچے۔ ٹموتھی ایک گوشے میں دبکا ہوا تھا اور خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اُس کے جسم کی دھاریاں روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ خاصا تندرست دکھائی دے رہا تھا۔ دادا جان نے اُسے آواز دی۔ ''ٹموتھی'' اور جنگلا پھلانگ کے پنجرے کے بالکل پاس چلے گئے۔ انھوں نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ سلاخوں کے اندر کر دیا اور پکارے، ''ٹموتھی۔'' دادا جان کی پکار پر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر سلاخوں کے نزدیک آ گیا۔ دادا جان نے بے اختیار اپنے دونوں بازو اُس کی گردن میں ڈال دیے۔ وہ ٹموتھی کا سر اور کان سہلانے لگے۔ ٹموتھی دھاڑنے لگا۔ وہ دھاڑتا تو دادا جان اُس کے منہ پر ایک چپت رسید کرتے۔ اُسے خاموش کرانے کے لیے یہ دادا جان کا مخصوص انداز تھا۔

ٹموتھی دادا جان کے ہاتھ چاٹنے لگا لیکن جلد ہی بدحواس سا ہو کر پلٹ گیا کیونکہ برابر کے پنجرے والا چیتا اُس پر غرّانے لگا تھا۔ دادا جان نے چیتے کو ہشت کہہ کر بھگایا۔ ٹموتھی پھر اُن کے پاس آ گیا اور دوبارہ اُن کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ چیتا سلاخوں کی طرف لپکتا تو ٹموتھی وقتی طور پر دادا جان کو چھوڑ کر دوسری طرف چلا جاتا۔

دیکھتے دیکھتے وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آدمی اور شیر کو آپس میں اتنا مانوس دیکھ کر سب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اتنے میں چڑیا گھر کا نگراں مجمع چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اُس نے دادا جان سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ دادا جان نے کہا کہ میں اپنے ٹموتھی سے باتیں کر رہا ہوں۔ چھے ماہ قبل میں ہی اسے یہاں لایا تھا۔ کیا اُس وقت تم یہاں نہیں تھے؟

''میں ابھی کچھ دنوں پہلے آیا ہوں۔'' حیرت میں ڈوبے ہوئے نگراں نے بتایا۔ ''آپ اپنی گفتگو شوق سے جاری رکھیں لیکن میں آج تک اسے ہاتھ نہیں لگا سکا۔ یہ غصے کا بہت تیز ہے۔ اس سے سب کو ڈر لگتا ہے۔''

دادا جان کو ٹموتھی سے باتیں کرتے اور اُس کا سر سہلاتے پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر انھوں نے چڑیا گھر کے ایک محافظ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اُسے دادا جان نے پہچان لیا۔ جب وہ ٹموتھی کو چڑیا گھر لائے تھے تو یہ محافظ موجود تھا۔ دادا جان نے اُس سے پوچھا:

''تم مجھے پہچانتے ہو؟'' محافظ نے اثبات میں سر ہلایا لیکن وہ بہت خوف سے دادا جان کو دیکھ رہا تھا۔ دادا جان نے اُس سے کہا: ''بھئی تم لوگ میرے ٹموتھی کو اس احمق چیتے سے دُور کسی پنجرے میں کیوں نہیں رکھتے۔''

''لیکن جناب! یہ آپ کا شیر نہیں ہے۔'' محافظ نے اٹکتے ہوئے بتایا۔ ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ اب یہ میرا نہیں ہے اور اب اس پر میرا کوئی اختیار نہیں لیکن تم لوگ میرے مشورے سے اسے دوسرے پنجرے میں تو منتقل کر سکتے ہو۔''

''مجھے آپ کا شیر اچھی طرح یاد ہے۔ وہ تو مر چکا۔'' محافظ نے بتایا۔

''کیا!'' دادا جان نے حیرت سے کہا، ''مر چکا ہے۔''

''جی ہاں اُسے نمونیا ہو گیا تھا۔'' محافظ دکھ سے بولا: ''یہ شیر تو ابھی پچھلے ہفتے پہاڑوں سے پکڑ کے لایا گیا ہے اور انتہائی خطرناک ہے۔''

شیر بدستور دادا جان کے ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ دادا جان نے اپنے ہاتھ سلاخوں سے کسی عجلت کے بجائے سُست رفتار سے نکالے پھر اپنا چہرہ سلاخوں کے قریب لے گئے اور شیر کے منہ کے سامنے منہ کر کے آہستگی سے بولے:

''صبح بخیر ٹموتھی!'' یہ کہہ کر انھوں نے حقارت سے محافظ کی طرف دیکھا اور تیز تیز چلتے ہوئے چڑیا گھر سے نکل آئے ◆◆

ایڈووکیٹ زاہد عرفان

گڈ بائے شوگر

آخری قسط

میرے ایک صحافی دوست جو خود بھی شوگر کے مرض میں مبتلا ہیں، انھوں نے مجھے ایک ویڈیو کلپ بھیجا اور ساتھ ہی پیغام دیا کہ یہ خاصے کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ آپ اس پر تحقیق کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اس طریقے سے قدرت ہمیں ذیابیطس سے نجات دے۔ ویڈیو ایک ڈاکٹر صاحب نے بنائی تھی اور وہ خود ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے اور انھوں نے اسے مکمل طور پر ختم کیا تھا۔ ڈاکٹر خالد جمیل صاحب شیخ زید اسپتال لاہور سے بطور ماہر امراض گردہ ریٹائرڈ ہوئے۔ میں نے آزمانے کی خاطر ان کے بتائے ہوئے طریقۂ کار پر عمل شروع کیا تو نتائج نے مجھے حیران کر دیا۔ ان دنوں میں دیگر ادویات کے ساتھ 36 یونٹ انسولین بھی لگا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے ذیابیطس کی تمام ادویات فوراً چھوڑ

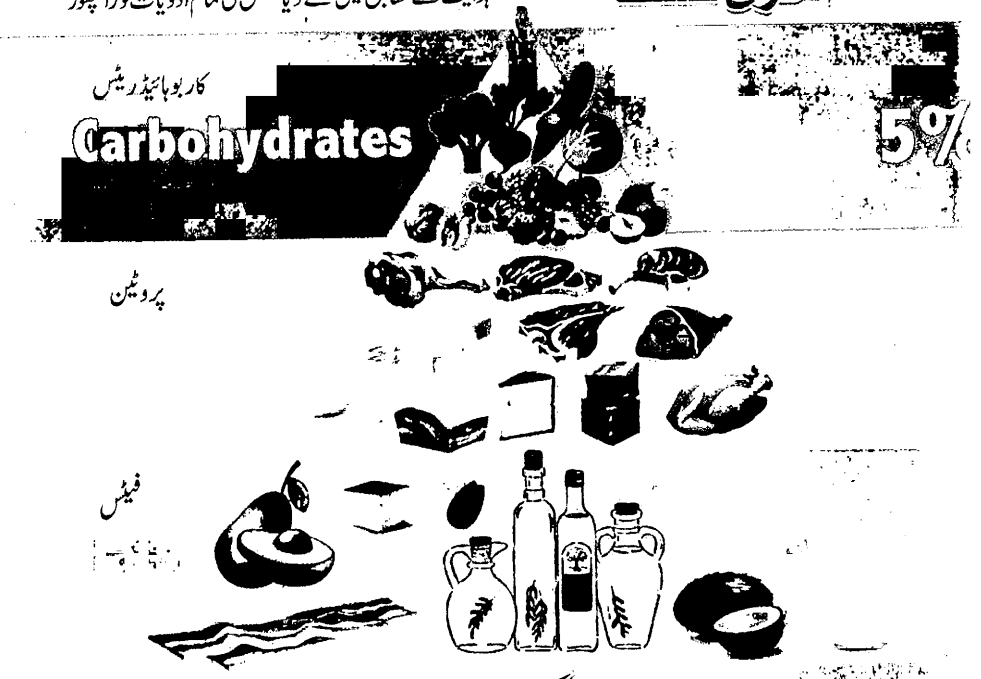

آخر میں نے یہ راز جان لیا کہ یہ سارا کھیل قوتِ مدافعت اور مستقل مزاجی کا ہے۔ اب آگے کی منزل آسان تھی اور اللہ مددگار...

لیکن اس کے باوجود میرے خون میں شکر کی سطح متوازن رہنے لگی۔ میں نے مارچ کے مہینے میں اس طرز زندگی کو اپنایا۔ آخر کے وسط میں، ٹیسٹ کروائے تو نتائج حیرت انگیز تھے۔ HbA1C جو جنوری کے مہینے میں 10.50 تھا، اب اس ویلیو 6.7 تھی۔ اسی طرح Lipid Profile ٹیسٹ میں کولیسٹرول کے تمام اعشاریے اپنی مقررہ حدود میں تھے۔ آج کو عرصہ بیت چکا اور میں اس وقت خود کو چاق و چوبند محسوس کرتا ہوں۔ ذیابیطس کی ادویات تو چھوڑیں ہی، اس کے ساتھ امراض مثلاً بلڈ پریشر، جوڑوں کا درد، سر درد، بینائی کی کمزوری، تبخیر معدہ وغیرہ سے بھی مکمل طور پر صحت مند ہوں۔ ذیابیطس کی بیماری قوت مدافعت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے مجھے انفیکشن ہو جاتا۔ اسی وجہ سے میرا گلا اکثر خراب رہتا اور میں اینٹی بائیوٹکس ادویات استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ اسی طرح معدے کی تکلیف دُور کرنے والی ادویات میرے بیگ میں ہوتی تھیں۔ ہفتہ میں ایک یا دو بار درد کش گولی لینا ایک معمول بن گیا تھا۔ الحمدللہ، آج میں چوبیس گھنٹوں میں کسی قسم کی یونانی، ہومیوپیتھی یا ایلوپیتھی دوائی نہیں کھاتا۔ خون میں شکر کی سطح متوازن ہے اور چالیس برس کی عمر میں، خود کو تیس سال کا محسوس کرتا ہوں۔ بیماری کی وجہ سے میری ازدواجی زندگی کافی متاثر ہوئی تھی جو اب بہترین اور خوشگوار گزر رہی ہے۔ جسمانی طاقت کے ساتھ میں نفسیاتی طور پر بھی بہتر محسوس کرتا ہوں۔ غصہ کم آتا ہے، برداشت بڑھ گئی ہے اور ذہنی دباؤ حساب پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

ذیابیطس کے علاج کے حوالے سے سب سے پہلا سبق یاد رکھیں کہ شوگر طرزِ زندگی پر اثر انداز ہونے والی بیماری ہے۔ ہمارا موجودہ رہن سہن اور کھانے پینے کی عادات اس بیماری کی اصل وجہ ہیں۔ آپ اپنے طرز زندگی میں تبدیلی کر لیں، آپ صحت مندی کی طرف لوٹ آئیں

صاحبِ مضمون

گے۔ پچھلی اقساط میں، میں نے تفصیل کے ساتھ لکھا کہ ہمارے ملک میں اس بیماری کے جو بھی طریقہ ہائے علاج ہیں، میں نے ان کے چوٹی کے ماہرین سے اپنا علاج کروایا۔ دنیا بھر میں ادویات بنانے والی کمپنیاں اور معالجین ابھی تک اس بیماری کی کوئی ویکسین اور دوائی مارکیٹ میں نہیں لا سکے جو یہ مرض مکمل طور ختم کر دے۔ البتہ عطائی حضرات بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ ضرور مل جائیں گے لیکن حتمی نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ تمام ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کو اس مرض کے ساتھ ہی زندگی گزارنا ہے اور ادویات کو باقاعدگی کے ساتھ لیتے رہنا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بدن میں مزید بیماریاں جنم لیتی رہیں گی اور ان کی ادویات بھی آپ کے نسخے کا حصہ بن جائیں گی۔

ہر سال چودہ نومبر کو ذیابیطس کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ جس کا مقصد اس بیماری کے حوالے سے آگاہی پیدا کرنا ہے۔ اس موقع پر میں آپ کو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ ذیابیطس ٹائپ-II کا مرض بغیر کسی دوائی کے سو فیصد قابل علاج ہے بشرطیکہ مریض تعاون کرے اور

اپنا طرزِ زندگی تبدیل کر لے۔ نوّے سے پچانوے فیصد مریض ذیابیطس ٹائپ-II کا شکار ہوتے ہیں۔ صرف پانچ فیصد ٹائپ -I میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جس میں ان مریضوں کے جسم میں انسولین بنتی ہی نہیں۔ اس لیے انھیں باہر سے انسولین دینا ضروری ہوتا ہے۔

بیماری کی اصل جڑ

شوگر کی بیماری انسانی بدن میں بتدریج پیدا ہوتی ہے اور جب اس کی علامات ظاہر ہوتی ہیں تو اس کو شروع ہوئے دس سے بیس برس کا عرصہ بیت چکا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہونے والی جدید ترین تحقیقات اور تجربات سے پتا چلا کہ بیماری کی اصل جڑ Insuline Resistance ہے۔ جب ہمارے جسم میں انسولین ریزسٹنس لمبے عرصے تک رہتی ہے تو ہمارا بدن مختلف بیماریوں کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے جس میں ذیابیطس ایک بیماری ہے۔ گویا انسولین ریزسٹنس کو اُم الامراض کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے اندھا پن، بلند فشارِ خون، امراض دل، فالج، جلدی امراض، زنانہ و مردانہ بانجھ پن، کینسر، دماغی بیماریاں، گردوں کا فیل ہونا اور جگر کا فیل ہونا شامل ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ برس دل کے دورے سے ایک کروڑ ستر لاکھ افراد لقمۂ اجل بنے، بلڈ پریشر نے پچھتر لاکھ نفوس کی زندگیوں کے چراغ گل کیے، فالج سے پچاس لاکھ اموات ہوئیں اور ذیابیطس کے مرض سے فوت ہونے والے افراد کی تعداد سولہ لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ صرف ایک سال کا ریکارڈ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسولین ریزسٹنس سے پیدا ہونے والے امراض کس قدر تباہ کن ہیں۔

انسولین کیا ہے؟

انسولین انسانی جسم میں بننے والا ایک ایسا ہارمون ہے جو لبلبہ میں بیٹا سیل کے توسط سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد خون میں شکر کی مقدار کو متوازن رکھنا ہے۔ یہ خلیوں اور عضلات میں آمائینو ایسڈ کی ترسیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طرح انسولین جسم میں سوڈیم کو روک لیتی ہے جس کی وجہ سے بلڈ پریشر کی بیماری جنم لیتی ہے۔ انسولین کا ایک اور اہم کام جسم میں موجود چربی کو پگھلنے سے روکنا بھی ہے۔ یہ ہارمون ہمارے جسم کے عضلات بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

یہ مفید ہارمون اس وقت خطرناک ہو جاتا ہے جب خون میں اس کی مقدار بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم کاربوہائیڈریٹس (چینی، میدہ، چاول، پھل، آلو وغیرہ) کھاتے ہیں تو ہمارے خون میں شکر کی سطح بڑھ جاتی ہے۔ اسے کم کرنے کے لیے لبلبہ فوری طور پر انسولین خارج کرتا ہے تاکہ شکر کی سطح متوازن رکھی جا سکے۔ جیسے ہی انسولین کی وجہ سے ہمارا شوگر لیول کم ہونے لگتا ہے، ہمیں شدید بھوک کا احساس ہوتا ہے اور ہم روٹی، چاول، بسکٹ، کیک یا کوئی اور ایسی چیز کھاتے ہیں جس سے ہماری بھوک مٹ جائے۔ کھانا کھاتے ہی خون میں شکر کی سطح پھر بلند ہونے لگتی ہے، جسے کم کرنے کے لیے مزید انسولین آتی ہے۔ اس طرح سے ہمارے خون میں مسلسل شکر کی سطح بلند ہونے اور انسولین کے آنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جب انسولین کی خون میں مقدار بہت زیادہ رہنا شروع ہو جائے تب انسولین ریزسٹنس پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ انسولین چربی کو پگھلنے سے روکتی ہے لہٰذا یہ عمل رُک جانے کی وجہ سے موٹاپا پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ انسولین کی سطح کو خون میں کم رکھنے کے لیے ہمیں ایسی تمام غذاؤں سے پرہیز کرنا ہوگا جس سے خون میں شکر کی سطح بلند ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اٹل اصول ہے کہ اگر گلوکوز خون میں آئے گا تو انسولین بھی آئے گی۔

خون میں انسولین کا لیول جن چیزوں کے کھانے سے بہت زیادہ بڑھتا ہے ان میں سرفہرست چینی اور اس سے بنی اشیا، میدہ اور اس سے بنی اشیا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بار بار کھانا بھی خون میں شکر کی سطح بڑھا کر انسولین زیادہ کر دیتا

دیں لیکن اس کے باوجود میرے خون میں شکر کی سطح متوازن آنے لگی۔ میں نے مارچ کے مہینے میں اس طرز زندگی کو اپنایا۔ مئی کے وسط میں، ٹیسٹ کروائے تو نتائج حیرت انگیز تھے۔ میرا HbA1C جو جنوری کے مہینے میں 10.50 تھا، اب اس کی ویلیو 6.7 تھی۔ اسی طرح Lipid Profile ٹیسٹ میں کولیسٹرول کے تمام اعشاریے اپنی مقررہ حدود میں تھے۔ آج نو ماہ کا عرصہ بیت چکا اور میں اس وقت خود کو چاق و چوبند محسوس کرتا ہوں۔ ذیابیطس کی ادویات تو چھوڑیں ہی، اس کے ساتھ دیگر امراض مثلاً بلڈ پریشر، جوڑوں کا درد، سر درد، بینائی کی کمزوری، تبخیر معدہ وغیرہ سے بھی مکمل طور پر صحت مند ہوں۔ ذیابیطس کی بیماری قوت مدافعت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے مجھے انفیکشن ہو جاتا۔ اس وجہ سے میرا گلا اکثر خراب رہتا اور میں اینٹی بائیوٹکس ادویات استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ اسی طرح معدے کی تیزابیت دُور کرنے والی ادویات میرے بیگ میں ہوتی تھیں۔ ہفتہ میں ایک یا دو بار درد کش گولی لینا ایک معمول بن چکا تھا۔ الحمدللہ، آج میں چوبیس گھنٹوں میں کسی قسم کی یونانی، ہومیوپیتھی یا ایلوپیتھی دوائی نہیں کھاتا۔ خون میں شکر کی سطح متوازن ہے اور چالیس برس کی عمر میں، خود کو تیس سال کا محسوس کرتا ہوں۔ بیماری کی وجہ سے میری ازدواجی زندگی کافی متاثر ہوئی تھی جو اب بہترین اور خوشگوار گزر رہی ہے۔ جسمانی صحت کے ساتھ میں نفسیاتی طور پر بھی بہتر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے غصہ کم آتا ہے، برداشت بڑھ گئی ہے اور ذہنی دباؤ اعصاب پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

ذیابیطس کے علاج کے حوالے سے سب سے پہلا سبق یہ یاد رکھیں کہ شوگر طرزِ زندگی پر اثر انداز ہونے والی بیماری ہے۔ ہمارا موجودہ رہن سہن اور کھانے پینے کی عادات ہی اس بیماری کی اصل وجہ ہیں۔ آپ اپنے طرز زندگی میں تبدیلی کر لیں، آپ صحت مندی کی طرف لوٹ آئیں

صاحبِ مضمون

گے۔ پچھلی اقساط میں، میں نے تفصیل کے ساتھ لکھا کہ ہمارے ملک میں اس بیماری کے جو بھی طریقہ ہائے علاج ہیں، میں نے ان کے چوٹی کے ماہرین سے اپنا علاج کروایا۔ دنیا بھر میں ادویات بنانے والی کمپنیاں اور معالجین ابھی تک اس بیماری کی کوئی ویکسین اور دوائی مارکیٹ میں نہیں لا سکے جو یہ مرض مکمل طور ختم کر دے۔ البتہ عطائی حضرات بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ ضرور مل جائیں گے لیکن حتمی نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ تمام ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کو اس مرض کے ساتھ ہی زندگی گزارنا ہے اور ادویات کو باقاعدگی کے ساتھ لیتے رہنا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بدن میں مزید بیماریاں جنم لیتی رہیں گی اور ان کی ادویات بھی آپ کے نسخے کا حصہ بن جائیں گی۔

ہر سال چودہ نومبر کو ذیابیطس کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ جس کا مقصد اس بیماری کے حوالے سے آگاہی پیدا کرنا ہے۔ اس موقع پر میں آپ کو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ ذیابیطس ٹائپ-II کا مرض بغیر کسی دوائی کے سو فیصد قابل علاج ہے بشرطیکہ مریض تعاون کرے اور

اپنا طرزِ زندگی تبدیل کر لے۔ نوّے سے پچانوے فیصد مریض ذیابیطس ٹائپ-II کا شکار ہوتے ہیں۔ صرف پانچ فیصد ٹائپ -I میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جس میں ان مریضوں کے جسم میں انسولین بنتی ہی نہیں۔ اس لیے انھیں باہر سے انسولین دینا ضروری ہوتا ہے۔

بیماری کی اصل جڑ

شوگر کی بیماری انسانی بدن میں بتدریج پیدا ہوتی ہے اور جب اس کی علامات ظاہر ہوتی ہیں تو اس کو شروع ہوئے دس سے بیس برس کا عرصہ بیت چکا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہونے والی جدید ترین تحقیقات اور تجربات سے پتا چلا کہ بیماری کی اصل جڑ Insuline Resistance ہے۔ جب ہمارے جسم میں انسولین ریزسٹنس لمبے عرصے تک رہتی ہے تو ہمارا بدن مختلف بیماریوں کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے جس میں ذیابیطس ایک بیماری ہے۔ گویا انسولین ریزسٹنس کو اُم الامراض کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے اندھا پن، بلند فشارِ خون، امراض دل، فالج، جلدی امراض، زنانہ و مردانہ بانجھ پن، کینسر، دماغی بیماریاں، گردوں کا فیل ہونا اور جگر کا فیل ہونا شامل ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ برس دل کے دورے سے ایک کروڑ ستر لاکھ افراد لقمۂ اجل بنے، بلڈ پریشر نے پچھتر لاکھ نفوس کی زندگیوں کے چراغ گل کیے، فالج سے پچاس لاکھ اموات ہوئیں اور ذیابیطس کے مرض سے فوت ہونے والے افراد کی تعداد سولہ لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ صرف ایک سال کا ریکارڈ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسولین ریزسٹنس سے پیدا ہونے والے امراض کس قدر تباہ کن ہیں۔

انسولین کیا ہے؟

انسولین انسانی جسم میں بننے والا ایک ایسا ہارمون ہے جو لبلبہ میں بیٹا سیل کے توسط سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد خون میں شکر کی مقدار کو متوازن رکھنا ہے۔ یہ خلیوں اور عضلات میں آمائنو ایسڈ کی ترسیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طرح انسولین جسم میں سوڈیم کو روک لیتی ہے جس کی وجہ سے بلڈ پریشر کی بیماری جنم لیتی ہے۔ انسولین کا ایک اور اہم کام جسم میں موجود چربی کو پگھلنے سے روکنا بھی ہے۔ یہ ہارمون ہمارے جسم کے عضلات بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

یہ مفید ہارمون اس وقت خطرناک ہو جاتا ہے جب خون میں اس کی مقدار بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم کاربوہائیڈریٹس (چینی، میدہ، چاول، پھل، آلو وغیرہ) کھاتے ہیں تو ہمارے خون میں شکر کی سطح بڑھ جاتی ہے۔ اسے کم کرنے کے لیے لبلبہ فوری طور پر انسولین خارج کرتا ہے تاکہ شکر کی سطح متوازن رکھی جا سکے۔ جیسے ہی انسولین کی وجہ سے ہمارا شوگر لیول کم ہونے لگتا ہے، ہمیں شدید بھوک کا احساس ہوتا ہے اور ہم روٹی، چاول، بسکٹ، کیک یا کوئی اور ایسی چیز کھاتے ہیں جس سے ہماری بھوک مٹ جائے۔ کھانا کھاتے ہی خون میں شکر کی سطح پھر بلند ہونے لگتی ہے، جسے کم کرنے کے لیے مزید انسولین آتی ہے۔ اس طرح سے ہمارے خون میں مسلسل شکر کی سطح بلند ہونے اور انسولین کے آنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جب انسولین کی خون میں مقدار بہت زیادہ رہنا شروع ہو جائے تب انسولین ریزسٹنس پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ انسولین چربی کو پگھلنے سے روکتی ہے لہٰذا یہ عمل رُک جانے کی وجہ سے موٹاپا پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ انسولین کی سطح کو خون میں کم رکھنے کے لیے ہمیں ایسی تمام غذاؤں سے پرہیز کرنا ہوگا جس سے خون میں شکر کی سطح بلند ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اٹل اصول ہے کہ اگر گلوکوز خون میں آئے گا تو انسولین بھی آئے گی۔

خون میں انسولین کا لیول جن چیزوں کے کھانے سے بہت زیادہ بڑھتا ہے ان میں سرفہرست چینی اور اس سے بنی اشیا، میدہ اور اس سے بنی اشیا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بار بار کھانا بھی خون میں شکر کی سطح بڑھا کر انسولین زیادہ کر دیتا

ہے۔اسی طرح کوکنگ آئل، چائنا نمک (MSG) جومختلف بازاری کھانوں میں ذائقہ بڑھانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، بناسپتی گھی، کولیسٹرول کم کرنے والی دوائیں اور نکوٹین اس فہرست میں شامل ہیں۔گوشت کھانے سے انسولین کی سطح کم بڑھتی ہے لیکن صحت مند چکنائیاں کھانے سے انسولین پر بالکل اثر نہیں ہوتا۔

انسولین ریزسٹنس کی تشخیص:

انسولین ریزسٹنس کی تشخیص کے لیے Homeostatic Model of Assesment کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔جس میں مریض کی نہار منہ شوگر اور نہار منہ انسولین لیول (Homa-IR) چیک کیا جاتا ہے پھر اسے ایک فارمولے میں درج کیا جاتا ہے، اگر جواب ایک سے کم ہو تو مریض میں انسولین ریزسٹنس نہیں ہوتی اگر ایک سے زیادہ ہو تو مرض موجود ہوتا ہے۔یہ ٹیسٹ کچھ مہنگا ہے۔اگر آپ ٹیسٹ نہیں کروا سکتے تو اسے جانچنے کا دوسرا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنا پیٹ چیک کریں۔اگر تو وہ بیلٹ سے باہر نکلا ہوا ہے تو آپ انسولین ریزسٹنس کے مریض ہیں۔جتنا بڑا ہوا پیٹ ہوگا، اتنا ہی مرض کی شدت زیادہ ہوگی۔

اُوپر بیان کی گئی ساری تفصیل سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ہمیں ہر صورت خون میں انسولین کا لیول کم رکھنا اور ایسی تمام غذاؤں سے پرہیز کرنا ہوگا جو اسے بڑھانے کا سبب بنتی ہیں۔ انسولین ریزسٹنس کی سب سے بڑی وجہ کاربوہائیڈریٹس ہیں جو آپ کی صحت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ انھیں پہچانیں اور ان سے دُور رہیں۔ کاربوہائیڈریٹس میں چینی، اناج (گندم، چاول، جوار، جو، دالیں وغیرہ) لیکٹوز (دُودھ کی مٹھاس) اور ہائی فرکٹوس کارن سیرپ (HFCS) شامل ہیں۔ ہائی فرکٹوس کارن سیرپ کو آج کل مشروبات، سوڈے کی بوتلوں اور پھلوں کے جوس میں بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے جو جگر کے لیے سخت مضر ہے۔ آج کل مائیں اپنے بچوں کو بڑے شوق سے ڈبے کے جوس پلاتی ہیں جو ان کی صحت کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

Fractosc انسولین ریزسٹنس کا سب سے بڑا سبب ہے اور جگر میں سوزش پیدا کر کے اسے تباہ کر دیتا ہے۔اگر آپ نے شوگر، بلڈ پریشر اور موٹاپا کنٹرول کرنا ہے تو اس کے لیے آپ کے جگر کا صحت مند ہونا بہت ضروری ہے۔

انسولین ریزسٹنس کا علاج:

انسولین ریزسٹنس کے پیدا ہونے کی چار بنیادی وجوہ ہوتی ہیں:

☆اوّل، کاربوہائیڈریٹس کھانا۔

☆دوم، بار بار کھانا۔

☆سوم، ورزش نہ کرنا

☆چہارم، ذہنی دباؤ (stress)

ماہرین نے مندرجہ بالا چاروں عوامل سامنے رکھتے ہوئے اس مرض سے نجات کے لیے چار عوامل ہی بتائے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم نہ صرف ذیابیطس سے بچ جاتے بلکہ انسولین ریزسٹنس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ان تمام بیماریوں سے بھی نجات حاصل کر لیتے ہیں جو ہر سال کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کے چراغ گل کر رہیں اور اربوں کھربوں ڈالر ادویہ ساز کمپنیوں اور ڈاکٹروں کی جیبوں میں لے جاتی ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں اپنی غذا کو بدلنا ہے۔ماہرین نے اس حوالے سے تجویز کردہ غذا کو Low Carbs High Fats کا نام دیا ہے۔ اس غذا میں کاربوہائیڈریٹس پانچ فیصد، پروٹین بیس فیصد اور صحت مند چکنائیاں ستر فیصد شامل ہوتی ہیں۔ پانچ فیصد کاربوہائیڈریٹس ہم سبز پتوں والی سبزیوں سے حاصل کرتے ہیں۔چینی، گندم، چاول، وینجیٹیبل آئل، بناسپتی گھی، شہد، گڑ، آلو، میٹھے پھل سب چیزوں کو اپنی زندگی سے نکال دیتے ہیں۔اب سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر کھانا

کیا ہے؟

ہماری غذا میں دو بنیادی اجزا ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک کو اجزائے کبیرہ (Macronutrients) اور دوسرے کو اجزائے صغیرہ (Micronutrients) کہتے ہیں۔ اجزائے کبیرہ میں کاربوہائیڈریٹس، پروٹین اور چکنائی شامل ہیں۔ ہمارا جسم توانائی حاصل کرنے کے لیے کاربوہائیڈریٹس کو گلوکوز میں تبدیل کرتا ہے اور ضرورت سے زائد گلوکوز جگر گلائی کوجن کی شکل میں ذخیرہ کرلیتا ہے۔ بدن اپنی توانائی کی ضروریات سب سے پہلے گلوکوز یا گلائی کوجن سے پوری کرتا ہے۔ ہمارے جسم میں گلائی کوجن کا ذخیرہ پندرہ سولہ گھنٹوں کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کے بعد جسم میں ذخیرہ شدہ چکنائی Ketones میں تبدیل کرکے استعمال میں لائی جاتی ہے۔ چکنائی کا یہ ذخیرہ ایک ماہ سے زائد مدت تک توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پروٹین سے جسم بہت کم توانائی حاصل کرتا ہے، لیکن اس کے ذریعے جسمانی اعضا بنتے ہیں۔

اجزائے صغیرہ (Micronutrients) میں نمکیات، وٹامن، فائٹو کیمیکل، فائبر اور پانی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا کردار بہت اہم ہوتا ہے اور ان کی کمی سے مختلف قسم کی بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں۔ یہ ہمارے مدافعتی نظام میں بہت فعال کردار ادا کرتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں ہم نے اپنے جسم کے توانائی حاصل کرنے والے ذریعے کو کاربوہائیڈریٹس سے چکنائی میں تبدیل کرنا ہے یعنی جو کام گلوکوز کرتا ہے وہی کام Ketones کریں گے جو چکنائی سے بنتے ہیں۔ جب خون میں گلوکوز کی سطح بلند نہیں ہوگی تو لبلبے کو انسولین کی کم مقدار ہی خارج کرنا ہوگی۔ جس کی وجہ سے انسولین ریزسٹنس آہستہ آہستہ کم ہو جائے گی اور اس سے پیدا شدہ عوارض بھی ختم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

کھانا کیا ہے؟

1۔ سبز پتوں والی سبزیاں مثلاً بند گوبھی، پھول گوبھی، بروکولی، سلاد پتہ، لال مولی، چقندر کے پتے، کھیرا، شملہ مرچ، مولی اور اس کے پتے، پالک، ساگ، کریلا، سبز دھنیا، پودینہ، پیاز، لہسن، ادرک وغیرہ۔ آپ کوشش کریں کہ آپ کی خوراک میں روزانہ چھے سے سات سو گرام سبز پتوں والی سبزیاں شامل ہوں۔ چاہے آپ کچی کھالیں، چاہے تو سوپ بنالیں یا پھر سالن۔ انھیں کچی حالت میں کھانا سب سے بہتر ہے۔

یہاں پر ایک بات یاد رکھیں کہ آج کل سبزیوں پر کیڑے مار ادویات بہت زیادہ اسپرے کی جارہی ہیں جس کی وجہ سے ان دواؤں کے زہریلے اثرات ہمارے جسم میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے تدارک کے لیے آپ ان تمام سبزیوں کو آدھی بالٹی پانی میں تین کھانے کے چمچ میٹھا سوڈا ڈال کر آدھ گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر نکال کر صاف پانی سے دھولیں۔ اس طریقے سے سبزیوں اور پھلوں کو دھونے سے زہروں کا اثر کافی حد تک ختم ہوجاتا ہے۔

2۔ صحت مند چکنائیاں مثلاً مکھن، دیسی گھی، ناریل کا تیل، زیتوں کا تیل، دیسی سرسوں کا تیل، بکرے یا گائے کی چربی، اخروٹ، بادام اور السی کے بیج۔

آپ اپنے گھر سے ویجیٹیبل آئل فوری طور پر نکال دیں کیونکہ یہ ہمارے جسم میں سوزش (inflamation) پیدا کر کے بہت سی مہلک بیماریوں کا سبب بن رہے ہیں۔ سرسوں کا تیل ابھی ہمارے ملک میں عام مل جاتا ہے۔ آپ کسی بھی کولہو پر چلے جائیں اور اسے کہیں کہ آپ کے سامنے سرسوں کا تیل نکالے۔ سرسوں کے تیل میں ہلکی سی مہک ہوتی ہے جسے عام طور پر خواتین پسند نہیں کرتیں۔ اس مہک کو دور کرنے کے لیے آپ تیل کسی برتن میں ڈال کر گرم کریں اور اس میں ایک درمیانے سائز کا پیاز ڈال دیں جب پیاز تل کر

پکوڑا بن جائے تو چولہا بند کر دیں۔ تیل کے اُوپر آئی تلچھٹ ہٹا دیں اور ٹھنڈا ہونے پر بوتلوں میں ڈال کر رکھ لیں۔ یہ تیل زیادہ مہنگا بھی نہیں اور آپ کی صحت کا بہترین محافظ ہے۔

3۔ پروٹین: گائے کا گوشت، بکرے کا گوشت، دیسی مرغی، دریائی مچھلی، گائے اور بکرے کی کلیجی، دل، مغز، پائے اور ہڈیوں کی یخنی، دیسی یا اومیگا تھری انڈے۔

پوری دنیا میں غذائی ماہرین کلیجی، دل، مغز کو سپر فوڈ میں شمار کرتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن گائے کی کلیجی کی چھے سات بوٹیاں ضرور کھانی چاہیے۔ اسی طرح اگلے ہفتے دل، اس کے بعد مغز کو کھانا صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ گائے کی کلیجی اپنی افادیت کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔ کلیجی صاف کرنے کے لیے اس کی بوٹیاں بنالیں اور پانی سے دھو کر اسے تھوڑے سے دُودھ میں بھگو دیں۔ جب دُودھ کا رنگ گلابی ہو جائے تو دوبارہ پانی سے دھولیں اس طرح سے اس میں موجود تمام خون نکل جاتا ہے۔ کلیجی میں ہر طرح کے منرلز، وٹامنز، فولک ایسڈ، آئرن، زنک اور کاپر موجود ہوتا ہے۔

ہڈیوں کی یخنی کی افادیت سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ ہڈیوں میں کل وزن کا ساٹھ فیصد کیلشیم اور فاسفورس ہوتا ہے۔ باقی پانی اور کولاجن (Collagen) پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زنک، سیلیکون، کاپر، میگنیشیم وغیرہ کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ کولاجن ہمارے جسم کی ساخت میں بنیادی مادے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ہماری جلد جوان رہتی اور چہرے پر جھریاں نہیں پڑتیں۔ ماضی میں ہالی وڈ کی اداکارائیں اپنے آپ کو جوان رکھنے کے لیے اس کے ٹیکے لگواتی تھیں۔ روزانہ ایک کپ یخنی ناشتے میں اور ایک کپ شام کو پینے سے آپ کو کسی قسم کے ملٹی وٹامن لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یخنی بنانے کے لیے ایک حصہ گائے کی ہڈیاں لے کر اس میں تین حصے پانی ڈال لیں۔ حسب ذائقہ گلابی ہمالیائی نمک، تین سے چار چمچ سیب کا سرکہ، لہسن، ادرک اور پیاز شامل کر کے بہت ہلکی آنچ پر چوبیس گھنٹے پکنے دیں۔ یاد رکھیں کہ آپ نے پانی کو اُبلنے نہیں دینا بلکہ دم پر رکھنا ہے تاکہ ہڈیوں کے اندر سے تمام کارآمد اجزا یخنی میں شامل ہو جائیں۔ یخنی کو تیار ہونے کے بعد ٹھنڈا ہونے دیں اور فریج میں رکھ لیں اور حسب ضرورت استعمال کریں۔

ہم گھروں میں جو سفید نمک استعمال کرتے ہیں وہ صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ اس میں صرف سوڈیم کلورائیڈ ہوتا ہے جو بلڈ پریشر کا سبب بنتا ہے۔ آپ کھیوڑہ سے ملنے والا گلابی نمک استعمال کریں جو ڈھیلوں کی شکل میں عام مل جاتا ہے۔ اس میں پچھتر سے زائد صحت کے لیے مفید نمکیات ہوتے ہیں۔

سیب کا سرکہ بھی انسولین ریزسٹنس کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ روزانہ پانی میں ایک چمچ سرکہ ڈال کر پینا بہت مفید رہتا ہے۔ عام بیکریوں سے ملنے والا سفید سرکہ مصنوعی طور تیار کیا جاتا ہے اور بجائے فائدہ الٹا نقصان دیتا ہے۔ اس لیے خاکی رنگ کا سیب سے بنا سرکہ ہی استعمال کریں۔

Intermittent Fasting رفاقہ

ہم پچھلے صفحات میں یہ ذکر کر چکے کہ انسولین ریزسٹنس کی وجوہ میں سے ایک بار بار کھانا بھی ہے۔ ذیابیطس کے موجودہ طریقہ علاج میں معالج مریض کو تین کے بجائے چھے مرتبہ کھانا کھانے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے جو ادویات مریض لے رہا ہوتا ہے وہ خون میں شکر کی سطح ہر صورت کم کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے مریض کو تھوڑا تھوڑا مسلسل کھانا پڑتا ہے، بصورت دیگر گلوکوز کا لیول خطرناک حد تک گر کر موت کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اب اس طرح کھانے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہمارے خون میں پہلے گلوکوز کی سطح بڑھتی ہے، اسے کم کرنے کے لیے انسولین آتی ہے، پھر بھوک لگتی ہے، ہم دوبارہ کھاتے ہیں، دوبارہ گلوکوز بڑھتا ہے

جسے کم کرنے کے لیے انسولین کو اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مسلسل چکر ہمارے اندر چل رہا ہوتا ہے اور ہمارا جسم اسی کام میں لگا رہتا ہے۔

انسولین ریزسٹنس کے علاج کے لیے کاربوہائیڈریٹس والی غذائیں چھوڑنے کے بعد اگلا اہم کام، ہر وقت کھانے کی عادت ترک کرنا ہے۔ آپ کو دن میں صرف دو کھانے کھانے ہوں گے۔ صبح نو بجے ناشتہ اور پھر مغرب کی نماز سے پہلے یا فوراً بعد رات کا کھانا۔ اس کا شیڈول اس طرح سے بنانا ہوگا کہ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے دن کے ایسے ہوں گے جب آپ کھا سکتے ہیں۔ مثلاً صبح ناشتہ دس بجے کیا اور پھر رات کا کھانا شام چھے بجے کھا لیں۔ رات کے کھانے سے صبح ناشتے تک آپ کچھ نہیں کھائیں گے ماسوائے پانی اور سبز چائے۔ جب سولہ گھنٹے جسم کو خوراک کے ہضم کرنے کی مشقت سے آرام ملے گا تو جسم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے نظام بنائے گئے ہیں جو خودبخود بروئے کار آکر بدن میں ہونے والے زخموں کا علاج اور توڑ پھوڑ کی مرمت کرتے ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ آپ ہر صورت رات دس بجے سو جائیں اور صبح فجر کی نماز کے وقت اُٹھیں، نماز پڑھیں اور لمبی سیر کے لیے نکل جائیں۔ اگر آپ غور کریں تو قدرت کی طرف سے ہمیں ہر سال ایک مہینہ روزے لازمی رکھوا کر جسم کو توڑ پھوڑ کی مرمت کا موقع مہیا کیا جاتا ہے تاکہ باقی پورا سال ہم صحت مند زندگی گزار سکیں۔

آپ شروع میں اس عادت کو اپنانے کے لیے روزے بھی رکھ سکتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں روزہ تمام آسمانی مذاہب میں ایک انتہائی اہم عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

ورزش

ورزش نہ کرنا انسولین ریزسٹنس کی ایک اور بنیادی وجہ ہے۔ ذیابیطس سے نجات کے لیے کئی طرح کی ورزشیں آپ کر سکتے ہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ سب سے زیادہ گلوکوز ہمارے پٹھے استعمال کرتے ہیں۔ جسم میں جمع شدہ گلوکوز کو استعمال کرنے کے لیے سب سے بہترین ورزش ویٹ لفٹنگ ہے۔ آپ ڈمبل بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ صبح کی لمبی سیر اور رات کے کھانے کے بعد آدھ گھنٹہ چہل قدمی بے حد مفید ہے۔ میں نے صبح کی سیر اور رات کھانے کے بعد ٹہلنے کے ساتھ ایک ورزشی پروگرام کا انتخاب کیا تھا جسے رائل کینڈین ایئرفورس کے ماہرین نے پچیس سال کی عرق ریزی کے بعد تیار کیا۔ اس پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں آپ بتدریج آسان سے مشکل ورزشوں کی طرف جاتے ہیں اور آپ نے تمام ورزشیں مطلوبہ تعداد میں ہر صورت گیارہ منٹوں میں پوری کرنا ہوتی ہیں۔ اس پروگرام پر عمل کرنے کے لیے آپ کو کہیں جانے کی ضرورت ہے نہ ہی کسی قسم کے ورزش کرنے والے سامان کو خریدنا پڑتا ہے۔ آپ اپنے گھر، دفتر، اسکول کہیں بھی گیارہ منٹ نکالیں اور ورزش کر لیں۔ آپ انٹرنیٹ پر 5BX کے نام سے سرچ کر کے یہ پروگرام ڈاؤن لوڈ کر

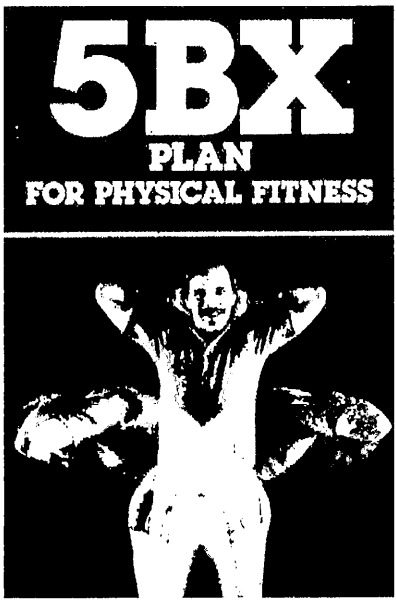

سکتے ہیں۔ اس پروگرام کا مقصد کم سے کم فٹنس کا حصول ہے جو عمر کے کسی بھی حصہ میں ضرور ہونی چاہیے۔

ذہنی دباؤ

ذہنی دباؤ کی حالت میں ہمارے گردوں کے اُوپر لگے دو غدود، جنہیں Adrenal کہا جاتا ہے، کا کام ایمرجنسی کی صورتحال میں جسم کو فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے یا تو اس صورتحال سے بھاگ کر اپنے آپ کو بچانا یا پھر مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ جسم میں اس ردِعمل کو پیدا کرنے کے لیے یہ غدود دو قسم کے ہارمون جسم میں داخل کرتے ہیں جنہیں Cortisol اور Adrenaline کہتے ہیں۔ جب یہ ہارمون خارج ہوتے ہیں تو خون میں گلوکوز کا لیول بڑھ جاتا ہے تاکہ جسم میں فوری ردِعمل دینے کی توانائی آ جائے۔ موجودہ طرزِ زندگی نے ہمیں مشین بنا دیا ہے اور ہم ہر وقت ذہنی دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خون میں شکر کی سطح بلند رہتی ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ اگر شادی نہیں ہوتی تب مسئلہ، ہو گئی تو مسئلہ، اولاد نہیں ہے تو پریشانی، اللہ نے دی ہے تو اس کو پالنے کی پریشانی، نوکری نہ ملے تب ذہنی دباؤ، مل جائے تو مسائل۔ کسی لمحے زندگی میں سکون نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذہنی دباؤ کم کرنے والی ادویات کی سالانہ فروخت کھربوں ڈالر تک پہنچ چکی ہے اور لوگ ان دوائیوں کے استعمال کی وجہ سے نشئی بنتے جا رہے ہیں جو ہیروئین اور شراب اور دیگر منشیات سے زیادہ خطرناک بن چکی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دوائیاں آپ بڑی آسانی سے کسی بھی میڈیکل اسٹور سے خرید سکتے ہیں۔

ذہنی دباؤ سے نکلنے کے لیے سب سے پہلے تو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنڈر کر دیں۔ مالک کی رضا میں راضی رہنا سیکھ لیں۔ اپنے معمولات سورج کے ساتھ ترتیب دیں۔ رات کو پوری نیند لیں۔ موبائل فون سونے سے قبل بند کر دیں اور اپنے پاس نہ رکھیں۔ یوگا کی ورزشیں کریں۔ نماز پڑھیں۔ گھر میں بزرگوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ کسی پسند کی پُرسکون جگہ پر ہفتہ میں ایک دن اکیلے جا کر مراقبہ کریں۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلیں۔ بغیر کسی دکھاوے کے چھوٹی چھوٹی نیکیاں کریں۔ پرانے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کریں۔ ایسے لوگوں سے دُور رہیں جو آپ کی زندگی میں زہر بھرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ٹی وی اور سوشل میڈیا پر سنسنی پھیلانے والے پروگراموں سے خود کو بچائیں کیونکہ اس میں جو مسائل بیان کیے جا رہے ہوتے ہیں ان کے حل کے لیے آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ ڈالر اُوپر جا رہا ہے، مہنگائی بڑھ رہی ہے، امریکی صدر کو کورونا ہو گیا ہے، ہمسایوں کے لڑکے نے بوڑھے باپ کو مارا ہے۔ ایسی خبریں خوامخواہ ذہنی دباؤ کا سبب بنتی ہیں۔

آخری بات

یاد رکھیے! ابھی تک پوری دنیا میں کسی بھی طریقۂ علاج میں ذیابیطس کی کوئی دوائی ایجاد نہیں ہو سکی۔ یہ مرض ہمیں اندر سے کھوکھلا کر کے عمر کا ایک ایک دن گھٹا رہا ہے۔ اس کے علاج کے لیے جو ادویات دی جاتی ہیں ان کے مضر اثرات بیماری سے بڑھ کر ہیں۔ مزید یہ کہ دوائی آپ نے موت کے دن تک کھانی ہے۔ آپ کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس پر خرچ ہو جاتا ہے۔ باوجود دوائی لینے کے ہر آنے والا دن آپ کی صحت پہلے سے زیادہ کمزور کرتا ہے۔

آیئے! اس گھن چکر سے نکلیے اور اپنے طرزِ زندگی کو بدلیے جو آپ کو صحت کے ساتھ زندگی کے بقیہ ایام گزارنے کے قابل بنائے۔ اپنے رزقِ حلال کو ادویہ ساز کمپنیوں، ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے مالکوں کی تجوریوں میں جانے سے بچائیں اور صحت بخش خوراک پر خرچ کریں۔

یقین جانیے، مجھے ایک نئی زندگی ملی ہے۔ میں آج شوگر کی بیماری کے چنگل سے نکل چکا ہوں۔ کوئی دوائی استعمال نہیں کرتا۔ ہر مہینے جو چھے سات ہزار روپے دوائیوں پر خرچ ہو رہے تھے وہ بچ گئے۔ جن سے میں اپنے اور اہلِ خانہ کے

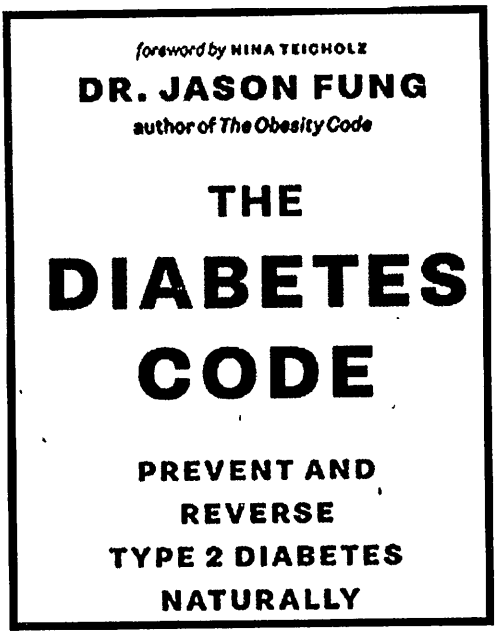

لیے صحت بخش خوراک خرید رہا ہوں۔

بیماری سے نجات کے لیے جو شیڈول میں نے اپنایا آپ کی آسانی کے لیے یہاں اُسے درج کر دیتا ہوں۔ آپ اپنی سہولت کے مطابق اس میں تبدیلی کر سکتے ہیں لیکن یاد رکھیے! جو بھی غذا آپ اپنے ناشتے اور رات کے کھانے میں شامل کریں گے اس میں کاربوہائیڈریٹس شامل نہیں ہوں گے۔ ورنہ اگر آپ نے روٹی، چاول اور دیگر چیزیں بھی کھائی ہیں تو پھر آپ کو فائدے کے بجائے سخت نقصان ہوگا۔

ہم اپنے جسم کی توانائی کی ضروریات گلوکوز کے بجائے کیٹون سے پوری کریں گے جو چکنائی سے بنتا ہے۔ اس غذا میں چکنائیوں کی مقدار ستر فیصد تک ہوتی ہے اس لیے اگر آپ ساتھ میں روٹی یا چاول کی شکل میں کاربوہائیڈریٹس لیں گے تو آپ کا جسم پہلے کاربوہائیڈریٹس استعمال کرے گا اور چکنائی استعمال نہ ہونے کی وجہ سے جسم میں ذخیرہ ہو کر موٹاپا پیدا کرے گی۔

دوسری اہم بات جیسے ہی آپ Low Carbs High Fats خوراک شروع کریں، فوراً ہی ذیابیطس کی ہر قسم کی دوائی لینا چھوڑ دیں کیونکہ اس غذا سے آپ کے جسم میں بہت کم مقدار میں گلوکوز بنتا ہے اگر آپ گلوکوز کم کرنے والی دوائی یا انسولین کا ٹیکہ لیں گے تو اس سے آپ کے خون میں خطرناک حد تک گلوکوز کم ہو جائے گا۔

ناشتا:

1۔ روزانہ خالی پیٹ ایک چمچ سیب کا سرکہ، حسب ذائقہ گلابی نمک، ایک چمچ تخم ملنگا، ایک چمچ لیموں کا رس دو گلاس پانی میں ڈال کر پئیں۔ کھٹاس کی وجہ سے دانت متاثر ہوتے ہیں لہٰذا آپ اس پانی کو پینے کے لیے اسٹرا استعمال کریں۔

2۔ دو دیسی یا اومیگا ۳ انڈے روزانہ

اومیگا ۳ انڈے بڑے اسٹوروں سے بآسانی مل جاتے ہیں۔ انڈوں کو آپ اُبال کر یا آملیٹ بنا کر استعمال کر سکتے ہیں۔

3۔ تین سو گرام سبز پتوں والی سبزیوں کا سلاد

سلاد میں آپ نمک، سرکہ، کالی مرچ، زیتون کا تیل ڈال لیں۔

4۔ ایک کپ ہڈیوں کی یخنی

رات کا کھانا

1۔ ایک سے دو چمچ السی کے بیج پانی کے ساتھ

2۔ ایک کپ ہڈیوں کی یخنی

3۔ تین سو گرام سبز پتوں والی سبزیوں کی سلاد

4۔ گوشت کا سالن جو دیسی گھی، مکھن یا سرسوں کے تیل میں پکا ہو۔ سالن پر زیتون کا تیل/دیسی گھی چار پانچ چمچ ڈال لیں۔ آپ ہفتے میں ایک دفعہ گائے کی کلیجی کا سالن بنا لیں، کبھی

قیمہ پکالیں، کبھی گائے کا دل، کبھی چربی والا گوشت

5۔ سبز چائے کا ایک کپ بغیر چینی، چائے کے ساتھ دس بارہ بادام کی گریاں اور دو تین اخروٹ روزانہ لے سکتے ہیں۔

آپ نے چوبیس گھنٹوں میں 25 گرام کاربوہائیڈریٹس کھانے ہیں جو آپ سبز پتوں والی چھے سات سو گرام سلاد سے حاصل کریں گے۔ اسی طرح چوبیس گھنٹوں میں 200 گرام پروٹین کی ضروریات گائے، بکرے، دریائی مچھلی یا دیسی مرغی کے گوشت سے پوری کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیں برائلر مرغی، فارمی انڈے اور فارمی مچھلی غذائی اعتبار سے بہت ناقص ہے۔ ان کی خریداری پر اپنا پیسہ ضائع نہ کریں۔ چوبیس گھنٹوں کی چکنائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے آپ کو 120 گرام چکنائی چاہیے جو آپ دیسی گھی، مکھن، زیتون کے تیل، سرسوں کے تیل، گوشت کی چربی، اخروٹ اور بادام سے پوری کریں گے۔ ایک کھانے کے چمچ تیل میں 14 گرام چکنائی ہوتی ہے۔ آپ اس کے مطابق اپنا حساب بنا سکتے ہیں۔ زیتون کے تیل میں کبھی کوئی چیز مت پکائیں بلکہ اسے کچا ہی سالن میں ڈال کر کھائیں اور جب بھی زیتون کا تیل خریدیں ہمیشہ Extra Virgin دیکھ کر لیں۔

ہفتے میں ایک دفعہ چوبیس گھنٹوں کا فاقہ کریں، مثلاً رات کا کھانا چھے بجے شام کھالیں اور اگلے دن ناشتہ نہ کریں۔ سارا دن صرف پانی پر گزاریں۔ شام کو دوبارہ کھانا کھائیں۔

پوری دنیا میں شہری آبادی خاص طور پر Metabolic Syndrome یعنی کھانے پینے کی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ جس میں شوگر، بلڈ پریشر، ہارٹ اٹیک، موٹاپا اور فالج سرفہرست ہیں۔ ان سے نجات کے لیے خود کو بھوکا رکھنا تاکہ جسم اپنے اندر ضروری مرمت کے کام سرانجام دے، بہت ضروری ہے۔

جسم کو ضروری افعال سرانجام دینے کے لیے درکار توانائی چکنائیوں سے حاصل ہو رہی ہوتی ہے اور چکنائی Ketones میں تبدیل ہو کر جسم کی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ اس لیے اُوپر بیان کی گئی غذا کو عرف عام میں Keto Diet بھی کہتے ہیں۔ آپ انٹرنیٹ پر سرچ کر کے اس حوالے سے مزید پڑھ سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں لوگ اس طریقے سے اپنا وزن کم کر رہے ہیں۔

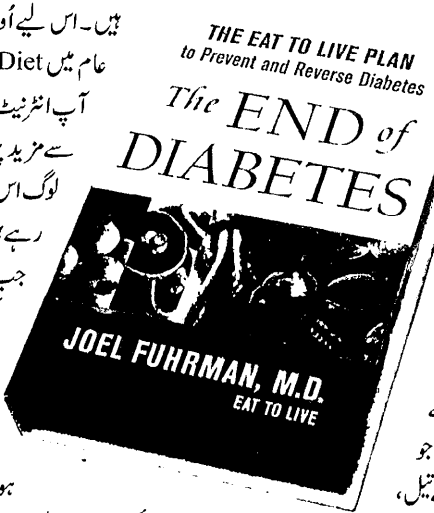

جب ہم طرزِ زندگی تبدیل کرتے ہیں تو شروع میں کچھ مشکلات پیش آتی ہیں۔ آپ کا جسم کاربوہائیڈریٹس کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔ جب آپ اپنا غذائی طریقہ بدلتے ہیں تو جسم ردِعمل دیتا ہے۔ کچھ لوگ سر درد کی شکایت کرتے ہیں، کچھ قبض کا شکار ہو جاتے ہیں، نقاہت محسوس ہوتی ہے، کبھی معدے سے بدبو آتی ہے، منہ خشک ہوتا ہے وغیرہ لیکن یہ سب عارضی کیفیات ہوتی ہیں جو ایک آدھ ہفتے میں ختم ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ہمیں بھوک نہیں ہوتی لیکن نفسیاتی طور پر ہم بھوک محسوس کرتے ہیں۔

اگر آپ تین چار لٹر پانی روزانہ پینے کی عادت بنالیں تو یہ علامات جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ لیموں کی نمکین سکنجبین بھی ان علامات کو ختم کر دیتی ہے۔ اکثر اوقات ہم چکنائی کی مطلوبہ

شوگر کی علامات

جلد پر کسی سخت دانے کا نمودار ہونا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھنا شروع ہو جائے۔ اس دانے کا رنگ گہرا پیلا یعنی زردی مائل یا لال بھی ہو سکتا ہے۔ دانے میں خارش کا بہت زیادہ ہونا اور طبیعت میں بے چینی کا بڑھ جانا۔ جسم کی جلد پر نسوں کا نمایاں طور پر ظاہر ہونا۔ جسم کی جلد کا رنگ زیادہ گہرا ہو جانا ذیابیطس کی علامت ظاہر کرتا ہے۔ ہاتھوں پیروں کی جلد کا اچانک سے سخت ہونا۔ گردن کی جلد میں سختی اور تناؤ بھی شوگر کی علامات میں سے ایک علامت تصور کی جاتی ہے۔ جسم کی جلد کا خشک ہو جانا۔ پنڈلیوں میں لکیر کی شکل میں نشان کا پڑ جانا۔ جسم پر کہیں کہیں لال رنگ کے دھبوں کا ظاہر ہونا۔ جسم پر ظاہر ہونے والے بھورے دھبے بھی شوگر کا ہونا ثابت کرتے ہیں۔ یہ ایسے دھبے ہوتے ہیں جو اکثر دانوں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ جلد پر ہونے والا انفیکشن بھی اکثر شوگر کے مرض کی علامت ظاہر کرتا ہے۔

مقدار نہیں کھا رہے ہوتے جس وجہ سے نقاہت ہوتی ہے۔ اگر جسم میں کمزوری محسوس کریں تو چکنائی کی مقدار بڑھا دیں۔

سبز پتوں کی سلاد آپ کو درکار وٹامن اور نمکیات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسے ہر صورت روزانہ کھائیں۔ وٹامن سی، جو ہماری قوت مدافعت کا سب سے اہم سپاہی ہے، کی کمی نہ ہونے دیں۔ جدید تحقیق کے مطابق امرود میں سب سے زیادہ وٹامن سی پایا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا امرود روزانہ ضرور کھائیں۔ باقی تمام پھلوں سے شروع کے تین ماہ پرہیز کریں کیونکہ ان میں کاربوہائیڈریٹس کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ اسی طرح دُودھ اور دہی بھی نہ لیں۔ دُودھ کے بجائے پنیر کھائیں تاکہ کیلشیم آپ کو ملتا رہے۔ اسی طرح دہی کو کسی ململ کے کپڑے میں تین چار گھنٹے لٹکا دیں۔ دہی میں موجود مٹھاس پانی کے ساتھ نکل جائے گی۔ اس دہی کو گریک یوگرٹ کہتے ہیں جو بڑے بڑے اسٹوروں پر کافی مہنگے داموں ملتی ہے۔ آپ ایک چمچ گریک یوگرٹ ایک جگ پانی میں ڈال کر لسی بنا کر پی سکتے ہیں۔ قوت مدافعت اور ہڈیوں کو مضبوط بنانے میں وٹامن ڈی کا بہت اہم کردار ہے۔ اس کا ذریعہ سورج کی روشنی ہے، مگر آج کل ہم دھوپ سینکنے کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہمارے اندر وٹامن ڈی کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کمی کو لازمی پورا کرنا چاہیے۔ جس کے لیے آپ وٹامن ڈی کے جیلی والے کیپسول یا ٹیکے 200000IU پہلے مہینے ہر ہفتہ کے بعد، دوسرے مہینے ہر پندرہ دن بعد اور پھر ہر ماہ ایک ٹیکہ یا کیپسول ضرور لیں۔ باقی تمام نمکیات اور وٹامن ہمیں سبز پتوں والی سبزیوں سے مل جاتے ہیں۔

میں نے ان صفحات پر کوئی کتابی باتیں نہیں لکھیں بلکہ بیماری سے نکلنے کی اپنی حقیقی رُوداد بیان کی ہے۔ میں ڈاکٹر خالد جمیل صاحب کا احسان مند ہوں جنہوں نے میری راہنمائی فرمائی۔ کئی ویڈیوز بھجوائیں، نئی کتابوں سے آگاہ کیا اور میرے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جواب دیے۔ آج کے دور میں علم پر کسی کی کوئی اجارہ داری نہیں۔ آپ کچھ وقت نکال کر انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے مرض، دوائیوں اور علامات کے بارے خود جان سکتے ہیں۔ دنیا کے چوٹی کے ماہرین نے اپنے اپنے یوٹیوب چینل بنا رکھے ہیں۔ ڈاکٹر خالد جمیل کے علاوہ ڈاکٹر ایرک برگ کی ویڈیوز بہت مفید ثابت ہوئیں۔ اس حوالے سے Dr. Jason Fung, کی کتاب The Diabetes Code اور Dr. Joel Fuhrman کی کتاب The End of Diabetes اپنے موضوع پر بہترین کتابیں ہیں۔

پہاڑوں کی لڑکی

کرشمہ علی

سرِ بہ فلک برف پوش پہاڑوں کی قدم بوسی کرتی سورج کی کرنیں جب میری کھڑکی کے کواڑوں پر دستک دیتیں تو فوراً میری آنکھ کھلی جاتی اور میں کھڑکی کے بند کواڑ کھولے گھنٹوں فطرت کے حسین مناظر دیکھ کر مبہوت ہوتی رہتی۔ صبح کی روشنی وادی کو سنہرے رنگ کی چادر اوڑھا دیتی تھی۔ روئی کے گالوں کے مانند اُڑتے بادل، تا حدِ نگاہ پھیلے سرسبز پہاڑی میدان، درختوں کے بلند و بالا جھنڈ اپنے اندر کئی صدیوں کی کہانیاں سموئے ہوئے تھے۔ ہر سو پرندوں کی چہکار، چشموں کا بہتا پانی، پھولوں کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے وادی کی مسحور کن خوبصورتی بیان کر رہے ہوتے تھے۔ ایسے سحر انگیز مناظر ہمیشہ ایک خوشگوار صبح اور نئی اُمید کا احساس دلاتے تھے۔

آٹھ سال کی عمر میں پگڈنڈیوں پر چلتے، بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں ہمیشہ سوچا کرتی تھی کہ ہمارے اطراف جو بہار کے نظارے ہیں، ان میں خزاں کا لبادہ اوڑھے زرد سوچ کب تبدیل ہو گی؟ یہاں لڑکیوں کا ایک مختلف خواب دیکھنا یا معاشرے کی توقعات کے برعکس کچھ کرنا مشکل کیوں ہے؟ کچھ شعبوں کی خواہش ہونے پر بھی خواتین اپنا نہیں سکتیں، عورتیں وہ کیوں نہیں کر سکتیں جو مرد کرتے ہیں؟ لڑکیوں میں بھی اتنی ہمت اور حوصلہ ہے کہ اگر انھیں اپنے خواب کی تکمیل کے لیے ایک موقع دیا جائے تو وہ خود کو منوا سکتی ہیں۔ یہ سوالات میرے اندر ہمیشہ کسی جوار بھاٹے کی مانند اُٹھتے رہتے تھے۔

صد شکر کہ میرے والد کی سوچ مختلف ہے، ورنہ یہ زنگ آلودہ خیالات میری حیات کو بھی کملا کے رکھ دیتے۔ ہمارے علاقے میں تو لڑکیوں کو اسکول تک نہیں بھیجا جاتا، انسانی حقوق کی تنظیم کے مطابق پاکستان میں پانچ لاکھ پرائمری عمر کے بچے اسکول جاتے ہی نہیں، جن میں بیشتر ''لڑکیاں'' ہیں۔

یہ میرے والد کی اعلیٰ سوچ ہی ہے کہ انھوں نے مجھے میری والدہ یا بہن کو کبھی کسی کام سے نہیں روکا اور عام مردوں کے برعکس مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کے ایماء پر ہی میں نے بزنس مینجمنٹ میں بیچلرز کی ڈگری حاصل کی۔

میرے والد کھیلوں کے بہت شوقین ہیں۔ ۲۰۰۶ء کے فیفا ورلڈ کپ میچ انھوں نے مجھے ساتھ بٹھا کر دکھائے۔ تب میرے اندر بھی فٹ بالر بننے کا جذبہ پیدا ہوا کہ میں بھی ان کی طرح میدان میں اُتروں، کھیلوں اور دوسروں سے کچھ الگ کروں لیکن بڑی رکاوٹ ایک تو ہمارے علاقے کی روایات اور دوسرا میرا لڑکی ذات ہونا تھا، مگر میرے والد اس شوق کے لیے علاقے کی روایات اور سوچ کے آگے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور مجھے اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھنے کا نادر موقع دیا۔ میں نے انھیں مایوس نہیں کیا۔

☆☆☆

یہ ہیں پاکستان کے علاقے چترال سے تعلق رکھنے والی ''کرشمہ علی'' جن کا دل اپنے لوگوں کی محبت سے لبریز ہے۔ جو پہاڑوں کے ان باسیوں کی ترقی اور سوچ کو بدلنے کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔

ابتدائی حالات

۲۳ سالہ کرشمہ علی وادیٔ چترال کے خوبصورت سیاحتی علاقہ کریم آباد سے تعلق رکھتی ہیں، جو سطحِ سمندر سے ۱۵۰۰ میٹر بلندی پر واقع ہے۔ یہاں وائی فائی اور بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہونے کے باوجود، وہ پہاڑوں کے ان باسیوں کی زندگی بدلنا چاہتی ہیں۔ ان کے لیے فٹبالر بننا، خود کو منوانا اور وطنِ عزیز کی بین الاقوامی سطح پر نمائندگی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

کرشمہ علی کو بچپن سے ہی فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں وہ گھر میں فٹ بال کھیلنے کا آغاز کر چکی تھیں۔ مزید برآں وہ اپنے اس شوق کی تسکین فیملی کے ساتھ پکنک پر جا کر کرتی تھیں، جہاں وہ اپنے والد اور کزنز کے ساتھ فٹ بال کھیلتی تھیں لیکن انھیں کبھی باقاعدہ طور پر ٹیم کے لیے کھیلنے کا موقع نہیں مل سکا اور نہ چترال میں ایسی کوئی سہولت میسر تھی۔ وقت نے یہ موقع تب فراہم کیا جب وہ اسلام آباد اسکول گئیں، تو ان کی فٹ بال میں دلچسپی اور سمجھ بوجھ کو دیکھتے ہوئے ایک ٹیم میں شامل کیا گیا۔

بین الاقوامی مقابلوں میں شمولیت

شب و روز محنت کے بعد ۱۵ سال کی عمر تک کرشمہ پروفیشنل فٹ بالر کے طور پر تربیت یافتہ ہو چکی تھیں۔ اب وہ اس قابل ہو گئی تھیں کہ کسی بڑے مقابلے میں شامل ہوں لیکن کوئی نادر موقع میسر نہیں تھا۔ ان کے اس خواب نے حقیقت کا روپ اُس وقت دھارا جب ایک یادگار دن وہ پہلی بار بین الاقوامی مقابلے کے لیے منتخب ہوئیں لیکن یہ انتخاب پاکستان فٹ بال فیڈریشن کے زیرِ اہتمام نہیں بلکہ ''جوبلی گیمز'' کے لیے تھا۔ ۲۰۱۶ء دبئی میں ''جوبلی گیمز'' کا انعقاد کیا گیا، جس میں اپنے فن کا لوہا منواتے ہوئے کرشمہ علی نے ''چاندی کا تمغہ'' حاصل کیا۔ اس کے بعد ۲۰۱۷ء میں ہونے والے ''آسٹریلین فٹ بال لیگ انٹرنیشنل کپ'' میں شرکت کرنے والی پہلی پاکستانی خواتین فٹ بال ٹیم کا حصہ بھی تھیں۔

اس کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں ''جب میں میدان یا پچ پر قدم رکھتی ہوں تو اپنی زندگی میں موجود تمام مسائل، ہر چیز بھول جاتی ہوں، توجہ ہوتی ہے تو صرف گیند پر، اپنی ٹیم کے ساتھیوں اور میدان پر، باقی کچھ بھی ذہن میں نہیں رہتا۔ یہ خوشی کی ایک مختلف قسم ہے۔ واقعی میں اس کو بیان نہیں کر سکتی''۔

خوفناک ردِعمل

جوبلی گیمز سے پہلے تک چترال کے باسیوں کو خاص خبر نہیں تھی کہ کرشمہ قومی اور بین الاقوامی طور پر بھی فٹ بال کھیلتی ہیں، کیونکہ ان کے والد نے کہا تھا کہ چترال کے لوگ آپ

کے بارے میں معلومات نہ ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ بنیادی وجہ وہاں کے لوگوں کی سوچ ہے۔ جب وہ اسلام آباد فٹ بال کھیلتی تھیں تو کچھ چترالی مردوں کو اس بارے معلوم ہوگیا۔ ان کی جانب سے انھیں دھمکیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ اگر انھوں نے یہ کھیل نہ چھوڑا تو واپس آنے پر انھیں قتل کر دیا جائے گا یا پھر ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔

۲۰۱۶ء کے جوبلی کھیلوں نے جب ''کرشمہ علی کو پہلی چترالی لڑکی جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر فٹ بال کھیلتی ہے'' کے طور پر سراہا، تب بھی اس ردِعمل میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی۔ اس وقت بھی سوشل میڈیا پر نفرت کا اظہار اور برے برے تبصرے کیے گئے۔ عین ممکن تھا کہ ۱۸ سال کی اس عمر میں وہ ڈر کر ہار مان جاتیں اور اپنے خواب سے دستبردار ہو جاتیں لیکن ان حالات میں کرشمہ کے والد شجرِ سایہ دار کی طرح آگے بڑھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کا حوصلہ بڑھایا اور لوگوں کی تنگ نظری کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی ہمت بندھائی۔ اس لیے کرشمہ کہتی ہیں کہ وہ آج اس مقام پر صرف اور صرف اپنے والد اور گھر والوں کی وجہ سے ہیں۔

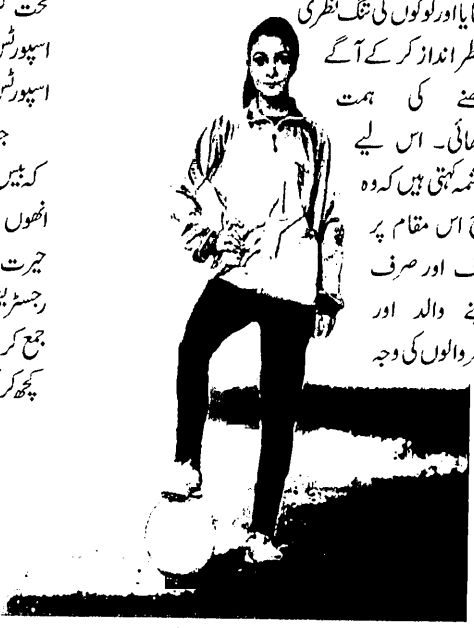

فٹ بال کلب کا قیام

مقابلوں میں شرکت کے بعد کرشمہ کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ اپنے علاقے کی خواتین کے لیے عملی طور پر کچھ کریں۔ ان نوجوان لڑکیوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر بااختیار بنائیں جو ہاؤس وائف نہیں بلکہ اپنی محنت کے بل بوتے پر ان کی طرح کچھ خاص کرنا چاہتی ہیں۔

چترال جیسے دُور افتادہ علاقے میں خواتین کی کھیلوں میں شمولیت عام نہیں تھی۔ کرشمہ کی خواہش تھی کہ چترال میں بھی خواتین کے لیے کوئی ادارہ یا کلب ہو جہاں سے وہ تربیت حاصل کر کے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نمائندگی کریں۔ وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح انھیں دوسرے شہروں میں جا کر تربیت حاصل کرنا پڑی، نئی آنے والی لڑکیوں کو ان مشکلات سے نہ گزرنا پڑے۔ یہی مقصد مدِنظر رکھ کر اپنی مدد آپ کے تحت کرشمہ علی نے ۲۰۱۸ء چترال میں ''چترال ویمن اسپورٹس کلب'' کی بنیاد رکھی، جو چترال میں خواتین کا پہلا اسپورٹس کلب ہے۔

جب کیمپ رجسٹریشن کا آغاز کیا گیا تو کرشمہ کا خیال تھا کہ بیس تیس سے زیادہ لڑکیاں کلب میں نہیں آئیں گی۔ پھر بھی انھوں نے تیس کے قریب فارم پرنٹ کروائے لیکن ان کی حیرت کی اس وقت انتہا ہوگئی جب بہت زیادہ لڑکیاں رجسٹریشن کے لیے آگئیں اور وہ خود سے فارم فوٹو کاپی کروا کر جمع کروانے لگیں۔ تب کرشمہ کو احساس ہوا کہ یہاں کی لڑکیاں کچھ کر دکھانے کے لیے کتنی پرعزم ہیں۔ اب ان کے کلب میں ٹوٹل ۷۰ خواتین ہیں جن میں ۶۰ لڑکیاں ممبران ہیں۔ انھیں فٹ بال اور دیگر کھیلوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ کرشمہ اپنے گاؤں میں ایک ٹورنامنٹ بھی منعقد کروا چکی ہیں، جس میں شمولیت کے لیے لڑکیاں چار گھنٹے پیدل چل کر آتی تھیں۔ مقابلے

کے بعد ان کو شیلڈیں اور اسناد بھی دی گئیں۔

کووڈ 19 وبائی مرض کے دوران یہ کلب بند کر دیا گیا تاکہ کسی قسم کی بے احتیاطی سنگین صورتحال سے دوچار نہ کر دے۔ اسے اب حالات میں بہتری کے بعد پھر سے کھول دیا گیا ہے۔ کرشمہ کی کوشش ہے کہ وہ اسلام آباد اور دیگر شہروں میں بھی فٹ بال کلب کی کھلاڑیوں کے ساتھ تربیتی کیمپ کا آغاز کریں تاکہ وہ چترال آ کر لڑکیوں کو فٹ بال کھیلنے کی تربیت دے سکیں۔ اس طرح ان کو سیکھنے کے زیادہ بہتر مواقع میسر آئیں گے۔ کرشمہ کا کہنا ہے:

''اب سے دس سال بعد میں اپنے جیسی کم سے کم ۱۰ سے ۲۰ ایسی لڑکیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جو اپنے خوابوں کی تسخیر کے بعد واپس یہاں آ کر دوسروں کے لیے کام کریں گی''۔

میلان فیشن ویک

ہر وقت اپنے علاقے کی خواتین کے لیے کوشاں رہنے والی اس پرعزم لڑکی نے چترال میں دستکاری سنٹر بھی قائم کیا۔ کرشمہ کا مقصد تھا کہ وہ خواتین جو اپنے گھر کی مالی معاونت کرنا چاہتی ہیں یا جنہیں کہیں باہر جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں، وہ بآسانی اپنے ہی علاقے میں رہتے ہوئے کام کر کے پیسے کما سکیں۔ چترال کی کڑھائی بہت مشہور اور منفرد ہے لیکن یہاں رہ کر یہ کڑھائی اچھے داموں فروخت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کرشمہ علی نے یہاں کی کڑھائی کو میلان فیشن ویک میں متعارف کروایا۔

۲۰۱۹ء میں اطالوی ڈیزائنر اسٹیلا جین نے اقوام متحدہ کے اسٹریٹجک ترقیاتی اہداف کو فروغ دینے اور دیہی علاقوں کی خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے مختلف ممالک کا دورہ کیا جن میں سے پاکستان ایک ہے۔ پاکستان میں، جین کی ملاقات کرشمہ علی سے ہوئی۔ یوں جین نے چترالی خواتین کے ساتھ مل کر ڈیزائن تیار کرنے کے لیے، چترال اور کیلاش کے علاقے سے روایتی کڑھائی کا استعمال کیا۔ جین نے وادی کیلاش کا بھی سفر کیا، جہاں اس نے دستکاری سنٹر کی خواتین سے ملاقات کی۔ سنٹر کی اڑتالیس خواتین نے ۴۰۰ میٹر کڑھائی تیار کی، جسے جین نے اپنے ملبوسات کی کلیکشن میں استعمال کیا۔

یوں کرشمہ علی اطالوی ڈیزائنر کے تعاون سے چترال کی کڑھائی کو دنیا بھر میں متعارف کروانے میں کامیاب ہوئیں اور شو میں انھوں نے جین کے ساتھ کیٹ واک بھی کی۔ اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے، ان کا کہنا ہے کہ ''پہاڑوں کی ایک لڑکی کا میلان فیشن ویک میں شامل ہونا کسی خواب سے کم نہیں اور اس کے لیے وہ اسٹیلا جین کی تہ دل سے مشکور ہیں''۔

دستکاری سنٹر اور میلان فیشن ویک میں شامل ہونے کے سبب کرشمہ کی ملاقات گزشتہ سال برطانوی شہزادے پرنس ولیم اور شہزادی کیٹ مڈلٹن سے بھی ہوئی، جنہوں نے اس نوجوان باہمت پاکستانی خاتون کھلاڑی کی کوششوں کو خوب سراہا۔

بین الاقوامی پزیرائی

سال ۲۰۱۹ء میں بین الاقوامی جریدے ''فوربز تھرٹی انڈر تھرٹی'' نے کرشمہ علی کو ایشیاء کی ٹاپ تھرٹی اسپورٹس اور انٹرٹینمنٹ کی انڈر تھرٹی شخصیات کی فہرست میں بھی شامل کیا۔ کرشمہ اپنے علاقے کی وہ پہلی لڑکی ہے جس نے قومی سطح کے مقابلوں کے بعد بین الاقوامی فٹبال مقابلوں میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی، نیز انھوں نے چترال میں ویمن اسپورٹس کلب اور دستکاری سنٹر کی بنیاد بھی رکھی۔ اتنی کم عمری میں یہ گراں قدر خدمات فوربز میں شمولیت کا سبب بنیں۔

کرشمہ اس اعزاز کو حاصل کرنے پر بہت مسرور ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

''آہستہ آہستہ لوگوں کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ لڑکیوں کو معمولی سمجھے بغیر ایک موقع فراہم کیا جائے، تو نہ صرف وہ اپنا

بلکہ ملک وقوم کا نام بھی روشن کرسکتی ہیں۔ مزید برآں میں یہاں ایک ترقی پسند معاشرے کو اُبھرتا ہوا دیکھ رہی ہوں جہاں مرد اور خواتین یکساں طور پر کام کریں گے۔ جہاں خواتین کو روایتی رسم ورواج کے دباؤ میں آئے بغیر اپنی مرضی سے کام کرنے کی شخصی آزادی ہوگی اور اس ساری تبدیلی کا ایک حصہ میں بھی ہوں۔ میں قیادت کی پوزیشنوں پر زیادہ سے زیادہ خواتین کو دیکھنا چاہتی ہوں، تاکہ پھر وہ آرام سے بیٹھ کر اس سے لطف بھی اُٹھائیں اور میں یہی چاہتی ہوں کہ اسی کے لیے وہ لڑیں"۔

فلاحی خدمات

حالیہ کرونا وائرس لاک ڈاون کے دوران جب معمولات زندگی مفلوج ہوکر رہ گئے تھے تو ان حالات میں اپنے لوگوں کا دکھ درد محسوس کرتے ہوئے کرشمہ علی نے جانفشانی سے کام کیا۔ وہ اپنے والد اور کبھی چچا کے ساتھ گھنٹوں، اُونچے نیچے اور پُرپیچ پہاڑی علاقوں کا سفر کرکے مقامی اسپتالوں اور غریب دیہاتیوں کو ضروری سامان زندگی فراہم کرنے جاتی رہیں۔ ان تمام چیزوں کے لیے امدادی رقم انھوں نے سوشل میڈیا کے ذریعے جمع کی تھی۔

اگست کے مہینے تک انھوں نے تین سو خاندانوں میں راشن تقسیم کیا کیونکہ ان میں بہت سے افراد پاکستان کے مختلف شہروں میں دہاڑی دار مزدور کے طور پر کام کرتے تھے اور جب کووڈ ۱۹ کے سبب بہت ساری صنعتیں اور کاروبار بند ہوئے، تو انھیں واپس لوٹنا پڑا، جس کے نتیجے میں ان خاندانوں میں فاقوں کی نوبت آگئی تھی جن کی کرشمہ اور ان کے ساتھیوں نے مسلسل امداد کی اور ضروری سامان کی فراہمی یقینی بنانے کے لیے کوششیں کیں۔

مزید برآں ۱۱۵۵ این 95 ماسک، ۵۳ عینکیں، ۲۵۰ پی پی آئی سوٹ، ۶۵۰ سرجیکل ماسک، ۴۰۰ سرجیکل دستانے اور ۷۶ فیس شیلڈز ڈی ایچ کیو ہسپتال چترال کو عطیہ بھی کیں۔

کرشمہ علی جیسی نوجوان اور پُرعزم خواتین اپنی خدمات کے باعث نہ صرف علاقائی بلکہ حکومتی سطح پر بھی حوصلہ افزائی و تعریف کی حقدار ہیں کیونکہ کسی خاتون کا دُور دراز اور بنیادی سہولیات سے نابلد علاقے سے نکل کر اپنے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینا اور دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بننا باعثِ ستائش و توقیر ہے۔ ان پر پوری قوم کو فخر ہے۔

◆◆◆

چترال ایک چھوٹا سا شہر یا علاقہ ہے جو ضلع چترال کے اندر واقع ہے۔ یہ پاکستان کے انتہائی شمالی کونے پر ضلع ترچ میر کے دامن میں واقع ہے جو سلسلہ کوہ ہندوکش کی بلند ترین چوٹی ہے اور اسے وسط ایشیا کے ممالک سے جدا کرتی ہے۔ ریاست کے اس حصے کو بعد میں ضلع کا درجہ دیا گیا اور صوبہ خیبر پختونخوا کے مالاکنڈ ڈویژن سے منسلک کیا گیا۔ اپنے منفرد جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے اس ضلع کا رابطہ ملک کے دیگر علاقوں سے تقریباً پانچ مہینے تک منقطع رہتا ہے۔ اپنی مخصوص پُرکشش ثقافت اور پُراسرار ماضی کے حوالے سے ملفوف چترال کی جُداگانہ حیثیت نے سیاحت کے نقطۂ نظر سے بھی کافی اہمیت اختیار کرلی۔ اپنی مخصوص جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے چترال کی اہمیّت میں مزید اضافہ ہوا۔ موجودہ دور میں وسطی ایشیائی مسلم ممالک کی آزادی نے اس کی اہمیت کو کافی اُجاگر کیا۔

کیوں نگری نگری پھرا مسافر؟

ڈاکٹر انیس الرحمن

جب قدریں بے قدر ہو جائیں تو قومیں ذلیل و خوار اور قعرِ مذلت میں گر کر نیست و نابود ہو جاتی ہیں

(آٹھویں قسط)

ترکی کا یہ تیسرا دورہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پچھلے دو دوروں سے مختلف تھا۔ پچھلے دونوں دوروں میں میری توجہ صرف استنبول، برسا اور ان کے گردونواح کے علاقوں پر مرکوز رہی تھی۔ اس تیسرے دورے میں مجھے دو نئے شہروں کے علاوہ، دو صوبوں اور ان کی قدیم بستیوں کی سیاحت کا بھی موقع ملا۔

ترکی جغرافیائی، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے سات بڑے خطوں میں منقسم ہے۔ جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مارمرا ریجن (Marmara Region)

۲۔ بحرِ اسود ریجن (Black Sea Region)

۳۔ ایجین ریجن (Aegean Region)

۴۔ بحیرۂ روم ریجن (Mediterranean Region)

۵۔ مرکزی اناطولین ریجن (Central Anatolian Region)

۶۔ مشرقی اناطولین ریجن (Eastern Anatolian Region)

۷۔ جنوب مشرقی اناطولین ریجن (South-Eastern Anatolian Region)

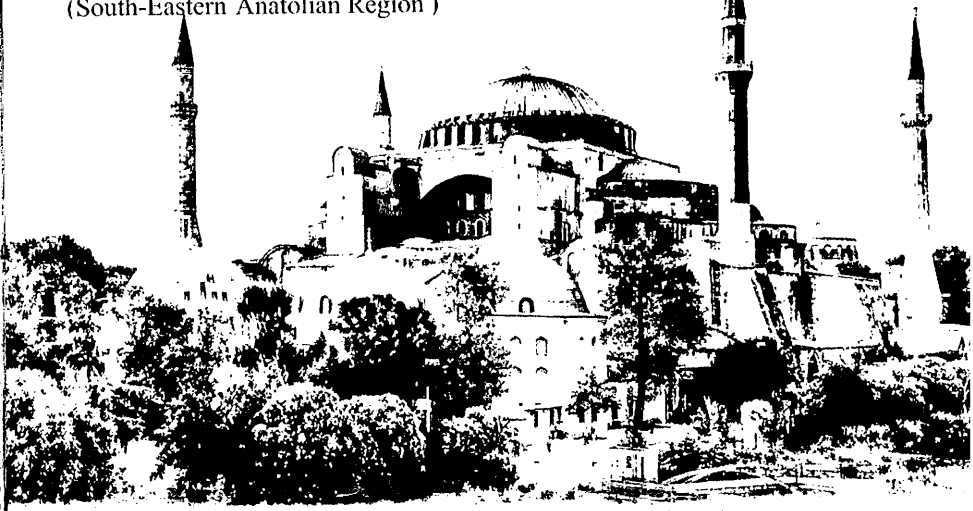

ترکی کی بے مثال خوبصورتی

انتظامی اور سیاسی اعتبار سے ترکی 81 صوبوں میں منقسم ہے۔ صوبے اور اِن کے مرکزی شہر ہم نام ہیں۔ مثلاً برسا شہر، برسا کے صوبہ میں واقع ہے۔ اِسی طرح استنبول کا شہر استنبول کے صوبہ میں واقع ہے۔ صرف تین صوبے ایسے ہیں جن کے مرکزی شہروں کے نام صوبوں کے نام سے مختلف ہیں۔ مثلاً انطاکیہ کا شہر ہاتے (Hatay) صوبہ میں واقع ہے اور ازمٹ (Izmit) کا شہر کوکیلی (Kocaley) صوبے میں واقع ہے۔

انطاکیہ شہر

ایک بات جو ترکی میں بہت اچھی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ وہاں بڑے بڑے سات جغرافیائی اور معاشرتی خطوں کو انتظامی صوبے بنانے کی بجائے ترکی کو 81 انتظامی صوبوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ اِس طرح وہاں کے باشندوں کو اپنے کام کاج کروانے اور اِنصاف کی فراہمی کے لیے دور دراز کے شہروں کا سفر نہیں کرنا پڑتا اور صوبائیت کے تفرقہ میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ اِس کے برعکس پاکستان میں بڑے بڑے سیاسی بنیاد پر قائم کیے ہوئے صوبوں کی وجہ سے پاکستانی قوم پنجابی، پٹھان، بلوچی اور سندھی فرقوں میں بٹ گئی ہے اور صوبائی رقابت اور تعصب کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ ترکی کی مثال کافی سبق آموز ہے۔ اگرچہ ترکی رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے کم ہے۔ پاکستان کا رقبہ 340,509 مربع میل اور آبادی 204 ملیّن ہے (2019ء) جبکہ ترکی کا رقبہ 303,224 مربع میل اور آبادی صرف 82.6 ملیّن ہے (2019ء)، لیکن ترکی میں 81 صوبے ہیں اور پاکستان میں صرف چار بڑے بڑے صوبے ہیں۔

پاکستان میں جغرافیائی طور پر سیاسی خطوں اور انتظامی صوبوں کی یکجائی قومیت کے انحطاط اور فرقہ وارانہ تعصب کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بڑے بڑے صوبوں کی مرکزیت ختم کر کے مقامی انتظامی اداروں کو اختیارات سونپ دیے جائیں تاکہ لوگوں کو اِن کی دہلیز پر انصاف میسر ہو سکتا اور اِن کے مسائل حل ہو سکتے۔

دراصل انگریزوں سے چھٹکارہ پانے کے بعد پاکستان میں لوگوں کی صحیح طور پر حکومت آئی ہی نہیں۔ اِس نام نہاد

آزادی کے بعد وڈیروں، جاگیرداروں، فوجی آمروں اور اَفسرانِ شاہی نے حکومت کی جس کی وجہ سے ادارے انتشار کا شکار ہو کر معذور ہوئے۔ سیاست دانوں نے خادموں کے بجائے مخدوموں کا روپ دھارا اَور خودغرضی، خودنفسی اور خودستائی کا وطیرہ اختیار کر کے ناجائز کمائی سے پاکستان اور بیرونِ پاکستان بے شمار قیمتی گھر بنائے۔ اپنے نالائق عزیز و اقارب اور بے ہنر دوستوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے گدی نشینی کی راہ ہموار کی۔ افسرانِ شاہی نے بے اصولی، بے ایمانی اور بے ضمیری کا لبادہ اَوڑھ لیا۔ محکمۂ انسدادِ رشوت ستانی راشی بن گیا اور بعض منصف ملزموں کے مرہونِ منت ہونے کے باعث اُن کی پاسداری کرنے لگے۔ جب ایسی صورتِ حال ہو جائے، تو انسانیت سوز نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قدریں بے قدر ہو جاتیں اور قومیں ذلیل و خوار ہو کر قعرِ مذلت میں گر کر نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ تاریخ میں اس کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔

ترکی کے اس تیسرے دورے میں انطالیہ میں منعقد ہوئی کانفرنس بہت معلوماتی اور خوش گوار رہی۔ انطالیہ کا شہر ترکی کے جنوب میں بحیرہ روم کے ساحل پر واقع اور انطالیہ صوبہ کا دارالحکومت بھی ہے۔ یہ ترکی کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ بحیرۂ روم کے نیلگوں ساحل اور گردونواح میں بکھرے ہوئے آثارِ قدیمہ کے باعث یہاں ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں۔

انطالیہ ایک تاریخی شہر ہے۔ 200 صدی قبل مسیح میں اِس کی بنیاد پرگامون (Pergamon) قبیلہ نے ڈالی۔ اِس پر مختلف حکمرانوں کا تسلط رہا۔ رومن حکمرانوں کے دَور میں اس شہر کی بڑی تیزی سے نشوونما ہوئی۔ اِس کے بعد یہ سلجوق سلطانوں کے قبضہ میں آیا۔ بعد ازاں خلافتِ عثمانیہ کے دور میں 500 سال تک اس کی نشوونما ہوتی رہی۔ عالمی جنگِ اوّل کے بعد یہ پھر اٹلی کے تسلط میں چلا گیا، لیکن بعد میں ترکی کی جنگِ آزادی میں ترکی نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔

ڈاکٹر انیس الرحمن

اگرچہ یہاں ہیلنسٹک (Hellenistic) دور کے آثارِ قدیمہ بھی پائے جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر آرکیٹکچر سلجوق دور کا ہے۔ یہاں مدارس، عجائب گھر، مساجد، کارواں سرائے، ترکش حمام اور مقبروں کے باعث یہ شہر ترکش اسلامی شہر لگتا ہے۔ ترکش حکومت نے عثمانیہ دور کے قدیم انطالیہ کو بحال کرنے کی کوشش کی ہے۔

کانفرنس کے منتظم پروفیسر کیلیز نے ہمیں عثمانی دور کے قدیم شہر انطالیہ کی سیر کرائی۔ یہ حصّہ بحیرۂ روم کے کنارے نیم دائری پرانی بندرگاہ پر واقع ہے۔ اِس کا نظارہ کرنے کے لیے انطالیہ کے ایک پہاڑی علاقہ میں سمندر کے کنارے ایک کشادہ چبوترہ بنا ہوا ہے جس پر سمندر کے رُخ پر جنگلے لگے ہوئے ہیں۔ چبوترے پر بیٹھنے کے لیے بینچ رکھے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ کھانے پینے اور تحائف کی دُکانیں ہیں۔ یہاں سیاح کافی تعداد میں آتے اور پرانی بندرگاہ اور پرانے انطالیہ کا نظارہ کرنے کے لیے بڑی دیر تک جنگلے سے لگے کھڑے رہتے ہیں۔ اِس نیم دائری بندرگاہ کا پانی نیلگوں اور

ترکی کی بے مثال خوبصورتی

انتظامی اور سیاسی اعتبار سے ترکی 81 صوبوں میں منقسم ہے۔ صوبے اور اِن کے مرکزی شہر ہم نام ہیں۔ مثلاً برسا شہر، برسا کے صوبہ میں واقع ہے۔ اِسی طرح استنبول کا شہر استنبول کے صوبہ میں واقع ہے۔ صرف تین صوبے ایسے ہیں جن کے مرکزی شہروں کے نام صوبوں کے نام سے مختلف ہیں۔ مثلاً انطاکیہ کا شہر ہاتے (Hatay) صوبہ میں واقع ہے اور ازمٹ (Izmit) کا شہر کوکیلی (Kocaley) صوبے میں واقع ہے۔

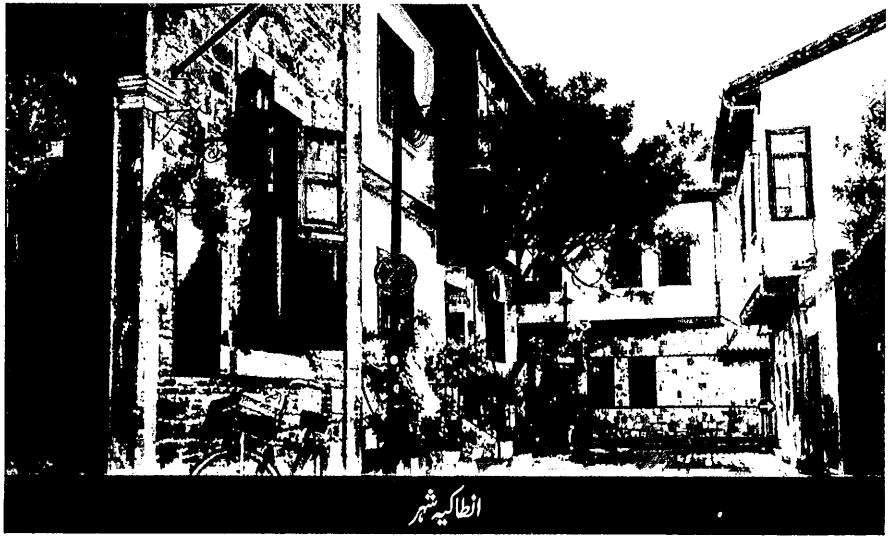

انطاکیہ شہر

ایک بات جو ترکی میں بہت اچھی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ وہاں بڑے بڑے سات جغرافیائی اور معاشرتی خطوں کو انتظامی صوبے بنانے کی بجائے ترکی کو 81 انتظامی صوبوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح وہاں کے باشندوں کو اپنے کام کاج کروانے اور اِنصاف کی فراہمی کے لیے دور دراز کے شہروں کا سفر نہیں کرنا پڑتا اور صوبائیت کے تفرقہ میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ اِس کے برعکس پاکستان میں بڑے بڑے سیاسی بنیاد پر قائم کیے ہوئے صوبوں کی وجہ سے پاکستانی قوم پنجابی، پٹھان، بلوچی اور سندھی فرقوں میں بٹ گئی ہے اور صوبائی رقابت اور تعصب کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ ترکی کی مثال کافی سبق آموز ہے۔ اگرچہ ترکی رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے کم ہے۔ پاکستان کا رقبہ 340,509 مربع میل اور آبادی 204 ملین ہے (2019ء) جبکہ ترکی کا رقبہ 303,224 مربع میل اور آبادی صرف 82.6 ملین ہے (2019ء)، لیکن ترکی میں 81 صوبے ہیں اور پاکستان میں صرف چار بڑے بڑے صوبے ہیں۔

پاکستان میں جغرافیائی طور پر سیاسی خطوں اور انتظامی صوبوں کی یکجائی قومیت کے انحطاط اور فرقہ وارانہ تعصب کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بڑے بڑے صوبوں کی مرکزیت ختم کر کے مقامی انتظامی اداروں کو اختیارات سونپ دینے چاہئیں تھے تاکہ لوگوں کو اِن کی دہلیز پر انصاف میسر ہو سکتا اور اِن کے مسائل حل ہو سکتے۔

دراصل انگریزوں سے چھٹکارہ پانے کے بعد پاکستان میں لوگوں کی صحیح طور پر حکومت آئی ہی نہیں۔ اِس نام نہاد

آزادی کے بعد وڈیروں، جاگیرداروں، فوجی آمروں اور اَفسرانِ شاہی نے حکومت کی جس کی وجہ سے ادارے انتشار کا شکار ہو کر معذور ہوئے۔ سیاست دانوں نے خادموں کے بجائے مخدوموں کا روپ دھارا اَور خودغرضی، خودنفسی اور خودستائی کا وطیرہ اختیار کر کے ناجائز کمائی سے پاکستان اور بیرونِ پاکستان بے شمار قیمتی گھر بنائے۔ اپنے نالائق عزیز و اقارب اور بے ہنر دوستوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے گدی نشینی کی راہ ہموار کی۔ افسرانِ شاہی نے بے اصولی، بے ایمانی اور بے ضمیری کا لبادہ اَوڑھ لیا۔ محکمۂ انسدادِ رشوت ستانی راشی بن گیا اور بعض منصف ملزموں کے مرہونِ منت ہونے کے باعث اُن کی پاسداری کرنے لگے۔ جب ایسی صورتِ حال ہو جائے، تو انسانیت سوز نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قدریں بے قدر ہو جاتیں اور قومیں ذلیل و خوار ہو کر قعرِ مذلت میں گر کر نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ تاریخ میں اس کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔

ترکی کے اس تیسرے دورے میں انطالیہ میں منعقد ہوئی کانفرنس بہت معلوماتی اور خوش گوار رہی۔ انطالیہ کا شہر ترکی کے جنوب میں بحیرہ روم کے ساحل پر واقع اور انطالیہ صوبہ کا دارالحکومت بھی ہے۔ یہ ترکی کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ بحیرۂ روم کے نیلگوں ساحل اور گردونواح میں بکھرے ہوئے آثارِ قدیمہ کے باعث یہاں ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں۔

انطالیہ ایک تاریخی شہر ہے۔ 200 صدی قبل مسیح میں اس کی بنیاد پرگامون (Pergamon) قبیلہ نے ڈالی۔ اس پر مختلف حکمرانوں کا تسلط رہا۔ رومن حکمرانوں کے دَور میں اس شہر کی بڑی تیزی سے نشوونما ہوئی۔ اِس کے بعد یہ سلجوق سلطانوں کے قبضہ میں آیا۔ بعد ازاں خلافتِ عثمانیہ کے دور میں 500 سال تک اِس کی نشوونما ہوتی رہی۔ عالمی جنگِ اوّل کے بعد یہ پھر اٹلی کے تسلط میں چلا گیا، لیکن بعد میں ترکی کی جنگِ آزادی میں ترکی نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔

ڈاکٹر انیس الرحمن

اگرچہ یہاں ہیلنسٹک (Hellenistic) دور کے آثارِ قدیمہ بھی پائے جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر آرکیٹکچر سلجوق دور کا ہے۔ یہاں مدارس، عجائب گھر، مساجد، کارواں سرائے، ترکش حمام اور مقبروں کے باعث یہ شہر ترکش اسلامی شہر لگتا ہے۔ ترکش حکومت نے عثمانیہ دور کے قدیم انطالیہ کو بحال کرنے کی کوشش کی ہے۔

کانفرنس کے منتظم پروفیسر کیلیز نے ہمیں عثمانی دور کے قدیم شہر انطالیہ کی سیر کرائی۔ یہ حصّہ بحیرۂ روم کے کنارے نیم دائری پرانی بندرگاہ پر واقع ہے۔ اِس کا نظارہ کرنے کے لیے انطالیہ کے ایک پہاڑی علاقہ میں سمندر کے کنارے ایک کشادہ چبوترہ بنا ہوا ہے جس پر سمندر کے رُخ پر جنگلے لگے ہوئے ہیں۔ چبوترے پر بیٹھنے کے لیے بینچ رکھے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ کھانے پینے اور تحائف کی دُکانیں ہیں۔ یہاں سیاح کافی تعداد میں آتے اور پرانی بندرگاہ اور پرانے انطالیہ کا نظارہ کرنے کے لیے بڑی دیر تک جنگلے سے لگے کھڑے رہتے ہیں۔ اِس نیم دائری بندرگاہ کا پانی نیلگوں اور

بے حد شفاف ہے۔ اِس کے گرد انطالیہ کا پرانا شہر آباد ہے۔ ایک کونہ پر ایک پرانا محفوظ کیا ہوا گرجا ہے۔ پرانے شہر کی پتھریلی گلیاں، ساحلِ سمندر کی طرف کھلتی ہیں۔ اِس شہر کے گرد شاید کبھی دیوار ہوتی ہوگی جو اَب مسمار ہو چکی ہے۔ البتہ اِس نیم دائرہ بندرگاہ کے آخری کونے میں ایک محلہ کے گرد دِیواروں اور دَروازوں کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ محلہ شہر کے متمول یہودیوں کا تھا جس کے دروازے رات کو بند اور صبح کو کھول دیے جاتے تھے۔ ہم لوگوں نے اِس منظر گاہ میں کافی وقت صَرف کیا۔

قدیم انطالیہ شہر کی سیر کے علاوہ، پرفیسر کیلیز نے ہماری دعوتوں اور صوبہ انطالیہ کے مغرب میں ساحلِ سمندر پر واقع دو تاریخی شہروں کے آثارِ قدیمہ دیکھنے کے لیے ایک دن مختص کیا۔ کانفرنس کے دوران مندوبین کو صوبہ انطالیہ کے گورنر، شہر کے میئر، آرکیٹیکس کے چیمبر کے صدر اور انطالیہ میں سکونت پذیر سابق وزیر اُمورِ خارجہ نے چائے، کھانوں اور گارڈن پارٹیز پر مدعو کیا۔

ایک دن ہم لوگوں کو ملیٹس (Miletus) کے آثارِ قدیمہ دکھانے کے لیے چھوٹی بسوں کا انتظام کیا گیا۔ یہ آثارِ قدیمہ، انطالیہ کے مغرب میں تقریباً 267 میل کے فاصلہ پر آئدین (Aydin) کے صوبہ میں واقع ہیں۔ یہ شہر کبھی یونان کی بہت بڑی تجارتی منڈی اور بندرگاہ ہوتا تھا اور دریائے مندریس (Mendres) کے دہانے پر واقع تھا۔ 1400 سال قبل مسیح تک یہ ایک بہت بڑا شہر بن چکا تھا۔ یہاں سینٹ پال (St. Paul) عیسائیت کا پرچار کرنے آیا کرتا تھا۔ یہاں کئی نابغہ روزگار قسم کے لوگ پیدا ہوئے جن میں ہپوڈیمس (Hippodamus) نے یورپ کے سب سے بڑے ٹاؤن پلانر کے طور پر شہرت پائی اور تاریخ میں ''ہپوڈیمس آف ملیٹس'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اسکندرِ اعظم نے جب مصر فتح کرنے کے بعد اسکندریہ کی بنیاد ڈالی، تو اِس کا نقشہ ہپوڈیمس سے ہی بنوایا۔

اپنی ٹاؤن پلاننگ کی تعلیم کے دوران جب مَیں نے ملیٹس شہر کے متعلق پڑھا تھا، اُس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن مَیں اِس شہر کے گلی، کوچوں اور بازاروں کے کھنڈرات میں چہل قدمی کر رہا ہوں گا اور اِس کے عظیم اسپورٹس اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پر سینڈوچ کھاتے ہوئے سوچ رہا ہوں گا کہ کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی۔

اپولو مندر

ملیٹس کے بعد ہمیں افیسس (Ephesus) شہر کے آثارِ قدیمہ دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ملیٹس سے نکل کر اس کے مضافات میں کوئی دس میل کے فاصلہ پر ہمارا گزر ڈیڈیما (Didyma) میں ٹمپل آف اپولو (Temple of Applo) کے کھنڈرات سے ہوا۔ یہ ٹمپل یونانیوں نے ایک قدرتی چشمہ پر بنایا تھا اور یہ ملیٹس کے شہریوں کی عبادت گاہ تھا۔ اس کو ایرانی بادشاہ ڈیریئس (Darius) نے 479 سال قبل مسیح میں مسمار کروادِیا تھا۔

افیسس، ملیشس کے تقریباً 45 میل شمال میں ترکی کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ کسی زمانہ میں یہ یونان کی اہم بندرگاہ اور ثقافت اور تجارت کا مرکز تھا۔ یہ شہر آرٹیمس (Artimis) ٹمپل جو 550 سال قبل مسیح میں بنایا گیا تھا، سلسس لائبریری (Library of Celsus) اور تھیٹر کے آثارِ قدیمہ کے لیے مشہور تھے۔ یہاں ایک بہت عمدہ عجائب گھر بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے یہاں حضرت مریمؑ نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ یہاں حضرت یحییٰؑ جان دی بپٹسٹ (John the Baptist) کا مقبرہ اور اِس کے ساتھ گرجا بھی ہے۔ حضرت یحییٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کے آنے کی بشارت دی تھی اور اُن کو غسل بھی دیا تھا۔

غار میں بنا ہوٹل کیپوڈوسیا

حضرت یحییٰؑ یونانی نژاد یہودی تھے۔ اُنھوں نے اور سینٹ پال نے مل کر یہاں عیسائیت کا پرچار کیا تھا۔ اِس قدیم شہر کی کھدائی اور عمارت کے تحفظ کا کام ابھی جاری ہے اور یہاں سیاحوں کے تفنن الطبع کے لیے تھیٹر میں کانفرنس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

یہاں اِس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جوڈیا اور جورڈن (Jordan) کے بادشاہ ہیروڈ (Herod) نے اپنی بیوی ہیروڈیاس (Herodias) کی خواہش اور اپنی سوتیلی بیٹی سلومی (Salome) کے اصرار پر حضرت یحییٰؑ کا سر قلم کر کے ایک پلیٹ میں پیش کیے جانے کا حکم صادر کیا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یحییٰؑ نے ہیروڈ کے بارے میں، اِس کے اپنے بھائی کی بیوی سے شادی کو ناجائز قرار دِیا تھا۔ اِس لیے اُس کی بیوی اپنے دل میں حضرت یحییٰؑ کے لیے شدید بغض اور عناد کے جذبات رکھتی تھی۔

حضرت یحییٰؑ کے سر اور جسم کے مختلف حصّوں کو دفنانے کے بارے میں کئی قیاس آرائیاں ہیں۔ اُن کے عقیدت مندوں نے اُن کے مزار کئی مقامات کے گرجا گھروں میں تعمیر کیے۔ ایک تو جورڈن میں ہے۔ دوسرا دمشق میں مسجدِ اُمیہ میں ہے۔ تیسرا مصر میں الیگزنڈریا میں اور چوتھا ترکی میں۔ افیسس کے قدیم شہر میں حضرت یحییٰؑ کے سر قلم کرنے کا واقعہ، حضرت عیسیٰؑ کے صلیب سے اُٹھائے جانے سے پہلے کا ہے۔

انطالیہ کی کانفرنس کے اختتام پر اسلم مغل اور مَیں نے کیپوڈوسیا (Cappodosia) اور کونیا (Konya) کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ اِن دونوں مقامات پر مناسب ہوٹلوں کی بکنگ میری بیٹی کسریٰ نے امریکا سے کرادِی تھی۔

کیپوڈوسیا، وسطی اناطولیہ میں نیوسیہر (Nevsehir)،

کیسری (Kayseri)، اکسارے (Aksaray) اور نجدی (Nigde) کے صوبوں میں واقع ہے۔ اس کو یونیسکو (UNESCO) نے اپنے عالمی تہذیبی ورثہ (World Cultural Heritage) کے طور پر منتخب کیا ہوا ہے۔

کیپوڈوسیا میں ہماری بکنگ ایک چھوٹے سے غاروں والے ہوٹل میں کی ہوئی تھی۔ اِس ہوٹل کو ایک ترکش فیملی چلا رہی تھی جو ماں، باپ، بیٹا اور بیٹی پر مشتمل تھی۔ وہ ہم سے بے حد مربیانہ انداز میں پیش آئے۔ غاروں میں بنے ہوئے ہوٹلوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اِس کے کمرے مختلف سطح پر بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے پہاڑ میں کٹی ہوئی سیڑھیوں کے ذریعے جانا پڑتا ہے۔ میرا تو کمرا بھی ایک سطح پر واقع نہیں تھا۔ بستر ایک چھوٹے سے چبوترے پر لگا ہوا تھا جس پر پہاڑ میں کٹی ہوئی ایک سیڑھی کے ذریعے چڑھنا پڑتا تھا۔ بیٹھنے اور غسل خانہ کی سطح بھی ایک دوسرے سے مختلف تھی، لیکن یہاں بجلی، گرم اور ٹھنڈے پانی، سیوریج اور پانی کے نکاس کی سب سہولتیں میسر تھیں۔ مسافروں کا لاؤنج، صبح کے ناشتہ کا کمرا سب سے اوپر کی منزل پر تھا۔ لاؤنج میں ایک مائیکرو وَیو (Microwave) ہیٹر، چائے اور کافی بنانے کا سامان، بجلی کی چائے دانی اور مختلف قسم کے بسکٹ رکھے ہوئے تھے تاکہ مسافر کسی بھی وقت اپنی خاطر آپ کر سکیں۔ مَیں بشریٰ کو امریکا ٹیلی فون کرنا چاہتا تھا۔ ہوٹل کی مالکن نے کہا کہ آپ جب چاہیں، دفتر میں رکھا ہوا ٹیلی فون استعمال کر سکتے ہیں۔ ٹیلی فون کے پاس رکھے ہوئے رجسٹر میں اپنی کالز کا اندراج کر دیا کریں۔ جب آپ ہوٹل سے جائیں گے، اُس وقت بل میں اِن کا شمار کر لیا جائے گا۔

ہوٹل میں صرف صبح کے ناشتے کا انتظام تھا۔ کھانے کے لیے اِس گاؤں کے مرکز میں ریسٹورنٹ میں جانا پڑتا تھا جس کے لیے پیدل جایا جا سکتا تھا یا ٹیکسی منگائی جا سکتی تھی۔ اب ہمارا مسئلہ کیپوڈوسیا کی سیاحت کا تھا۔ اِس کے لیے ہمیں سیاحتی راہنما کمپنیوں کی ایک فہرست بمعہ اُن کے ٹیلی فون نمبروں کے فراہم کر دی گئی۔ سیاحوں کے لیے بسیں بھی چل رہی تھیں اور اِنفرادی طور پر گائیڈ کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی تھیں۔

ہوٹل کی مالکہ نے ایک کمپنی کی سفارش کی۔ ہم نے اِس کمپنی سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور بتایا کہ ہم تین اشخاص ہیں۔ ہمیں اِنفرادی طور پر گاڑی اور اَپنا گائیڈ درکار ہے اور یہاں کے مشہور علاقوں کی سیاحت کرنا چاہتے ہیں۔ ٹیلی فون کرنے کے تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان ترکش گائیڈ ہمارے ہوٹل میں آ گیا اور اِس نے بتایا:

''میں نے پورے سیاحتی دورے کی منصوبہ بندی کر لی ہے۔ آپ کے لیے ایک منی وین مخصوص کر دی جائے گی۔ میں ہمہ وقتی طور پر آپ کے ساتھ رہوں گا۔ اِس پیکج میں تین آدمیوں کے لیے دوپہر کا کھانا شامل ہے اور بعض جگہیں جہاں داخل ہونے کے لیے ٹکٹ درکار ہوتے ہیں، وہ اِس پیکج میں شامل ہیں۔''

ہمیں یہ پیکج پسند آیا اور اِس کی قیمت ہم نے پیشگی ادا کر دی۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ وہ کل صبح نو بجے ہوٹل کے سامنے چھے سیٹوں والی وین میں ہمارا منتظر رہے گا۔

دوسرے دن، صبح نو بجے جب ہم تیار ہو کر ہوٹل کے دروازے سے باہر نکلے، تو ہمارا گائیڈ چھوٹی سی نئی وین میں ہمارا منتظر تھا۔ ہمارا اور اُس کا تین دن کا ساتھ رہا۔ اُس نے ہمیں کیپوڈوسیا کے وسیع و عریض علاقوں کے تاریخی آثارِ قدیمہ کی سیر کرائی۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں منتخب منظر گاہوں میں کچھ دیر قیام کیا۔ ایک کھانا جو ابھی تک یاد ہے، وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے گھر نما ریسٹورنٹ میں کھایا تھا۔ گھر کے باہر ایک چبوترے پر کھانے کی تین چار میزیں لگی ہوئی تھیں جہاں سے کیپوڈوسیا کے جیولوجیکل ادوار

میں بنے ہوئے اونچے اونچے مخروطی چمنیوں والے ستونوں کا منظر انقلاباتِ زمانہ کی داستان سنا رہا تھا۔ اِن ستونوں کے سر پر پہاڑوں کی ٹوپیاں، بدن مختلف اَدوار میں جمع کیے ہوئے ریتیلے پتھر سے بنے ہوئے تھے اور اِن کے پاؤں ریگستانی مٹی میں پیوست تھے۔

کھانا گھر میں بڑے اہتمام سے بنایا گیا تھا۔ پہلے ہمیں سُوپ دیا گیا۔ پھر سلاد اَور مین ڈش کے بعد حلوہ اور بعد میں گرم گرم کافی پیش کی گئی۔ یہ پہاڑ پر بنا ہوا گھریلو ریسٹورنٹ سیاحوں میں بہت مقبول تھا۔ یہاں تھوڑی سی جگہ ہموار کر کے کار پارکنگ کا انتظام کیا گیا تھا اور اِس کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ یہ پُرتکلف کھانا ہمارے سیاحتی پیکج میں شامل تھا۔

کیپوڈوسیا کے جن آثارِ قدیمہ کی یاد اَبھی تک ذہن سے محو نہیں ہو پائی، اِن میں پہاڑ کے اندر بنا ہوا گرجا اور اِس کی دیواروں پر بنے ہوئے نقش ونگار، گرجا کے باہر پہاڑوں کے غاروں میں بنی ہوئی موناسٹریز (Monastries) اور کون وینٹس (Convents) جہاں پادری اور ننیں (Nuns) رہا کرتے تھے اور سات منزلہ زیرِ زمین شہر ہے۔ خصوصاً کیپوڈوسیا کے سات منزلہ زیرِ زمین شہر کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے اور سیاح انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔

جب باہر سے لوگ عیسائیوں کے شہر پر حملہ آور ہوتے، تو اِس سے پہلے سارا شہر زیرِ زمین منتقل ہو جاتا۔ وہ ایک پہاڑ کی چٹان کو لڑھکا کر اِس شہر میں داخل ہونے کا راستہ بند کر دیتے اور حملہ آوروں کے جانے کے بعد اِس زیرِ زمین شہر سے باہر نکلتے۔ اِس شہر میں داخل ہونے سے پہلے سیاحوں کو ایک ہیڈ فون اور ایک ریکارڈ پلیئر دیا جاتا ہے جو اِس شہر کی سیاحت کرنے کے دوران اِس کے مختلف عناصر کی وضاحت کرتا جاتا ہے۔ اِس میں سونے اور خوراک ذخیرہ کرنے، کچرا پھینکنے کی جگہوں کی نشان دہی، ہوا کی گردش اور سینی ٹیشن کے انتظام کی تفصیل کانوں میں لگے ہوئے ہیڈ فونوں کے ذریعے ملتی ہے۔ میں اور اَسلم جب اِس شہر کی ڈھلوانی گلی کی ساتویں منزل تک پہنچے، تو ہمیں تھکن اور دَم گھٹنے کا احساس ہوا۔

کیپوڈوسیا کی سیاحت کے دوران ہم لوگوں کو وہاں کے غاروں والے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کافی پینے کا اتفاق ہوا۔ اس کی آرائش اور غاروں میں بنے کمروں کو دیکھ کر ہمیں اِس ہوٹل میں نہ ٹھہرنے کا افسوس ہوا۔ جب میں نے امریکا اپنی بیٹی سے بات کرتے ہوئے پوچھا کہ تم نے ہماری بکنگ اِس ہوٹل میں کیوں نہیں کرائی؟ تو اُس نے جواب دیا، مجھے بھی یہ ہوٹل بہت پسند آیا تھا، لیکن اِس ہوٹل میں بُک کی ہوئی تاریخوں میں ردّوبدل نہیں کیا جا سکتا اور مقررہ تاریخوں میں نہ آنے کی صورت میں بکنگ کی ادا شدہ رقم بھی واپس نہیں کی جاتی۔ اِس لیے میں نے اِس خیال سے آپ کی بکنگ یہاں نہیں کروائی کہ اگر آپ کو انطالیہ میں اپنے قیام کی مدت، ایک آدھ دن بڑھانی پڑ گئی، تو اِس ہوٹل میں ادا کی ہوئی رقم ضائع ہو جائے گی۔

ویسے ہم اپنے چھوٹے سے غاروں والے ہوٹل کے قیام سے بہت مطمئن تھے۔ اِس کے مالکان کی میزبانی میں بہت اپنائیت تھی، کرایہ بھی مناسب تھا۔ جب ہم نے اِس ہوٹل سے رخصت ہوتے وقت ادائیگی کی، تو میں نے ہوٹل کے مالک کو بتایا کہ میں اِن کے دفتر کے ٹیلی فون سے امریکا کالز کرتا رہا ہوں اور اِس کا اندراج میں نے ساتھ رکھے ہوئے رجسٹر میں کر دیا ہے۔ اِن کی قیمت بھی ہوٹل کے بل میں شامل کر لیں، تو ہوٹل کے مالک نے کہا:

''یہ کالز ہماری طرف سے آپ کو تحفہ ہے، ہم اِن کی قیمت آپ سے نہیں لیں گے۔''

تین دن مسلسل ساتھ رہنے کے باعث ہمارا گائیڈ سے دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ اسلم نے اُس کی بیوی کے لیے ایک تحفہ دیا۔ اس پر اُس کی آنکھیں اظہارِ تشکر سے چمک اُٹھیں۔ اُس کی بیوی بھی کبھی بطور گائیڈ کام کرتی رہی تھی۔ اِسی پیشہ کے ذریعے دونوں کی آپس میں ملاقات ہوئی اور دونوں

شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ شادی کے بعد اُس کی بیوی نے گھرداری کا کام سنبھال لیا۔

ترکی میں سیاحتی گائیڈ بننے کے لیے اِس شعبہ میں ڈپلومہ یا ڈگری حاصل کرنا لازم ہے۔ گائیڈ کے تعلیمی نصاب میں ترکی کے آثارِ قدیمہ کی تاریخ اور اِسے بیان کرنے کے کورس، بڑے اہتمام سے پڑھائے جاتے ہیں۔

ترکی میں میرے اِس تیسرے دورے کی آخری منزل کونیا (Konya) کا شہر تھا۔ وہاں جانے کا واحد مقصد مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا تھی۔ رومی تیرہویں صدی میں صوفی شاعر تھے اور شمس تبریز کے شاگرد تھے۔ کیپوڈوسیا سے کونیا ہم لوگ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچے۔ یہاں میری بیٹی نے رومی کے مزار کے قریب ایک ہوٹل میں میرے اور اُسلم کے لیے دو کمرے بُک کروا رکھے تھے۔ ہمیں یہ ہوٹل، اس کا محلِ وقوع اور منیجر بہت پسند آئے۔

رومی کا مقبرہ، میوزیم، درس گاہ اور مسجد ایک سنگِ مرمر کے صحن کے گرد واقع ہیں۔ سنگِ مرمر کے صحن کے درمیان ایک خوبصورت فوارہ بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف بیٹھ کر وضو کرنے کے لیے نل لگے ہوئے ہیں۔ لوگ وضو کر کے رومیؒ کے مزار اور مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ اندر جانے کے لیے جوتوں پر پلاسٹک کی تھیلیاں چڑھانی پڑتیں اور عورتوں کے لیے سر ڈھانپنا لازمی ہے۔

رومی کے مقبرے میں لوگ بڑی خاموشی اور ادب و احترام کے ساتھ فاتحہ پڑھنے کے لیے داخل ہوتے ہیں۔ مقبرہ کے اندر مدھر سُروں میں بانسری کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ بڑے ہال میں تین قبریں بنی ہوئی ہیں جن پر نقشین چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ ہر قبر کے سرہانے ایک پگڑی رکھی ہے۔

ایک قبر مولانا رومیؒ کے والد بہاؤالدین ولد کی ہے جو معلم پیشہ تھے اور سلطان العلماء کہلاتے تھے۔ دوسری مولانا رومیؒ کی ہے اور تیسری رومی کے بڑے بیٹے سلطان ولد کی ہے جو صوفی شاعر تھے۔ اِن کے علاوہ راہداریوں میں رومیؒ کے خاص مریدوں کی قبریں بھی ہیں۔

رومیؒ کے مقبرے کے ساتھ کبھی گردشی درویشوں (Whirling Dervaish) کی رہائش گاہیں ہوا کرتی تھیں جن کو مصطفیٰ کمال اتاترک نے عجائب گھر میں تبدیل کر دیا تھا۔ مسجد کے ساتھ رومی کی درس گاہ ہے جس میں داخل ہوتے ہی دروازہ کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے چبوترے اور اِن سے آگے ایک بہت بڑا چبوترہ بنا ہوا ہے۔ چھوٹے چبوتروں پر رومیؒ کی شاگردی میں آنے کے خواہش مند بیٹھا کرتے تھے اور بڑے چبوترے پر رومیؒ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو درس دیا کرتے۔ شاگردی میں آنے کے خواہش مند لوگوں کی چال ڈھال پر رومی کڑی نظر رکھتے تھے۔ ناپسندیدہ لوگوں کے متعلق رومی حکم صادر فرماتے تھے کہ ان کی جوتیوں کا رخ باہر کی طرف موڑ دو۔

ہر سال سترہ دسمبر کو مولانا رومیؒ کا عرس ہوتا ہے۔ قرب و جوار اور دُور دراز سے لوگ اِس میں شرکت کرنے کے لیے جوق در جوق آتے ہیں۔ آنے والوں میں ایرانی اور ترک زیادہ ہوتے ہیں۔ ایرانی تو اس لیے آتے ہیں کہ رومی مشرقی ایران میں بلخ کے مقام پر پیدا ہوئے اور ان کا کلام فارسی میں ہے۔ ترک اس لیے آتے ہیں کہ رومی نے ترکی میں سکونت اختیار کی۔ اِن کی تعلیم سے ترکی کے باشندے زیادہ مستفید ہوئے اور شاہ و گدا ایک ہوئے۔ اُن دنوں کونیا میں ہوٹلوں میں رہنے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ مساجد میں ذکر بکثرت ہوتا ہے اور گردشی درویشوں کے مستانہ وار ناچ دیکھ کر لوگ جھوم اُٹھتے ہیں۔

مولانا رومیؒ، علامہ اقبالؒ کے پیرومرشد تھے۔ اقبالؒ کا تعلق رومیؒ سے ویسا ہی تھا جیسا رومیؒ کا شمس تبریزؒ سے تھا۔ رومیؒ اور اقبالؒ کے درمیان اگرچہ رومیؒ اور شمس تبریزؒ کے برعکس زمان و مکان کا فاصلہ حائل تھا، لیکن اِس کے باوجود

اقبالؒ کے کلام میں رومی کے فلسفے کی جھلک بے حد نمایاں ہے۔ اپنے اِس تعلق کا اظہار اِقبال نے مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے۔

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
ایک بحرِ پُرآشوب و پُراسرار ہے رومی
تو بھی ہے اِس قافلۂ شوق میں اقبالؔ
جس قافلۂ شوق کے سالار ہیں رومی
اِس عصر کو بھی اُس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغِ راہِ احرار ہے رومی

اقبالؒ اور رومیؒ کے اِس بے پناہ روحانی تعلق کے باعث ترک حکومت نے اقبالؒ کے مزار کے لیے رومیؒ اور اَتاترک کے مزاروں کی مٹی تحفتہً پاکستان بھجوائی تھی اور اِسی تعلق کے اظہار کے لیے رومیؒ کے قبرستان میں اُن کے خاص مریدوں اور معتقدین کے کتبوں میں ایک کتبہ محمد اقبالؒ کا بھی نصب کیا ہوا ہے جس پر ترکی زبان میں لکھے ہوئے فقرے کا اُردو ترجمہ یہ ہے:

''یہ اعزازی آرام گاہ پاکستان کے قومی شاعر محمد اقبالؒ کے لیے اُن کے روحانی پیشوا مولانا رومی کی عطا کردہ ہے۔''

اگرچہ رومیؒ اور اِقبال پیر اور مرید کے رشتے میں منسلک تھے، لیکن ان کے کلام کا مماثلت کے باوجود اپنا اپنا رنگ ہے۔

اقبالؒ کے مزار کے کتبہ پر عربی میں ایک حدیث کے بعد زبورِ عجم کے دو مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں۔

ان من الشعر الحکمۃ
و ان من البیان السحر
نہ افغانیم نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردہ یک نو بہاریم

(بے شک اشعار میں حکمت اور بے شک بیان میں سحر آمیزی ہوتی ہے۔ نہ میں افغانی ہوں، نہ ترک نہ تاتاری، میرا چمن اور شاخ ایک ہی ہے۔ رنگ و نسل کی تفریق مجھ پر حرام ہے، کیونکہ ہم سب ایک ہی نو بہار کے پروردہ ہیں۔)

سنا ہے کہ شہنشاہ ایران جب فاتحہ پڑھنے اقبالؒ کے مزار پر آئے، تو اقبال کے اشعار پڑھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رومی کے مقبرہ میں جب داخل ہوں، تو وہ جن الفاظ میں خوش آمدید کہتے ہیں، اِس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:

''تم کوئی بھی ہو، آوارہ گرد یا عبادت گزار، آؤ۔ خواہ تم لامذہب ہو، کافر ہو یا آتش پرست، آؤ۔ ہماری اخوت میں نا اُمیدی نہیں ہے، بے شک تم نے اپنے عہد ایک ہزار بار توڑے ہوں، آؤ۔''

رومیؒ محبت کے پیغامبر تھے۔ اُن کے خیال میں محبت روح کی غذا ہے۔ رومی کے مزار کے کتبہ پر فارسی میں لکھے ہوئے فقرہ کا اُردو ترجمہ یہ ہے:

''جب ہم رحلت کر جائیں، تو ہمیں ہمارے مزاروں میں مت ڈھونڈو، بلکہ محبت کرنے والے دلوں میں تلاش کرو۔''

میری بیٹی یسریٰ کا مع اپنے شوہر سعود اور بچوں طٰہٰ، طُس، کونیا آنے کا پروگرام تھا۔ اُنھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ کونیا سے آتے وقت اُن کے لیے اسی ہوٹل میں کمرے مخصوص کراتا آؤں۔ جب میں نے ہوٹل کے منیجر سے اس کی استدعا کی، تو اُس نے کہا کہ میں اپنے ہوٹل کا بہترین سوئیٹ (Suite) اُن کے لیے مخصوص کر دیتا ہوں۔ اِس میں چار لوگ بآسانی ٹھہر سکتے ہیں۔ اِس میں علیحدہ ڈرائنگ روم اور باورچی خانہ کی سہولت بھی ہے۔ جب میں نے اِس سے مخصوص کرانے کی پیشگی ادا کرنے کی رقم پوچھی، تو اُس نے کہا:

''میں آپ سے کوئی پیشگی رقم نہیں لوں گا۔ یہ سوئیٹ میں نے آپ کی بتائی ہوئی تاریخوں کے لیے آپ کی بیٹی کے لیے

مخصوص کر دیا ہے۔ اگر آپ کی بیٹی کا پروگرام تبدیل ہوجائے، تو مجھے اس کی اطلاع ضرور کر دیں۔"

کونیا کے قیام کے بعد اسلم اور میرے راستے جداگانہ تھے۔ اسلم براستہ استنبول پاکستان روانہ ہو گئے اور مَیں ترکی کے اِس تیسرے دورے کے بعد چوتھی بار ترکی آنے کی خواہش لیے ہوئے امریکا لَوٹا۔ ترکی کے طول وعرض میں آثارِ قدیمہ بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی تک 28 مقامات دریافت ہوئے ہیں، مزید مقامات کی دریافت کا کام ابھی باقی ہے۔ یہاں یونیسکو نے اٹھارہ مقامات کو عالمی ورثہ (World Heritage) کی فہرست میں شامل کیا ہوا ہے جبکہ پاکستان میں صرف چھے مقامات یونیسکو کے عالمی ورثہ میں شامل ہیں۔ میرے دل میں ترکی کے اَبھی مزید چار مقامات دیکھنے کی حسرت باقی ہے جو ترکی کے شمال مغربی، جنوب مغربی، جنوبی اور مشرقی حصّوں میں واقع ہیں۔

پہلا مقام تو ٹرائے (Troy) کے تاریخی شہر کے آثارِ قدیمہ ہیں جو ترکی کے شمال مغرب میں بحرِ ایجین (Aegean) اور بحرِ مارمارا (Marmara) کے سنگم پر ایک پہاڑی علاقہ میں واقع ہیں۔ انھیں یونیسکو نے عالمی تہذیب کے علاقوں کی فہرست میں شامل کیا ہوا ہے۔

ماہرِ آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے مطابق یہ شہر کبھی اس علاقہ کی راجدھانی اور تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا۔ اِس شہر کی شہرت ٹرائے کی ہیلن (Hellen of Troy)، ٹروجن کا گھوڑا (Trogen Horse) اور ٹروجن وار (Trogen War) کے باعث ہوئی۔ ہوا یوں کہ ٹرائے کا شہزادہ پیرس، یونان کی ملکہ ہیلن کو اپنے جال میں پھنسا کر ٹرائے لے آیا جس کے باعث یونان اور ٹرائے کے درمیان ایک لمبی جنگ کا آغاز ہوا جو ٹروجن وار کے نام سے موسوم ہے۔

ہیلن آف ٹرائے

ٹرائے کا قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ اِس لیے یونانیوں کو ایک تدبیر سوجھی۔ وہ پہیوں پر چلنے والا 'لکڑی کا گھوڑا' جو اندر سے کھوکھلا تھا، قلعہ کی فصیل کے باہر چھوڑ کر روپوش ہو گئے۔ ٹرائے کے لوگوں نے سمجھا کہ یونانی میدان چھوڑ گئے ہیں اور یہ گھوڑا لڑائی کے دیوتا نے ٹرائے کے لوگوں کے لیے تحفہ کے طور پر بھجوایا ہے۔ وہ گھوڑے کو کھینچ کر شہر کے اندر لے گئے۔ رات کو یونانیوں نے گھوڑے سے نکل کر شہر کے دروازے کھول دیے اور یونانی فوج نے شہر کے اندر گھس کر تباہیاں مچا دیں۔

اگرچہ ہیلن کا تعلق یونان سے تھا، لیکن تاریخ میں وہ ہیلن آف ٹرائے کے نام سے مشہور ہوئی۔ اِس کی خوبصورتی کی

کہانیاں زبان زدِ خاص و عام ہوئیں۔ مصوروں نے اِس کی تصویریں بنا کر اور سنگ تراشوں نے اِس کی مورتیاں تراش کر اِس کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ یونان کے اندھے شاعر ہومر (Homer) نے اپنی دو منظوم کتابوں اِلیاد (Iliad) اور اَوڈیسی (Oddesey) میں ہیلن کے حسن کی تعریف کر کے اِسے زندہ جاوید کر دیا اور وہ یورپ کی سب سے خوبصورت عورت کے طور پر مشہور ہوئی۔

دوسری قابلِ دید جگہ ترکی کے جنوب مغرب میں بحرِ ایجین میں قلوپطرہ کا جزیرہ (Cleopatra Island) ہے۔ اِس کا ترکش نام جزیرۂ سیڈر (Sedir Island) ہے۔ یہ جزیرہ مارک اینتھونی (Mark Anthony) نے مصر کی ملکہ قلوپطرہ کو شادی کے تحفہ میں دیا تھا، لیکن قلوپطرہ کو اِس کا ریتلا ساحلِ سمندر پسند نہیں آیا کیونکہ اِسے مصر کے ساحل کی سفید اور ریشمی ریت کی عادت تھی، لہٰذا اِس جزیرہ میں مصر اور کریٹ (Crete) کے جزیرہ سے ریشمی ریت منگوا کر بچھائی گئی۔

آج کل سیاح مارماریس (Marmaris) کی بندرگاہ سے لکڑی کی بنی ہوئی دو منزلہ کشتیوں میں بیٹھ کر اِس جزیرہ میں بحرِ ایجین کے نیلگوں پانی میں تیرنے، سرسبز پہاڑوں اور نسیمِ بحری سے لطف اندوز ہونے کے لیے آتے ہیں۔ سیاحوں کے پیدل چلنے کے لیے اِس جزیرہ میں لکڑی کے فٹ پاتھ بنا دیے گئے ہیں۔

یہاں پرانے شہر کُڈرائے (Kadrai) کی دیواریں، رومن تھیٹر اور چرچ کے آثارِ قدیمہ محفوظ ہیں۔ ساحلِ سمندر پر سیاحوں کے لیے غسل خانوں کا انتظام ہے، لیکن مصر سے لائی ہوئی ریشمی ریت بچھا ساحل استعمال کرنے کی اجازت سیاحوں کو نہیں ہے۔

ترکی کے مغرب میں بحرِ ایجین کے شمال اور جنوب میں واقع مذکورہ بالا دو مقامات کا موازنہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک ہنستے بستے اور پھلتے پھولتے شہر کی بربادی ایک عورت کے باعث ہوئی جو ہیلن آف ٹرائے کے نام سے مشہور ہوئی اور دُوسرے ایک غیر آباد جزیرہ کی آبادی کا باعث بھی ایک عورت ہی بنی جو قلوپطرہ کے نام سے موسوم ہے۔

تیسرے اور چوتھے مقامات جن کو دیکھنے کی مجھے خواہش ہے، اِن کا ذکر قرآنِ کریم میں بطورِ خاص آیا ہے۔ ایک تو ترکی کے جنوب کے صوبہ ہاتے (Hatay) میں شام کی سرحد کے قریب انتیوخ (Antioch) کا شہر ہے جس کا ذکر بڑی تفصیل سے ذکر سورۃ یٰسین ((23:13-30 میں آیا ہے۔ یہ شہر کبھی ہیلنسٹک یہودیت (Helenistic Judism) کا مرکز اور عیسائیت کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ اِس کے شہریوں نے اپنے ایک شہری کے سمجھانے کے باوجود اللہ سبحان وتعالیٰ کے بھیجے ہوئے تین پیغمبروں کی بات نہ مان کر اِن پر زیادتی کی تھی، اِس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے غیض وغضب کا شکار ہوئے اور اُن کو ایک آگ کی چنگاڑ نے آناً فاناً تباہ و برباد کر کے نشانِ عبرت بنا دیا تھا۔ انتیوخ کے کھنڈرات دیکھنے آج تک سیاح چار دانگِ عالم سے آتے ہیں۔

دوسرا ترکی کے مشرق میں ارارت کے پہاڑوں پر حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا ہیولہ ابھی باقی ہے جس کے متعلق اللہ سبحان وتعالیٰ نے سورۃ عنکبوت میں ارشاد فرمایا ہے ''ہم نے نوح کی کشتی کو اہلِ عالم کے لیے نشانی بنا دیا۔'' (29:15) نیشنل جیوگرافک میگزین میں چھپے ہوئے ایک مضمون کے مطابق مختلف تفتیشی ٹیمیں غور وخوض کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ 99.9 فی صد امکانات یہی ہیں کہ ارارت کے پہاڑ پر 13,000 فٹ کی بلندی پر برف میں دبا ہوا تقریباً 4,800 سال پرانا کشتی نما مجسمہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا ہی ہے۔

(جاری ہے)

شیخ عبدالحمید عابد

آؤ تمہیں سانس دوں

ننھے بچوں میں دمہ کی بیماری قابلِ علاج ہے مگر بڑوں کی لاپروائی کسی معصوم کی جان لے سکتی ہے

جیسے جیسے علم ترقی کی منازل طے کرتا جارہا ہے، بیماریوں کے بارے میں ہماری آگاہی اسی اعتبار سے بڑھتی جارہی ہے۔ بچوں میں بھی بہت سی سانس کی بیماریاں ایسی ہیں جن کا اگر بروقت علاج نہ کیا جائے، تو وہ مریض کو نقصان پہنچا سکتی ہیں، ان میں بچوں کا دمہ بہت اہم ہے۔

یہ مرض بے حد پرانا ہے اور اگر صحیح طریقے سے اس کی تشخیص اور بروقت علاج کیا جائے، تو مریض تقریباً نارمل زندگی گزارنے کے قابل رہتا ہے۔ بچہ اپنے ہر طرح کے کھیل کود کو بھی جاری رکھ سکتا ہے۔ بسا اوقات دمہ کی ادویات صرف دمہ کے حملہ کی صورت میں استعمال کرنا ہوتی ہیں اور جب حملہ ختم ہوجائے، تو ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چند صورتوں میں دمہ کے حملوں کے درمیان بھی ادویات کا استعمال کرایا جاتا ہے اور بعض اوقات دمہ کے حملہ کو روکنے کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر ادویات دینا پڑتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کے والدین اس مرض کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں اور اپنے معالج کی ہدایات کی روشنی میں بچے کا علاج کریں اور ازخود ادویات کے استعمال سے اجتناب کریں۔

دمہ کی علامات تو بہت آسان سی ہوتی ہیں۔ ناک سے پانی آنا، چھینکوں کا آنا، سانس لینے میں گھٹن کا احساس ہونا، کھانسی کا آنا اور خصوصی طور پر رات کے وقت یا دن کے پچھلے پہر اور عموماً اگر حملہ شدید ہو تو سانس لینے کے درمیان سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اگر آپ کے بچے کو ایسی علامات ہوں، تو یہ شک ہوسکتا ہے کہ اس پر دمہ کا حملہ ہوا ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ ایسا بار بار ہو تو ایسے میں آپ کا معالج بچے کا معائنہ کرکے اور اس کی چھاتی کا خصوصی جائزہ لے کر آپ کو بتا سکتا ہے کہ بچہ دمہ کا شکار ہے۔ جب ڈاکٹر تشخیص کرے، تو گھبرانے کی یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

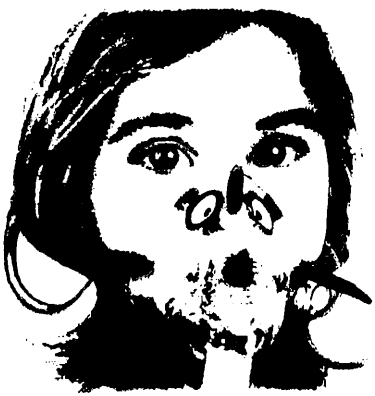

یہ ایک نہایت سادہ اور قابلِ علاج مرض ہے۔ شرط اس بات کی ہے کہ ادویات کا مناسب استعمال کیا جائے، ورنہ مرض بگڑ سکتا ہے۔ اکثر اوقات کھیل کود کے دوران سانس کا خراب ہو جانا دمہ کی پہلی علامت ہوسکتی ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ دمہ خاندانوں میں نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک قسم کی الرجی ہے اور اس میں سانس کی نالیوں کی حساسیت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ معمول سے زیادہ سکڑ جاتی ہیں۔ اگر کسی بچے کے والدین میں سے دونوں کو یا کسی ایک کو دمہ کا مرض ہو، تو اس میں دمے کے ہونے کے

پھیپھڑے کے خلیوں میں ہونے والی تبدیلیاں کینسر کا موجب بنتی ہیں۔
اب تک سائنس دانوں کا خیال رہا ہے کہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کا مداوا ممکن نہیں، خواہ آپ سگریٹ نوشی ترک بھی کردیں۔ (جدید تحقیق)

امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اِس لیے ایسے خاندانوں میں جہاں دمہ کا مرض زیادہ ہو، اُنھیں آپس میں شادی کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

دمہ بھی ایک قسم کی الرجی ہی ہے جو سانس کی نالیوں کو متاثر کرتی ہے۔ بعض عوامل ایسے ہوتے ہیں جو دمہ کے حملہ کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ مثلاً گرد وغبار میں پھولوں کے زردانے، سگریٹ کا دھواں، سرد ہوا، ٹھنڈا پانی، گھروں میں موجود وال ٹو وال کارپٹ، گھر کے اندر پالے گئے چرند پرند اور خصوصاً گھروں کی دھول میں خاص قسم کا کیڑا ہوتا ہے جسے

گھروں کے اندر زیادہ سے زیادہ سامان بھر دیں اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک وال ٹو وال کارپٹ کریں۔ ایسا کرنے سے گرد وغبار اِن کمروں میں رُکا رہ جاتا ہے جو دمہ کے بچوں کے لیے خطرناک ہوتا ہے، چنانچہ جس گھر میں دمے کا مریض ہو اور خصوصاً بچہ، تو وہاں کمروں میں سامان کم سے کم ہونا چاہیے اور قالین سے ہر ممکن گریز کرنا چاہیے۔

اِسی طرح والدین کو چاہیے کہ سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز کریں۔ اس لیے کہ سگریٹ نوشی کے دو گھنٹے بعد تک منہ سے دھوئیں کے کیمیکل اور ذرات نکلتے رہتے ہیں جو دمہ کے

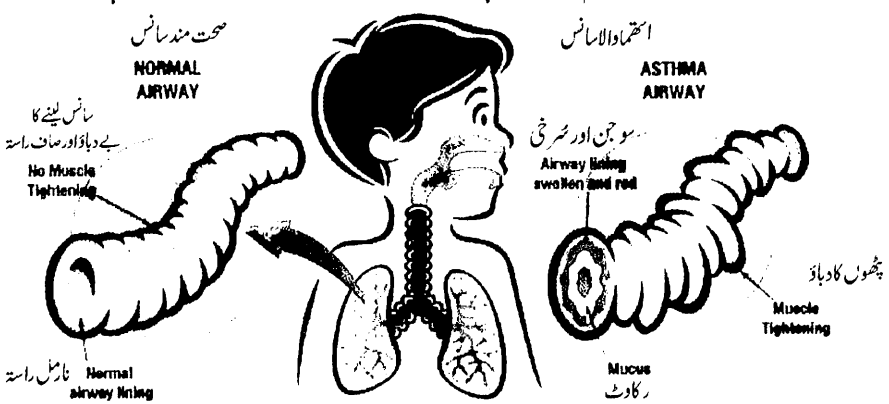

'ہاؤس ڈسٹ مائٹ' کہتے ہیں، وہ بھی اس مرض کا سبب بن سکتا ہے۔ بعض عطریات یا پرفیوم یا باورچی خانے سے نکلنے والا دھواں، موسم کی تبدیلی اور خصوصی طور پر ایسے بچے جن کو نزلہ، زکام یا کھانسی رہتی ہو، تو اِس دوران بھی اِن پر دمے کا حملہ ہوسکتا ہے۔

ہمارے گھروں میں آج کل رواج ہوتا جارہا ہے کہ

مرض کو شروع کرسکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے گھروں میں زیادہ تر خشک جھاڑو سے گھروں کی صفائی کی جاتی ہے جس سے تمام دھول ہوا میں معلق ہوجاتی ہے۔ یہ دھول بھی دمہ کے مرض کا آغاز ہوسکتی ہے، چنانچہ والدین کو چاہیے کہ وہ گیلے جھاڑو کے ساتھ کمروں کی صفائی کریں یا پھر صفائی سے پہلے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کرلیں۔ جب بہار کا موسم آتا ہے، تو

اِس موسم میں پھولوں کے زردانے ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ اِس میں بھی بچوں کو خاص احتیاط کرنی چاہیے۔ ایسے میں منہ پر ماسک پہننا مفید ثابت ہوسکتا ہے اور ایسے میں بچوں کو یہ بھی احتیاط کرنا چاہیے کہ کہیں یک دم گرم ماحول سے سرد ماحول میں یا پھر سرد ماحول سے گرم ماحول میں نہ جائیں اور رات گئے تک سردی میں رہنا بھی خطرناک ہوسکتا ہے۔

والدین کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ پانچ سال سے بڑی عمر کے بچوں میں تو دمہ کی تشخیص بے حد آسان ہے جبکہ کم وبیش ایک سال یا اِس سے کم عمر کے بچوں میں دمہ کی تشخیص ایک مشکل فیصلہ ہوتا ہے جس کے لیے خصوصی احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے، تو دمہ کی شدت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور حملوں کا دورانیہ بھی کم ہو جاتا ہے، لیکن بسا اوقات یہ مرض تمام عمر اِس کو لاحق رہتا ہے۔

دمہ کی شدت معمول سے لے کر درمیانی یا شدید ہوسکتی ہے اور اِس حوالے سے دمہ میں استعمال ہونے والی ادویات کی نوعیت اور طریقۂ استعمال میں بھی فرق ہے۔ عموماً پہلے دمہ کے حملے کے دوران ادویات کا استعمال کیا جاتا ہے اور حملہ ختم ہونے کے بعد بچہ بالکل نارمل ہو جاتا ہے۔ دوروں کے دوران بچہ بالکل تندرست رہتا ہے اور اِس کو ادویات کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن بعض صورتوں میں دوروں کے دوران بھی ادویات کا استعمال کروانا پڑتا ہے۔ دمہ کی خاص بات یہ ہے کہ جتنی تیزی سے سانس میں دشواری شروع ہوتی ہے، مناسب علاج کرنے سے اتنی تیزی سے ختم بھی ہو جاتی ہے۔ علاج کے دوران بھاپ کے ذریعے ادویات دینا مریض کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے، لیکن اکثر والدین یہ سمجھتے ہیں کہ اسپتال میں بھی تو ڈاکٹر بھاپ دے رہے ہیں، کیوں نہ گھر میں دے لی جائے، تو مَیں عرض کرتا چلوں کہ اِس میں سانس کی نالیوں کو کھولنے کے لیے خاص ادویات ڈالی جاتی ہیں اور اِس وجہ سے مرض میں بہتری واقع ہوتی ہے اور اِس کو استعمال کرنے کا خاص طریقہ بھی ہے۔ پھر علاج کے لیے کچھ ٹیکے بھی استعمال میں لائے جاسکتے ہیں یا پھر کھانے کے لیے گولیاں یا پینے کے لیے سیرپ۔

آج کل جتنے بھی علاج دمہ کے لیے استعمال میں لائے جارہے ہیں، اِن میں INHALERS سب سے کامیاب طریقۂ علاج ہے۔ اِس لیے کہ اِس کے ذریعے سے ادویات کی نہایت ہی کم مقدار براہِ راست سانس کی نالیوں میں پہنچ جاتی ہے جہاں اس نے فوری اثر کرنا ہوتا ہے اور اِس کے مضر اثرات بھی کم مرتب ہوتے ہیں جبکہ عوام میں ایک غلط سوچ ہے کہ INHALERS اگر ایک مرتبہ استعمال کرلیا جائے

تو اس کے بعد تمام عمر ان کے بغیر علاج ممکن نہیں ہوگا اور ان کے مضر اثرات ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ والدین کو بتاتا چلوں کہ دمہ کے مرض کے لیے ایک خاص قسم کی STEROIDS کی گولی خاص مؤثر ہوتی ہے، لیکن اس کا استعمال صرف اور صرف مستند ہاتھوں سے ہونا چاہیے۔ ہمارے بہت سارے اتائی حضرات کے ہاتھوں اس گولی کا استعمال کروانے سے بے تحاشا مسائل پیدا ہونے کے امکانات قائم رہتے ہیں جن میں فشارِ خون (بلڈ پریشر)، وزن کا بڑھ جانا، چہرے کا گول ہو جانا، جسم پر فالتو بالوں کا اُگ آنا یا پھر ذیابیطس (شوگر) کا مرض بھی ہو سکتا ہے۔

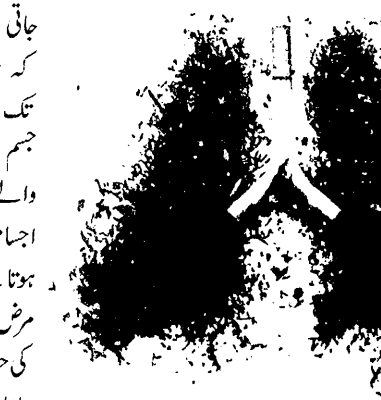

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبوتر کا شکار توپ کے گولے سے کیا جائے جس میں ایک کبوتر نہیں، بلکہ پورا غول مر جاتا ہے جبکہ ایک کبوتر مارنے کے لیے ایک پتھر ہی کافی ہوتا ہے۔ ہمارا قومی مزاج ایسا ہے کہ ہم قلیل دورانیے کے مرض کا علاج تو مناسب کر لیتے ہیں جبکہ دائمی امراض کا علاج کرنا ہمارے قومی مزاج کے ساتھ مسابقت نہیں رکھتا، چنانچہ یہ یاد رکھیں کہ آپ کا بچہ اگر دمہ کا شکار ہے، تو یہ حملہ اس پر بار بار ہو سکتا ہے اور ہر بار علاج دلجمعی سے کروانا ہوگا۔ جیسا کہ مَیں نے احتیاطی تدابیر بتائی ہیں، وہ بھی کرنا ہوں گی۔ گھر کا ماحول، مناسب تبدیلی اور سگریٹ نوشی سے پرہیز دمہ کے علاج کے لیے بے حد ضروری ہے۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ بچہ اچھے طریقے سے INHALERS لے نہیں پاتا۔ آج کل SPACER DEVICES آ رہی ہیں، اگر اِن کے ذریعے بچے کو INHALERS دیے جائیں، تو مزید افاقہ ہو سکتا ہے اور مرض کے مناسب کنٹرول میں بے حد کامیابی ہوتی ہے۔

دمہ کے بارے میں چند توہمات بھی ہیں جیسا کہ دوسری بیماریوں کے بارے میں ہمارا خیال ہوتا ہے کہ بیماریاں کھانے پینے کی اشیاء سے ہوتی ہیں، چنانچہ دمہ میں بھی بچے کی خوراک پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۹۰ سے ۹۵ فی صد تک دمہ سانس کے ساتھ جسم میں داخل ہونے والے کیمیائی مرکبات، اجسام یا مواد کے ذریعے ہوتا ہے، اس لیے کہ اس مرض میں سانس کی نالیوں کی حساسیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے بچے کی خوراک پر جا بجا پابندیاں لگانا اور کھانے میں انڈہ، دہی وغیرہ کا استعمال نہ کرنا مرض میں تو خاطر خواہ بہتری نہیں کر پاتیں، بلکہ بچہ خوراک کی کمی کا شکار ہو سکتا ہے۔

حکومت نے دمہ کے سلسلہ میں سرکاری اسپتالوں اور خصوصاً بچہ وارڈ میں دمہ کے خصوصی کلینک کھول رکھے ہیں جہاں ماہر ڈاکٹر دمہ کے بچوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔ اِس لیے اگر کوئی مستحق یہ کہے کہ مَیں غریب ہوں، اس لیے میرے بچے کے دمہ کا علاج ماہر ڈاکٹر سے نہیں ہوا، تو یہ بالکل غلط ہو گا۔ آپ کو بس اتنا کرنا ہے کہ وہاں جائیں، اپنے بچے کا علاج کروائیں اور حکومت کی دی گئی سہولیات کا فائدہ اُٹھائیں۔

☆☆☆

سنہرے دور کی دستک... ایک بار پھر!

اُردو ڈائجسٹ کے نامور خصوصی شمارے اب بہترین کاغذ پر کتابی شکل میں دستیاب ہیں

اُردو ڈائجسٹ

سال	مہینہ	خصوصی نمبر	سال	مہینہ	خصوصی نمبر
1969	جنوری	سالنامہ	2000	اپریل	آپ بیتی نمبر
1971	مارچ	سالنامہ	2000	دسمبر	مشرقی پاکستان نمبر
1971	نومبر	مشرقی پاکستان نمبر	2001	نومبر	افغانستان نمبر
1975	اپریل	سالنامہ	2001	دسمبر	قائداعظم نمبر
1975	اگست	آزادی نمبر	2002	اپریل	سیاحت نمبر
1975	ستمبر	دفاع نمبر	2003	دسمبر	فاطمہ جناح نمبر
1979	جون	انقلاب ایران نمبر	2004	اپریل	جدوجہد نمبر
1984	ستمبر	دفاع نمبر	2004	اگست	آزادی نمبر
1984	دسمبر	سالنامہ	2004	دسمبر	سالنامہ 40 سالہ انتخاب 1960 سے 2000
1986	جنوری	فروغ جمہوریت نمبر	2006	جنوری	صحت نمبر
1988	اپریل	رحمت اللعالمین نمبر	2011	جنوری	گولڈن جوبلی کہانیات نمبر
1988	اگست	آزادی نمبر	2011	مارچ	صحت نمبر
1989	مئی	رحمت اللعالمین نمبر	2011	مئی	غذائیات نمبر
1989	اگست	شہدائے پاکستان نمبر	2011	جون	عالمی سفرنامہ نمبر
1993	جنوری	سالنامہ	2011	جولائی	مہم جوئی نمبر
1994	فروری	عظیم مائیں نمبر	2011	اگست	آزادی نمبر
1994	مارچ	عظیم مائیں نمبر	2014	فروری	مزاح نمبر
1995	ستمبر	دفاع نمبر	2015	جولائی	طب وصحت نمبر
1999	جنوری	عظیم سفرنامے	2018	جون	آپ بیتی نمبر
1999	اکتوبر	چین نمبر			

آرڈر بک کروانے کے لیے ابھی رابطہ کیجیے 042-35290739, 0307-0060707

تاریخی بستیاں

محمد خالد اختر

آپ قبل مسیح کے زمانے میں شمالی ہندوستان کے بادشاہ ہوگزرے ہیں اور بچپن سے ہی اعظم تھے۔ چندر گپت موریہ کے ہونہار پوتے یا پڑپوتے تھے۔ اِن کی سلطنت جو مگدھ کہلاتی تھی کا پایۂ تخت پاٹلی پتر تھا۔ اب پاٹلی پتر کا نام بگڑ کر پٹنہ پڑ گیا ہے۔ اشوک اعظم کی سلطنت شمال میں موجودہ افغانستان سے لے کر کل شمالی برِصغیر ہند پر محیط تھی۔ اُس زمانے میں افغانستان کے باشندے اتنے لڑاکا اور تند خو نہ تھے جتنے آج کل ہیں،

ورنہ اشوک اعظم کو
اکوں چنے چبوا دیتے
ور اِسے لینے کے دینے
پڑ جاتے۔ سب افغانی

پُرامن اور صلح جُو لوگ تھے جو خواہ مخواہ اپنے پر حکومت کرنے والوں سے نہیں اُلجھتے تھے۔ اپنے دورِ حکومت کے آٹھویں برس میں اشوک نے جنوبی ہند کے صوبے کالنگا پر لشکر آرائی کی اور اِس صوبے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اِس خوفناک خونریزی میں ہزاروں کا کھیت پڑا۔ لاکھوں آدمی بے گھر ہوئے اور مارے گئے۔ کالنگا میں گدھے کے ہل پھر گئے۔ کہتے ہیں لوگوں پر ٹوٹنے والی پتاؤں اور آفات کا اشوک پر اتنا اثر ہوا (جس میں اِس کا کوئی دوش نہ تھا) کہ وہ رقیق القلبی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ عہد کیا کہ آئندہ لشکر آرائیاں نہیں کرے گا۔ آپ نے سر منڈھوا کر بدھ مت اختیار کر لیا اور اِس مت کے بھکشو اور پرچارک بن گئے۔ اپنے لاتعداد بیٹے بیٹیوں میں سے ایک بیٹے بیٹی کو بھکشو بنا کر سری لنکا بھیجا کہ وہاں بدھ مت کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو نئے مت میں آنے کی دعوت دیں۔

وہ وہاں خفیہ ایجنٹ سمجھ کر پکڑے گئے اور مگرمچھوں کی غذا بنے۔ اشوک نے انسانوں اور حیوانوں کے علاج معالجے کے لیے شفاخانے قائم کیے (وہ الگ الگ تھے)۔ ادویہ کی تیاری اَور شفاخانوں میں فراہمی کا خاطر خواہ انتظام کیا کہ انسان اور حیوان اِن سے محروم نہ رہیں اور اَدویہ دوبارہ دکانوں پر نہ پہنچ جائیں۔ سڑکوں کے اطراف پر سایہ دار درخت آور پودے لگوائے، کنوئیں کھدوائے، مسافروں کے آرام کی خاطر سرائیں اور اقامت گاہیں تعمیر کروائیں۔ الغرض رفاہِ عامہ کے بے شمار کام کیے جن سے تعمیراتی محکمہ کے کارکنوں کو بڑا فائدہ ہوا اَور اُنھوں نے لاکھوں کمائے۔

اشوک نے ہندوستان میں پہلی نظریاتی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس کے بعد سے نظریہ پر قائم حکومتوں کا عام رواج ہو گیا۔ اُس زمانے میں نہ اخبار ہوتے تھے نہ چھپی ہوئی کتابیں۔ چین والوں نے ابھی چھاپہ خانہ ایجاد نہیں کیا تھا۔

اشوک اعظم نے عوام الناس کو نظریہ ذہن نشین کرانے کا یہ حل نکالا کہ ملک کے طول و عرض میں ہزارہا پتھر اور لوہے کی لاٹھیں نصب کرا دیں۔ اِن لاٹھوں پر پراکرت بولی میں دین کے بارے میں ہدایات، پند و نصائح، فرامینِ شاہی، خطبات وغیرہ کندہ ہوتے تھے۔ آج کل یہ ابلاغِ عامہ ٹیلی ویژن، ریڈیو وغیرہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اُن دنوں لوگوں میں ایک اچھی بات یہ ہوتی تھی کہ اُن کو بھینس چوری ہونے یا کسی کی بیوی کے بھاگ جانے جیسی روزانہ خبریں جاننے کی لت نہیں تھی۔ وہ لاٹھوں پر نصیحتیں اور سنہری اقوال پڑھ کر چین کی نیند سو جاتے تھے۔ اشوک نے دھرم کے پھیلانے اور احتساب کا ایک محکمہ بھی قائم کیا۔ اس محکمے کے محتسب اور دھرم منتری ملک کے دور دراز حصّوں میں رتھوں اور بیل گاڑیوں میں جاتے اور نظریے سے انحراف کرنے والے لوگوں کو سرِ بازار کوڑے لگاتے اور کڑی سزائیں دیتے۔

اِس لیے اشوک اعظم کی سلطنت میں امن امان کا دور دورہ تھا۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے اور اس کے بعد شیر بکری کو کھاتا تھا۔ مسافر اور رہرو تن تنہا بےخطر ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرتے اور کوئی اُن کے بقچوں پر ہاتھ نہ ڈالتا، کیونکہ بقچے خالی ہوتے تھے۔ ڈاکوؤں اور رہزنوں نے اپنے لُوٹ مار کے پیشے کو ترک کر دیا اور ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی خانقاہوں میں گیروے کپڑے پہن کر بھکشو بن بیٹھے کہ وہاں اُن کو مزے سے جان جوکھم میں ڈالے بغیر کپڑا لتّا اور دو وقت کی روٹی میسر ہو جاتی تھی۔

ہندوستان کے ایک قصبے سارناتھ میں اشوک اعظم کی ایک لاٹھ ابھی تک ایستادہ ہے جس پر کندہ چار سروں والے شیر کا نقش اب ہمارے پڑوسی ملک کا قومی نشان ہے۔ اس شکل و شباہت اور وضع قطع کے شیر آج کل کہیں بھی نہیں پائے جاتے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبل مسیح کے زمانے سے چل کر اِن دو ہزار سالوں میں شیروں نے کئی ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ آج کل کے شیر بالعموم باریش، معقولیت پسند اور وضع دار ہیں۔

سلطان محمود غزنوی

یہ ایک ترکی غلام سبکتگین کے فرزند دلبند تھے۔ ہزار سال ہوئے ہیں کہ غزنی کی حکومت ایک ہرنی کی بدولت سبکتگین کے ہاتھ آئی۔ اُس کی وفات پر ستائیس برس کی عمر میں محمود سربرآرائے سلطنت ہوئے۔ اپنی مہموں اور جنگ آزمائیوں سے باپ دادا کا نام روشن کیا۔ موجودہ افغانستان اور شمالی مشرقی ایران کے علاوہ موجودہ پاکستان کا خطہ بھی آپ کے زیرِ نگیں تھا۔ یعنی کہ اچھے خاصے بادشاہ تھے۔ آپ ہندوستان پر اپنے سترہ حملوں کے لیے مشہور ہیں۔ وہ خود اِن کو دورے کہتے تھے۔ جب بھی من میں موج اُٹھتی، فوج کو تیاری کا حکم دیتے اور ہندوستان پر چڑھ دوڑتے۔ ملک ہند کے راجوں مہاراجوں کی سرکوبی کے بعد مال و دولت اور زر و جواہر سے لدے پھندے گھر لوٹ آتے۔ آپ کو موتی اور ہیرے جمع کرنے کا بےحد شوق تھا۔ اہلِ ہند ہر سال سرما کے اوائل میں آپ کی تشریف آوری کی راہ دیکھتے اور بعض راجے توقیمتی تحائف اور جواہرات لے کر خود ہی سرحد پر حاضر ہو جاتے تھے کہ آپ کو حملے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ آپ تحائف بخوشی قبول کر لیتے، لیکن حملہ پھر بھی ضرور کرتے۔ فوج کے سپاہیوں کی سیر و تفریح بھی تو ضروری تھی۔ پہلی جنگ آپ نے پندرہ ہزار سواروں کے رسالے کے ساتھ راجہ جے پال سے لڑی۔ راجہ صاحب بارہ ہزار سواروں، تیس ہزار پیادہ سپاہیوں اور تین سو ہاتھیوں کے لمبے چوڑے لشکر سے آپ کے مقابلے میں آئے۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ خون کے دریا بہ گئے۔ آخر راجہ صاحب نے منہ کی کھائی اور اپنے چند اقربا و اعزا سمیت سلطان کے لشکر کے نرغے میں آ گئے۔ آپ نے راجہ جے پال سے کچھ دے دِلا کر اُس کی اور اُس کے رشتہ داروں کی جان بخشی کی۔ راجہ صاحب پر اِس ذلت انگیز

شکست کا اتنا اثر ہوا کہ گھر لوٹنے پر اُنھوں نے تاج وتخت اپنے بیٹے آنند پال کو سونپا اور خود چتا پر بیٹھ جل مرے۔

اگلے سال راجہ آنند پال لاؤلشکر سے پوری طرح تیار ہو کر سلطان کے لشکر سے نبرد آزما ہوا۔ راجہ صاحب کی فوج میں تیس ہزار کھوکھر جوان بھی تھے۔ وہ سلطان کی فوج کے دونوں بازوؤں پر اِس تندی سے ٹوٹ پڑے کہ سلطان کی فوج کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ پسپا ہونے لگی۔ اُس وقت آپ کا ارادہ بھی غزنی کی جانب بھاگ اُٹھنے کا ہوا۔ اِس موقعے پر راجہ صاحب کا ہاتھی بھاگا۔ سب جانتے ہیں کہ اُن وقتوں میں کئی جنگیں صرف ہاتھیوں کے بھاگنے کی وجہ سے ہاری جاتی تھیں۔ ہندوستان کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ کھوکھروں نے سمجھا کہ راجہ صاحب پیٹھ دکھا کر فرار ہو رہے ہیں، حالانکہ فرار ہاتھی ہو رہا تھا اور راجہ صاحب صرف اُس کی پیٹھ پر تھے۔ ہندوستانی لاشوں سے پٹے ہوئے میدانِ جنگ سے اِس افراتفری سے بھاگے کہ ایک دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ہزاروں کٹ مرے۔ اِس معرکے کے بعد آپ کا موجودہ پاکستان پر مکمل تسلط ہو گیا۔ باقی مہمیں تو محض دورے تھے۔ آخری سترہویں مہم میں آپ نے سومناتھ کے مندر کا عزم کیا، کیونکہ گجھ کے علاقے کی ابھی سیر نہیں ہوئی تھی۔ کسی سے یہ بھی سنا تھا کہ وہاں کی مورتی کے ماتھے میں ایک انمول لعل جڑا ہے اور اُس کے پیٹ میں سونے کی بہت سی اینٹیں ہیں۔

گجھ کے معرکے میں بہت سے اونٹوں کو پانی سے بھر کر ہمراہ لے گئے، کیونکہ تھر کے صحرا میں پانی کی سخت قلت تھی۔ لشکر کے لیے پانی کا ذخیرہ اونٹوں کے پیٹ چاک کر کے مہیا ہوتا تھا۔ سومناتھ کے مندر میں داخل ہو کر آپ نے دستِ مبارک سے گرز چلا کر مورتی کو توڑا۔ اِس کے بعد غازی بت شکن کا لقب اپنے لیے منظور فرمایا۔

آپ کا ایک غلام بڑا چہیتا اَیاز تھا۔ یہ اُس پر جان چھڑکتے تھے، وہ اُن پر۔ اِس کو کافی سر پر چڑھا رکھا تھا۔ بقول علامہ اقبال دونوں ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے۔

آپ اربابِ فن و اہلِ کمال کے بھی بڑے شیدائی اور قدر دان تھے جیسا کہ اکثر بادشاہ ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں اِن کے دربار میں ان کی اتنی کثرت تھی کہ وہ ٹکے کے بیس بکتے تھے۔ ان کی وجہ سے غزنی تمدنی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت سے عالمِ اسلام کے درالخلافہ بغداد کی ہم سری کرنے لگا۔ مسلمانوں کے جید عالم، فاضل اور صاحبانِ جوہر اپنے اپنے ملکوں سے بھاگ کر غزنی میں آ کر آباد ہو گئے۔ جہاں سرکاری وظیفہ ملتا تھا۔ مشہور حساب دان، فلسفی، اختر شناس، سنسکرت کا ودوان البیرونی آپ کے دربار کی زینت تھا۔ ایک روایت کے مطابق شہرہ آفاق شیخ چلی بھی اپنے وطن بدخشاں سے یہیں نقل مکانی کر آئے تھے اور شاہی مطبخ کے مہتمم اعلیٰ کا عہدہ اُنھیں تفویض تھا۔ ہوشنگ قدیم کا سب سے بڑا شاعر فردوسی جس نے نظم شاہنامہ لکھی، آپ کے دربار میں ایک مدت رہا۔ فردوسی نے یہ نظم جو ساٹھ ہزار بندوں پر مشتمل تھی اور جسے مکمل کرنے میں اسے پینتیس برس لگے، آپ کی خدمت میں گزار دی۔ اُس وقت آپ کمال فیاضی اور دریا دلی سے ترنگ میں کہہ بیٹھے کہ جتنے اشعار نظم کے ہوں، اتنی ہی اشرفیاں فردوسی کی جھولی میں ڈالی جائیں۔ آپ کو پتا نہ تھا کہ ساٹھ ہزار شعر کل ہیں جن کی ساٹھ ہزار اشرفیاں بن جائیں گی، ورنہ یہ غلطی نہ کرتے۔ جب شاہی خزانے کے عمال نے حساب لگا کر آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، تو آپ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اپنی بات سے پھر گئے۔ فردوسی کو طلب کر کے سمجھایا کہ کم اجرت پر راضی ہو جائے یا نظم کے بندوں کو گھٹا دے۔ وہ نہ مانا۔ کہنے لگا ساٹھ ہزار اشرفیاں لوں گا، نہ کم نہ زیادہ۔ آخر فردوسی کو حیص بیص کے بعد بیس ہزار درہم دیے، اشرفیاں نہیں۔ فردوسی طیش کھاتا جلتا بھنتا سیدھا حمام میں گیا۔ حمام سے باہر آ کر اُس نے جو کے مشروب کی ایک مشک خریدی اور بیس ہزار درہم کی رقم کو عطار اور حمام کی خدمت

گار کے درمیان بانٹ دیا۔ پھر فردوسی چپکے سے بوریا بستر لپیٹ غزنی سے بھاگ کر ہرات چلا گیا۔ ہرات میں بھی ایک چھوٹا موٹا سلطان تھا۔ اُس کے دربار میں کچھ عرصہ رہ کر اپنے وطن طوس شریف کو لوٹا۔

سلطان محمود غزنوی پہلے تو فردوسی کے بھاگ جانے پر بڑے سیخ پا ہوئے۔ یہ نظم شاہنامہ، اُن کے نام منسوب تھی اور کسی نے کان میں ڈالی کہ اب فردوسی سلطان کی ہجو لکھ رہا ہے۔ بدنامی سے آپ ڈرتے تھے۔ سوچ کر حکم دیا کہ ساٹھ ہزار دینار کی قیمت کا فیل فردوسی کو دینے کے لیے شاہی اونٹوں پر لاد کر طوس پہنچایا جائے۔ فیل بخیر و عافیت طوس پہنچ گیا، مگر جب فیل سے لدے اونٹ شہر کے ایک دروازے سے طوس میں داخل ہو رہے تھے، فردوسی کا جنازہ شہر کے دوسرے دروازے سے تدفین کے لیے باہر لے جایا جا رہا تھا۔

فردوسی شیعہ تھا اور سُنی فقیہہ شہر نے میت کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اُس کے جسدِ خاکی کو ایک نخلستان میں دفن کرنے لے جا رہے تھے جو شہر کی دیواروں کے باہر تھا اور شاعر کی ملکیت تھا۔ فردوسی کی زندہ اولاد ایک بیٹی تھی۔ اُس نے بھی فیل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کے کہنے پر اس رقم کو طوس کے نواح میں ایک سرائے کی مرمت پر لگا دیا گیا، لیکن اِس واقعے سے آپ کے نام کو جو بٹہ لگا، وہ آج تک نہیں دھل سکا۔ حالانکہ آپ کی کوئی غلطی نہ تھی۔ فردوسی سے پہلے شعروں کی تعداد پوچھ لیتے، تو پہلے ہی مناسب اجرت مقرر کرتے۔

اس واقعہ کی وجہ سے مرتے دم تک پشیمانی سے ہاتھ ملتے رہے۔ آپ کی خوش نصیبی کہ فردوسی نے جو پانچ سو اشعار کی ہجو آپ کی شان میں کہی تھی، وہ شاعر نے خود یا کسی اور نے پھاڑ ڈالی۔ اُس کا کہیں پتا نہیں ملتا کہ کہاں گئی، کیا ہوئی۔

شیخ چلی

آپ کو کون نہیں جانتا۔ مشرق کی مشہور ترین شخصیتوں میں آپ کا نام ابھی تک احترام اور تعظیم سے لیا جاتا ہے۔ آپ بدخشاں یا شیراز کے ایک کوزہ گر کے ہاں تولّد ہوئے اور اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ چھے برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا اور یہ یتیم ہو گئے۔ وہ اِنھیں اِن کی بعض عاداتِ بد کی وجہ سے زدوکوب کرتا رہتا تھا۔ اِس لیے اِن کو زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ ماں بے چاری محنت مزدوری کر کے کسی نہ کسی طرح اِن کا اور اپنا پیٹ پالتی رہی۔ بلا کے پیٹو تھے اور کھانے سے جی نہیں بھرتا تھا۔ ماں نے ایک مُلّا کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھایا، لیکن لکھائی پڑھائی میں دل نہ لگا اور جب تین چار سال بعد مکتب سے اُٹھا لیے گئے، تو کورے کے کورے تھے۔

کوزے تو اُنھوں نے کیا بنائے تھے، باپ نے جو کوزے بنائے تھے، وہ بھی توڑ ڈالے۔ مسیّں بھیگنے لگیں، تو ماں نے سوچا کہ اِنھیں کسی کام پر لگایا جائے تاکہ اپنی روٹی کمانے کے لائق ہو جائیں۔ یہ کما کر روٹی کھانے کے قائل نہ تھے۔ اِن کی ماں نے اِنھیں ایک گدھا خرید دیا اور ایک کمہار کی شاگردی میں رکھا۔ یہ گدھے پر سیریں کرتے رہتے اور آخر اُسے ایک بانسری کے بدلے ایک چرواہے کو دے دیا۔ سخاوت گھٹی میں پڑی تھی۔ ایک دن ماں نے ٹوکری میں کچھ انڈے دے کر اِن کو بازار بھیجا کہ بیٹا اِن کو بیچ آؤ۔ یہ ٹوکری سر پر رکھ کر بازار گئے اور اِسے سامنے رکھ کر انڈے لے لو، مرغی کے تازہ انڈے لے لو، کی ہانک لگانے لگے۔ دو تین انڈے بیچے بھی، پھر خیالی پلاؤ پکانے لگے اور اس میں اتنے مگن ہوئے کہ ٹوکری کو چین کی شہزادی گمان کر کے لات جو ماری تو ٹوکری اُلٹ گئی اور سب انڈے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ خالی ٹوکری لیے گھر کو آئے۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ سمجھ گئی کہ وہ کسی کام کے نہیں۔ اِن کو کسی کاروبار میں ڈالنا وقت ضائع کرنا ہے۔

شیخ چلی بے حد تیز اور ذہین فطین شخص تھے اور اتنے نکھٹو بھی نہیں جتنا کہ ماں اِن کو سمجھتی تھی۔ بس اِن کو ہم میں سے بہت سوں کی طرح خیالی پلاؤ پکانے کی لت تھی۔ واقعی میں

آپ کے مقلدین کا شمار نہیں جو گھر بیٹھے خیال ہی خیال میں دنیا جہان کے مزے لُوٹتے ہیں۔ شیخ چلّی روٹی کمانے کے لیے کوئی واضح شریفانہ پیشہ اختیار نہ کر سکے، لیکن کون سے ایسے معرکے تھے جو خیال ہی خیال میں اُنھوں نے سر نہیں کیے۔ چنانچہ آپ سلطانِ وقت، موتیوں کے سوداگر، چین و سراندیپ کی شہزادیوں کے شوہر، بے مثل قصہ گو، نغمہ گو شاعر، شعلہ بیان خطیب، پھریرے اُڑانے والے سپہ سالار سب کچھ ہی بنے اور جو گھر میں پڑے بغیر، ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر۔

روایت ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ غزنی پہنچے کہ وہاں اہلِ علم و فضل کی قدر تھی۔ سنا تھا کہ وہاں کا سلطان محمود غزنوی وظیفے دیتا ہے۔ آدمی تھے لسان اور دِلچسپ۔ سلطان محمود اِن کی باتوں میں آ گیا اور یہ کسی طرح شاہی مطبخ کے داروغہ ہو گئے، حالانکہ ہانڈی چولہے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر ترقی کرتے کرتے مہتمم اعلیٰ بھی ہوئے۔ ایک دن عصائے ساحری لہراتے ہوئے شاہِ جنات کو مارنے کو دوڑے کہ کوٹھے پر سے گرے اور جاں بحق ہوئے۔ ہر دِل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ جنازے میں سارا غزنی شہر اُمڈ پڑا اور لوگ اُن کے لطیفے یاد کر کے روتے تھے۔ اللہ بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

شیر شاہ سوری

آپ کا اصل نام فرید خان تھا۔ سارا رام بہار میں غالباً ۱۴۸۶ء میں ایک افغان حسن خان کے ہاں دو دو مسعود فرمایا۔ والد گھوڑوں کی پرورش اور فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ سخت گیر باپ سے کسی بات پر ناراض ہو کر گھر چھوڑا اور جونپور کے صوبے دار جمال خان کی اردلی میں لشکری بھرتی ہو گئے۔ بعد ازیں بہار میں ایک مغل شہزادے کی ملازمت کر لی۔ وہاں ایک جنگ میں ایسی شجاعت اور مردانگی دکھائی کہ اُس نے شیر خان کا نام آپ کو دیا۔ ۱۵۳۹ء میں بنگال کے باغیوں کی سرکوبی کی اور بہار کی صوبے داری اپنے ہاتھ میں لی۔ آداب دستر خوان سے بے گانہ تھے۔ اِن کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک شاہی ضیافت میں بھنے ہوئے گوشت کی قاب سامنے آئی، تو جھٹ اپنی تلوار میان سے نکالی اور اِس سے گوشت کاٹنے لگے۔ اِس حرکت پر سب دم بخود رہ گئے۔ ہمایوں تاڑ گیا کہ شیر شاہ صاحب کے تیور درست نہیں۔ اِسی سال جون کے مہینے میں ہمایوں کی گردن ناپی اور اُسے شکست دے کر فرید الدین شیر شاہ سوری بن کر سربراہِ سلطنتِ ہندوستان ہوئے۔ بے چارہ ہمایوں جان بچانے کی خاطر اپنی بیگمات کے ہمراہ سالوں سندھ اور ایران کے دشت و صحرا کی خاک چھانتا پھرا، مگر جب تک فرید الدین شیر شاہ سوری زندہ رہے، ہمایوں کی دال نہ گلی۔

آپ نے ملک کے نظم و نسق کو درست کیا۔ مال گزاری اور مالیات کا ایک ایسا نظام نافذ کیا کہ بدنیت اور بدعمل اس کے شکنجے سے نہیں نکل سکتے تھے۔ ملک میں ہر سو امن و امان اور خیر و عافیت کا دور دورہ تھا۔ جیسا کہ آج کل ہمارے ملک میں ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے اور علیک سلیک کے بعد اپنی اپنی راہ لیتے تھے۔ آپ نے گرانڈ ٹرنک روڈ یا نیشنل ہائی وے کی داغ بیل ڈالی۔ مسافروں کے لیے سرائیں، کنوئیں اور پُل تعمیر کرائے۔ اِن کنوؤں میں اب تک بچوں اور مویشیوں کے گرنے کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ بعض سراؤں کو اب کالج میں زیرِ تعلیم طلبا اور طالبات کے لیے ہاسٹل بنا دیا گیا ہے۔ ان ہاسٹلوں میں تحصیلِ علم کرنے والے نوجوانوں کو مستقلاً چمگادڑوں، اُلوؤں اور چھپکلیوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ شیر شاہ نے نیشنل ہائی وے پر گھوڑوں اور سانڈنیوں کی ڈاک چوکیاں بھی بٹھائیں۔ اِتنا اعلیٰ انتظام تھا کہ لاہور سے پشاور چٹھی دو دِن اور دو راتوں میں پہنچ جاتی تھی۔ آج کل سات دن اور سات راتوں میں پہنچتی ہے۔ آپ نے عوام الناس کی بھلائی کے اور بھی کام کیے جو اِس

وقت یاد نہیں آرہے۔ گھر چھوڑنے کے بعد اُنھوں نے وہاں کا دوبارہ رخ نہیں کیا۔

ایک مقام ہے کالنجر، اِس کے محاصرے کے دوران ایک تیر شیر شاہ کی گردن میں پیوست ہوا اور وہ مارا گیا۔ چند سال اور جیتا، تو سلطنت مغلیہ کا نام سننے میں نہ آتا۔

نین سُکھ ہاتھی

آپ کی رنگت سفیدی مائل بھوری تھی۔ ابھی چھے سال کے بچے تھے اور آغازِ طفولیت تھا کہ سیام کے جنگلوں میں ایک شاہی ہانکے میں پکڑے گئے۔ سیام کے مہاراج نے اُنھیں ایک عجوبہ یادگار تحفہ جانتے ہوئے ایک جواں سال مہاوت سمیت ملک ہندوستان کے مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی خدمت میں بھجوایا۔ جس وقت سیام کے سفیر نے اِس ہاتھی کو بمعہ دو سیامی بلیوں اور دیگر نوادرات کے اکبر کے دربار میں پیش کیا، تو وہ بہت خوش ہوا۔ شہنشاہ اکبر کو ہاتھیوں کا بڑا شوق تھا۔ اور اُس کے اِس شوق کو دیکھتے ہوئے وہ امرا جو اُس کی خوشنودی کے طلب گار ہوتے، اُسے ہاتھی نذر کرتے۔ اُس کے دربار میں اکثر پنج ہزاری، دس ہزاری اپنے ہاتھیوں کی بدولت ہوتے تھے۔ بادشاہ کے دل میں راہ پانے کا یہ ایک طریقہ تھا۔ شہنشاہی فیل خانے میں اس نئے سیامی ہاتھی کی رنگت اور معصوم صورت کا ہاتھی اور کوئی نہ تھا۔ شہنشاہ نے نام مبارک نین سُکھ رکھا اور حکم دیا کہ نونہال کو شاہی ہاتھیوں میں شامل کیا جائے۔ آپ کا راتب بھی مقرر ہوا۔ نین سُکھ طفولیت میں تو معصوم، خوش خصال اور اُصیل تھے، مگر جونہی عنفوانِ شباب میں قدم دھرا، پر پُرزے نکالے۔ ساری ہیئت، چال ڈھال ہی بدل گئی۔

بعض اوقات مہاوت کی بھی نہ سنتے، بلکہ اکثر نہ سنتے۔ جب وہ اُنھیں دوسرے شاہی ہاتھیوں کے ساتھ جمنا ندی پر پانی پلانے اور نہلانے لے جاتا، یہ بازار میں بتیائی اور بتھنیوں کے پیچھے مستی کرنے لگتے۔ اپنے کرتوت کی بدولت جلد ہی بدمستی اور بدخوئی میں بدنامِ عالم ہوگئے۔ شہنشاہ کو تو طوعاً و کرہاً اپنی پیٹھ پر بیٹھنے دیتے۔ دوسرے کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کے نزدیک پھٹکے۔ تعلیم کے بعد انھیں لڑنے والے ہاتھیوں میں چُن لیا گیا اور انھوں نے لڑائی بھڑائی میں بڑا نام پیدا کیا۔ بڑے بڑے دیوہیکل، باروت کے ڈھیر ہاتھیوں سے ٹکریں لیں اور اُنھیں بھگا دیا۔ خاص خاص شاہی مجرموں کو پاؤں تلے روندنے کے لیے عموماً آپ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ یہ اِس کام کو اِس پامردی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے کہ مجرموں کا چُورا چورا کر دیتے۔ مارواڑ کی لڑائیوں میں بھی اِنھوں نے کارہائے نمایاں دکھائے اور میدان سے نہیں بھاگے۔

جہانگیر تخت پر بیٹھا، تو اُس نے اِن کو طلائی زنجیر کی خلعت اور دو ہزاری کے منصب سے سرفراز کیا اور حکم دیا کہ اِنھیں دولت خانہ خاص میں باندھیں۔ کہتے ہیں دربارِ خاص میں بھی آستان بوسی کی سعادت حاصل تھی اور یہ دوسرے امرا کے ساتھ اگلے گھٹنے ٹیک کر ڈنڈوت کرتے اور سونڈ اُٹھا کر مجرا بجالاتے تھے۔

جشنِ نوروز پر بادشاہ نے حکم دیا کہ شراب اور دیگر نشہ آور اشیا کی ہر شخص کو استعمال کرنے کی عام اجازت ہے، چنانچہ نین سُکھ نے بھی اس کا خوب فائدہ اُٹھایا۔ جہانگیر نے ایک شراب سے لبالب بھرے حوض کے کنارے اپنے مصاحبین اور مقربین کی ایک محفلِ مے نوشی منعقد کی۔ نین سُکھ بھی اپنے مہاوت کی معیت میں زردوزی جھول پہنے، مستک پر دیوزادی نقش ونگار بنائے وہاں براجے اور حوض سے سونڈ بھر بھر کر انڈیلنے لگے۔ منوں شراب پی گئے۔ اس معاملے میں حیثیت اچھی تھی اور کسی سے پیٹے نہ تھے۔ بادشاہ بھی خوش شغل تھا۔ موج ورنگ میں کبھی ایک امیر کبھی دوسرے امیر کی طرف اشارہ کرتا اور نین سُکھ اُس پر سونڈ سے بھری شراب کا فوارہ چھوڑ دیتے، چونکہ موقع نشاط اور خوش طبعی کا تھا، سب نے لطف

اُٹھایا اور کسی نے نین سُکھ کی اِس حرکت کا برا نہ مانا۔ نین سُکھ اب ادھیڑ عمر کے ہو چلے تھے۔ جوانی کی بدمستی اور سرشاری پہلے کی سی نہ رہی تھی۔ بالآخر بادشاہ نے انھیں اپنے خاصے کے ہاتھی ہونے کا شرف بخشا اور جشن وجلوس کے موقع پر انھی پر سوار ہو کر نکلتے۔ اس وقت ان کی سج دھج دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ زرق برق جھول پر طلائی عماری، سر سے پاؤں تک موتیوں کی جھالروں میں غرق، دانت زرنگار وَرقوں سے منڈھے۔ دوسرے شاہی ہاتھی بال سندر، سمن بال، رام پرشاد وغیرہ ان کی شان اور رُتبہ دیکھ کر جلتے تھے، مگر ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ ایک دفعہ دکن کی ایک مہم میں بادشاہ نے ان پر ایک سو میل کا سفر طے کیا۔ راستے میں ایک گھوڑے سے اس کی دوڑ کرائی۔ یہ گھوڑے سے زیادہ پیچھے نہیں رہے۔

ہر کمالے را زوالے، نین سُکھ پر بھی بڑھاپا آنے لگا۔ بادشاہ نے نور بخت ہاتھی کو اپنا خاصے کا ہاتھی مقرر کیا۔ اِس بات کا نین سُکھ کو بڑا صدمہ ہوا، حالانکہ بادشاہ نے ترقی دے کر سہ ہزاری کر دیا تھا اور اعزاز ومدارت میں بھی کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اب بھی دولت خانہ خاص میں بندھتے تھے۔ پہلے کی طرح غسل کے لیے نیم گرم پانی مشک کے ذریعے ان کی سونڈ میں چڑھایا جاتا رہا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل ان کو ناپسند تھا یا ممکن ہے عمر کے تقاضے سے حرارتِ عزیزی دھیمی پڑ گئی ہو اور یہ ٹھنڈے مانی کو برداشت نہ کر سکتے ہوں۔

جہانگیر کی وفات کے بعد جب شاہ جہان دلّی کے تخت پر بیٹھا، تو نین سُکھ پچپن چھپن برس کے ہو چکے تھے۔ شاہ جہان نے ان کی قدر نہ کی کہ پرانے وفادار اور نمک حلال ہیں۔ شاہ جہان نے حکم دیا کہ انھیں دولت خانہ خاص سے لے جا کر شاہی فیل خانے میں باندھا جائے۔ انھی دنوں جب ایک نامی پہلوان بھالو خان نے شاہی دنگل میں گجرات کے رستم ہندوستان کو پچھاڑا۔ بادشاہ نے ازعنایت خسروانہ نین سُکھ ہاتھی بھالو خان کو مرحمت کیا۔ بھالو خان کو یہ اعزاز قبول کرنا پڑا۔ بھالو خان خود کھا تا یا ہاتھی کو کھلاتا۔ اپنے گاؤں آ کر اُس نے نین سُکھ کو بیچنے کی خاطر ہزار کوشش کی، مگر کوئی انھیں لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اِس گاؤں میں لوگوں کو ہاتھی کا شوق نہ تھا۔ پاس کے ایک قصبے کے تعلق دار کو بھالو خان پر رحم آیا اور اُس نے نین سُکھ کو سو روپے میں خرید لیا جو آج کل کے ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ تعلق دار کے اصطبل میں پہنچنے کے ایک پہلے روز ہی نین سُکھ نے استفراغ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی حالت مردنی ہوتی گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے ڈھیر ہو گئے۔ اللہ کی شان وہ ہاتھی جس کی کُل زندگی شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور جاہ وجلال میں گزری تھی، اِتنی بے بسی اور بے چارگی میں جان دے کہ کوئی اِس کا پرسانِ حال نہ ہو۔

آپ نے اپنے پیچھے بہت سی اولادیں چھوڑیں، لیکن اُن میں سے کسی کی رنگت سفیدی مائل بھوری نہ تھی۔ سب فرزند کالے بھجنگ اور غبی تھے۔ ان میں سے کوئی اپنے نامور باپ کے رتبے کو نہ پہنچ پایا۔ کسی نے بتایا کہ آپ کی پانچویں پشت کا ایک لنگڑا ہاتھی تقسیم ملک سے پہلے لکھنو کے ایک بگڑے نواب کے دروازے پر جھولا کرتا تھا۔ غدر مچا، تو نواب صاحب اور اُن کا خاندان پاکستان آ گئے۔ ہاتھی بے چارے کو وہیں دروازے پر جھولتا چھوڑ آئے۔ کچھ پتا نہیں کہ پھر اس ہاتھی کا کیا بنا۔ رہے نام اللہ کا۔

◆◆◆

ایسے مولوی صاحب کا قہقہہ بار تذکرہ
جن کی جان کھانے میں اٹکی رہتی تھی

(مولوی گُڈو)

صفحہ نمبر 169 پر

آئیے آگ لگائیں

دیا سلائی سے پہلے انسان کیا کرتا تھا؟ ماچس کی دلچسپ کہانی

رانا محمد شاہد

دُعا اپنے بابا سے کہو، ماچس ختم ہوگئی ہے...... نئی لا دیں...... آج جمعہ ہے، دکانیں جلد بند ہوجائیں گی۔ بیگم نے چھے سالہ بیٹی کے توسط سے پیغام بھیجا تھا مگر باورچی خانے سے آواز بیٹھک تک بآسانی پہنچ رہی تھی۔ جہاں میں مطالعہ کر رہا تھا۔ بیگم کا کہنا ٹھیک تھا۔ کیونکہ جس دکان سے ہم مہینے کا راشن لیتے تھے، وہ دکان جمعہ سے ایک گھنٹہ قبل بند ہو جایا کرتی۔ اب دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ جلدی سے گلی کے کونے سے دیکھا تو دکان خلافِ توقع کھلی تھی۔

ماچس لیتے ہوئے میں یہی سوچتا رہا کہ اگر دکان بند ہوجاتی تو دو گھنٹے چھوٹی سی ماچس کے لیے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ ماچس ہوگی تو چولہا جلے گا، پانی گرم کریں گے، چائے بنائیں گے وغیرہ......

ماچس ہزارہا سالوں سے انسانوں کے کام آرہی ہے تو آج بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کسی جانور کے پیچھے چقماق کا پتھر اُٹھا کر بھاگ رہا تھا کہ شکار اپنی رفتار کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا۔ اُس شخص نے غصے میں آکر ہاتھ میں موجود پتھر ایک دوسرے پتھر پر دے مارا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پتھر پہ پتھر لگنے سے آگ پیدا ہوئی۔ اُس نے یہ بات قبیلے والوں کو بتائی تو قبیلے کے عقلمند آدمی سر جوڑ کر بیٹھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا خشک پتے چقماق کے پتھروں پہ پلیٹ کر انھیں ٹکرایا جائے تو آگ پیدا ہوگی اور پتے جلنے لگیں گے۔ یہ تجربہ کیا گیا اور کامیاب رہا۔ آج بھی دنیا میں موجود ایسے علاقے جہاں دیا سلائی نہیں مل سکتی۔ آگ جلانے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

دیا سلائی کی ابتدا کے حوالے سے بہت سی کہانیاں و واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے جب انسان جنگلوں میں رہتے تھے تو ان کی خوراک شکار کیا گیا گوشت ہوتا یا درختوں کے پھل اور جنگلی جڑی بوٹیاں وغیرہ۔ چونکہ انسان اپنی خوراک کے لیے جنگلی جانوروں کا شکار کرتا رہتا تھا۔ اس لیے جنگل کے جانور اسے اپنا دشمن سمجھتے اور موقع دیکھ کر حملہ کر دیتے۔ انسان کے پاس اپنی بقا کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مقابلہ کریں، خود مریں یا انھیں مار دیں۔ بعض اوقات جانور اچانک رات کے وقت حملہ کر دیتے تھے۔ لوگ درختوں یا کھوہوں پر گھر بناتے تاکہ ان حملوں سے محفوظ رہ سکیں۔ یہی وہ وقت تھا جب لوگ آگ سے ناآشنا تھے۔

انھی دنوں کی بات ہے کہ ایک رات زور سے بادل گرجے اور بجلی کڑکنے سے ایک طوفان سا آگیا۔ لوگ خوفزدہ ہوکر سہم گئے۔ پھر ایک دم بجلی کڑکی اور زبردست دھماکے کے ساتھ درخت پر جا گری۔ لوگوں نے دیکھا کہ جس درخت پر بجلی گری تھی وہاں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ انھوں نے سوچا کسی دیوتا

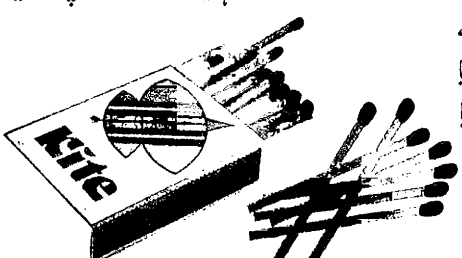

سیموئل جونز نے ماچس کی نقل بنائی۔ اس نے اپنی ماچس کا نام ''لوسی فر'' رکھا۔ اس کی تیلیاں چھوٹی تھیں اور ڈبیا بھی چھوٹی تھی، جسے ساتھ رکھنا آسان تھا۔ آگ جلانے کے لیے سلفر استعمال کیا جاتا تھا۔

نے ان پر عذاب نازل کیا ہے۔ وہ سہمے سہمے سے، سردی سے کانپتے ہوئے درخت کے قریب آئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ اب ان کے جسم کو حرارت ملی ہے اور انھیں سردی نہیں لگ رہی۔ قبیلے کے تمام لوگ بچے، بوڑھے جو سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ آگ کے قریب جمع ہو کر اپنا جسم سینکنے لگے۔ وہ آگ کی اس طاقت پر حیران تھے۔ اب اُن کے خیالات بدل گئے اور انھوں نے جانا کہ یہ کسی دیوتا کا قہر و عذاب نہیں بلکہ نعمت ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسے دیوتاؤں کا تحفہ سمجھا اور اس کی پوجا کرنے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قبیلے کے لوگ آگ کے گرد جمع ہو کر خوش ہو رہے تھے تو اچانک جھاڑی سے ایک جانور نکلا۔ سب نے پریشانی میں ہاتھ میں پتھر اُٹھا لیے۔ لیکن جانور ان پر حملہ کرنے کے بجائے دوسری طرف بھاگ گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ اس کے بعد جب بھی قبیلے والوں نے آگ جلائی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ادھر شعلے دیکھے اور اُدھر جانور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اب آگ کے حوالے سے اُن کے خیالات نے ایک اور رُخ لیا اور وہ یہ کہ دیوتاؤں نے انھیں جانوروں سے بچانے کے لیے آگ بھیجی ہے۔

وقت گزرا تو آگ جلانے کے لیے مزید نئی چیزیں سامنے آتی گئیں۔ لوگوں نے آگ کو محفوظ رکھنے اور زیادہ دیر تک استعمال کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب شعلے ختم ہونے لگتے تو اس میں لکڑیاں اور تنکے ڈال دیے جاتے۔ یہ طریقہ عرصے تک چلتا رہا۔ کیونکہ آگ بجھ جانے کی صورت میں دوبارہ جلانے میں وقت لگ جاتا یا قبیلے کے لوگ آگ جلا کر سوئے، صبح صرف کوئلے رہ گئے۔ یوں دوبارہ آگ جلانے میں خاصی محنت اور وقت لگا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آگ جلانے میں جدت آتی گئی۔ چولہے ایجاد ہوئے، تو آگ جلانے کے کئی طریقے بھی آ گئے۔ جب لوگوں کو گندھک، فاسفورس اور پٹاس کے فوائد کا علم ہوا تو مختلف طرح کی دیا سلائیاں بننے لگیں۔

سب سے پہلی دیا سلائی 1826ء میں جان واکر نے ایجاد کی۔ اُس ماچس کے سرے پر پوٹاشیم کلوریٹ (جو ایک طاقتور تکسیدی عمل ہے اور اینٹی من سلفائیڈ پر مشتمل ہے) گوند اور کھانڈ لگی ہوتی تھی۔ اسے جب گندھک کے تیزاب میں

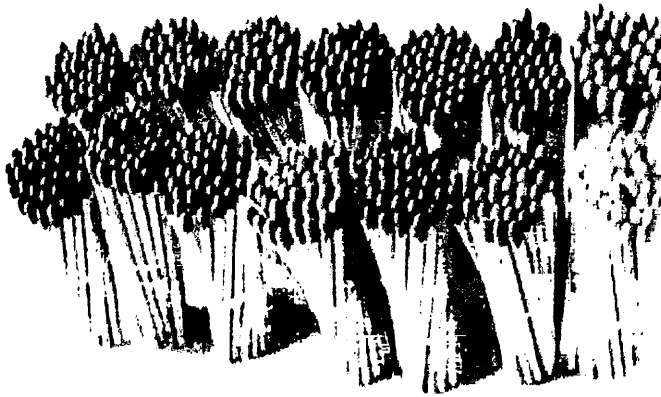

ڈبویا جاتا تو آگ پیدا ہوتی۔

کچھ عرصے بعد اس میں تبدیلی کی گئی اور رگڑ سے جلنے والی دیا سلائیاں بننے لگیں۔ ان کے سروں کو پگھلی گندھک میں ڈبویا جاتا اور پھر ان پر پوٹاشیم کلوریٹ اینٹی من سلفائیڈ اور فاسفورس کا مرکب چڑھا کر وارنش میں ڈال دیا جاتا۔ ان دیا سلائیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ انھیں کسی بھی کھردری جگہ پر رگڑ کر جلایا جاتا تھا۔ یہ طریقہ بھی کم خطرناک نہ تھا۔ کیونکہ بعض اوقات اتفاقاً معمولی رگڑ سے دیا سلائی جل اُٹھتی اور آگ لگ جاتی۔

آج کی دیا سلائیاں بہت محفوظ ہیں۔ اسی لیے انھیں سیفٹی ماچس یا محفوظ دیا سلائی کہا جاتا ہے۔

سیفٹی ماچس یا محفوظ دیا سلائی 1885ء میں سویڈن سے تعلق رکھنے والے ایک شخص جے ای سٹروم نے ایجاد کی۔ ماچس کی تیلی کے سرے پر ایک آمیزہ (Glue) سے چپکا دیا جاتا ہے۔ یہ آمیزہ ماچس کی ڈبیا کے دونوں اطراف پر بنی مخصوص سطحوں پر رگڑنے سے شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ رگڑ سے جو معمولی سی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ وہ تھوڑے سے سرخ فاسفورس کو سفید فاسفورس میں تبدیل کرتی ہے۔ جو فوراً جل اٹھتا ہے۔ پیدا شدہ حرارت تیلی کے سرے پر لگے کیمیکلز کے آمیزے کو بھڑکا دیتی ہے۔ جو چولہے لکڑی یا کاغذات کو آگ لگانے کے کام آتی ہے۔

اس سیفٹی ماچس کو کسی بھی سطح پر رگڑ سے جلایا جاتا اور یہ ایجاد 1898ء میں فرانس کے دو لوگوں ایچ سیون اور ای کاہن کی مرہون منت ہے۔ اس میں پوٹاشیم کلوریٹ، ٹیٹرا فاسفورس ٹرائی سلفائیڈ، پسا ہوا شیشہ زنگ اور آئرن آکسائیڈ کا آمیزہ گوند کے ساتھ لگایا ہوتا ہے۔ رگڑ سے اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ پوٹاشیم کلوریٹ اور فاسفورس کے درمیان کیمیائی تعامل سے آگ لگ جاتی ہے۔

آج استعمال ہونے والی دیا سلائی کو اس لیے محفوظ قرار دیا جاتا ہے کہ اس میں ڈبیا کی سطح پر فاسفورس، اینٹی منی سلفائید پسے ہوئے شیشے اور سریش کی ملاوٹ کا لیپ دیا جاتا ہے۔ جب تک دیا سلائی کو اس سطح پر نہیں رگڑا جاتا، آگ پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ طریقہ محفوظ ترین ہے۔ ◆◆◆

یہ جتنا معصوم ہے اتنا ہی

بدد ماغ بھی

"ہاتھی میرے ساتھی"

میں پڑھیے دلچسپ معلومات

صفحہ نمبر 160 پر

ایمل رضا

گردار سازی

وقت ایسا "جن" ہے جو سب کچھ کھا جاتا ہے اور حالات و واقعات کی باقیات تک نہیں چھوڑتا

اور کتنی خواہش تھی مرزا جی کی کہ جب وہ بھرے پُرے ہال میں اپنا افسانہ پڑھ کر سنائے تو سارے ہال کو گویا سانپ سونگھ جائے۔ سب ایسے ششدر رہ جائیں کہ نہ تالی بجا سکیں نہ واہ واہ کہہ سکیں۔ جیسا کہ اُن کی شاعری سنانے کے وقت ہوا کرتا تھا۔ جو غزل ابتداء میں سطحی پن لیے ہوتی وہ مقطع تک پہنچتے پہنچتے ایسی گہری ہو جاتی کہ سننے والوں کو سمجھنے کے لیے ابتدائی شعر یاد کرنے پڑتے تھے۔

افسانے کو لے کر بھی مرزا جی کچھ ایسی ہی چاہت رکھتے تھے کہ افسانے کا پلاٹ، الفاظ، منظر نگاری اور کردار نگاری ایسی ہو کہ سننے والے سر دھنتے رہ جائیں۔ بنا طبلے اور گویے کے حال کھیلنے کا سماع بندھ جائے لیکن مرزا جی کی یہ خواہش، خواہش ہی رہی..... بلکہ اُن کی زندگی کی آخری خواہش ثابت ہوئی..... ان کا لکھا کوئی افسانہ کسی کو پسند نہ آ سکا، نہ لفظوں نے کسی کو اپنا گرویدہ کیا، نہ منظر نگاری میں کوئی کھویا اور نہ کردار نگاری کسی پر کوئی اثر ڈال سکی۔

ویسے شاعری میں تو بہت نام کمایا تھا مرزا جی نے..... فیض اور فراز کے بعد لوگ مرزا جی کا نام لیا کرتے۔ غزلیں کہیں، اعلیٰ معیار کی رباعیات لکھیں، آزاد نظم پر تو ایسا عبور تھا کہ سب پڑھ کر دم بخود رہ جاتے تھے۔ کچھ ایک دو گیت بھی لکھے، جنہوں نے بے پناہ شہرت سمیٹی..... پھر کسی نے مشورہ دیا کہ نثر کی طرف آؤ..... افسانے پر ہاتھ ڈالو اور منٹو، پریم اور بیدی کی شہرت کو ٹکر دو۔

"نہیں بھئی..... یہ افسانہ نویسی مجھ سے نہ ہو گی۔ عجیب سا ڈر رہتا ہے کہ کرداروں کے ساتھ انصاف نہ کر پاؤں گا۔ کردار جو چاہتا ہو گا میں اس کے ساتھ ویسا نہ کر سکوں گا بلکہ اس پر اپنی مرضی مسلط کروں گا۔"

بس یہ ہی وجہ تھی۔ جو انھوں نے آج تک کوئی کہانی نہ لکھی۔ ورنہ افسانوں کے خیال تو بہت تھے

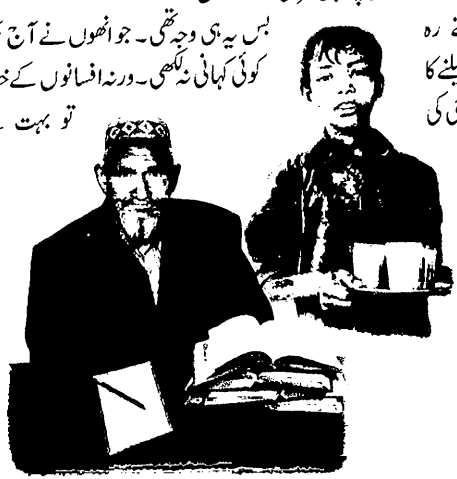

ان کے پاس اور ناول تو کیا کیا شاہکار تھے لیکن ایسے شاہکار کا کیا کرنا جو ذہن میں ہی رہے۔ شاہکار تو وہ ہوتا ہے جو ذہن سے عمل کے پل صراط پر گزر کر دنیا کے بازار میں اپنی رونمائی کروائے اور داد سمیٹے.....

پھر کچھ ایسا بھی تھا کہ انھیں لگتا افسانہ اور افسانہ نویس دونوں ہی جھوٹ کا پلندہ ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے مصنف اپنی کہانیوں میں بڑے بڑے فتوے تو دیتے نظر آتے ہیں لیکن عملاً وہ صفر ہوتے ہیں۔ انھیں لگتا افسانہ دراصل سراسر منافقت کا کاروبار ہے۔ جو جتنا برا ہو کر جتنا اچھا بولتا ہے اتنا ہی بڑا مصنف کہلاتا ہے لیکن اتنی کڑوی بات کہنے کی ہمت نہ ہوتی تو سب کو یہ ہی کہہ کر ٹال دیتے کہ مجھ سے کرداروں کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔

''کمال کرتے ہوئے بھئی..... تم سے کس نے کہا ہے کہ کرداروں کے ساتھ انصاف کرو..... تم بس لفظوں کے ساتھ انصاف کرو..... کرداروں کے ساتھ خود بخود ہی انصاف ہو جائے گا۔''

''ہادی صاحب'' نے ایک دن انھیں مشورہ دیا تھا اور یہ بات مرزا جی کے دل کو لگی۔ ہمت کر کے ایک رات کاغذ قلم سنبھالا، ارادہ تو غزل کہنے کا تھا لیکن رات بیتی تو صفحے پر جا بجا افسانہ پھیلا ہوا تھا۔ لفظ ہی لفظ، کردار ہی کردار..... صبح بیدار ہو کر پھر سے پڑھا تو کچھ کچھ دل کو لگا۔ شام ہوئی تو اسے لے کر ''چائے خانہ'' پہنچ گئے۔ جہاں ہر طرح کے شاعر اور مصنف بیٹھ کر باتوں کی دل لگی کیا کرتے تھے۔ کچھ اچھے، کچھ منافق، کچھ حاسد، کچھ کسی کو کچھ نہ سمجھنے والے، کچھ خود کو سب کچھ سمجھنے والے.....

اب مرزا جی چاہے جتنے مرضی بڑے شاعر تھے، لیکن ان کا پہلا افسانہ ان کے لیے وہ پہلا قدم تھا جس پر انھیں اپنے سے بڑوں کا ہاتھ ہی تھامنا تھا۔ جھٹ سے فوٹوں کا پیاں سب میں بانٹ دیں اور خود ایک طرف بیٹھ کر سب کی رائے کا انتظار کرنے لگے۔ سب نے تقریباً ایک ساتھ افسانہ ختم کیا، پھر معنی خیزی سے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔ رائے تو کیا دینی تھی کچھ نے تو بے قدری سے افسانے کے پلندے کو ایک طرف ڈال دیا۔ کچھ نے منہ بنایا، کچھ اُٹھ کر چائے پینے چلے گئے، کچھ استہزائیہ ہنسنے لگے اور کچھ نے ''ہمدردی'' کی.....

''چائے خانہ'' کی گرم بھاپ مرزا جی کے وجود کے گرد لپٹ گئی۔ وہ صرف ایک کامیاب نہیں بلکہ جانے مانے مستند شاعر تھے۔ آج تک صرف تعریف ہی تعریف سنی تھی۔ ایسی ''خاموش تنقید'' کیسے برداشت کرتے بھلا..... اب جب اس میدان میں اُتر ہی پڑے تھے تو انھیں ہر صورت خود کو منوانا تھا۔ اگلا ایک ہفتہ وہ گھر میں بند رہے۔ تین چار افسانے ایک ساتھ لکھے۔ شام ہوئی تو پھر سے ''چائے خانے'' کا رُخ کیا۔ فوٹو کاپیاں سب میں بانٹی گئیں اور پھر سے وہی عمل دہرایا گیا۔ سب دائیں بائیں ہو کر ہنسنے لگے۔ مرزا جی کے دل میں جیسے کسی نے برچھی اُتار دی۔

''آپ صاحبان مجھے بتا سکتے ہیں کہ خرابی کہاں ہے؟''

''کردار نگاری میں.....'' کہیں سے آواز آئی۔

''مطلب.....؟''

''آپ سے کردار نگاری ٹھیک سے نہیں ہو پا رہی مرزا جی..... آپ کے چور پر لوگوں کو پیار آ رہا ہے، ملزم پر رحم..... مقتول پر غصہ اور قاتل پر ترس..... اس سب نے مل کر آپ کے افسانے کو قابل رحم بنا دیا ہے۔ جھول دار.....''

''قابل رحم، جھول دار.....'' رات سونے کے لیے لیٹے تو یہ دو الفاظ ان کے کانوں میں سیسہ اُتارتے رہے۔ انھیں لگا انھوں نے اب تک جو شاعری کی ہے وہ بھی رفتہ رفتہ بیکار ہونے لگی ہے۔ ان کے سارے اثاثے ختم ہونے لگے ہیں۔ وہ جو خواہش دل کے نہاں خانے میں چپکے چپکے پنپنے لگی تھی کہ جب وہ بھرے پُرے ہال میں اپنا افسانہ پڑھیں تو سارے ہال کو سانپ سونگھ جائے۔ اس خواہش کا جیسے کوئی قتل کر رہا تھا۔

اب افسانہ ان کے شوق سے زیادہ ان کی ضد بن چکی تھی۔

اگلا ایک ہفتہ پھر سے افسانوں کی نذر کیا گیا۔ چور کو چور بنانے کے لیے..... ہیرو کو ہیرو بنانے کے لیے..... لیکن کہیں نہ کہیں آخری آنچ کی کسر پھر سے رہ ہی گئی۔

''کیوں ہلکان ہو رہے ہیں مرزا جی..... اچھے خاصے شاعر ہیں آپ..... افسانے نہیں لکھ پا رہے تو پھر کیا ہوا.....؟''

''کیا اب کی بار بھی غلطی دہرا رہا ہوں۔''

''غلطی کو مانیں گے تو اس سے اجتناب کریں گے ناں..... ویسے سب ٹھیک ہے۔ الفاظ ٹھیک ہیں، پلاٹ جاندار ہے، لیکن..... کردار نگاری پر آ کر بات رہ جاتی ہے۔''

اب کے مرزا جی گھر جانے کے بجائے سیدھا لائبریری گئے۔ کردار نگاری کے موضوع پر موجود ساری کتابیں نکلوا لیں۔ کچھ بڑے لوگوں سے ملے..... جس کو جو سمجھ میں آیا کہہ دیا۔

''بھئی پہلے کردار نگاری کو سمجھو، پھر افسانہ لکھو..... ڈاکو کو ''السلام وعلیکم'' کہتے نہ دِکھاؤ..... وہ تو ماں بہن کی گالی دے گا ناں..... تم ماں بن کر افسانہ لکھ رہے ہو..... سفاک بن کر افسانہ لکھو..... اب دیکھو تم نے یہاں کیا لکھا ہے کہ بدمعاش نے جوان لڑکیوں اور عورتوں کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھا۔ اب تم ہی بتاؤ! بدمعاش ایسی شریفوں والی حرکتیں کرے گا تو وہ بدمعاش کہاں سے لگے گا؟''

''لیکن اسے ایسا ہونا تو چاہیے۔ ہر مرد کو شریف ہونا چاہیے، یہ ہی تو ہمارا مذہب اور معاشرہ ہمیں سکھاتا ہے۔''

''یہ تمہاری سوچ ہے اور تمہاری سوچ کو دنیا پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے تمہارے افسانے بے جان ہیں۔''

لیکن مرزا جی سے سفاک نہ ہوا گیا۔ وہ معاشرے کی ماں ہی بنے رہے۔ تھے بھی تو ایسے ہی رحیم شحیم سے..... کبھی کسی سے سخت سست نہ کہا تھا۔ اسی لیے اب ان کے کردار بھی چاہ کر بھی کسی کے ساتھ برا نہیں کر پا رہے تھے۔ ان کا چور بھی ایسا ہوتا جو چوری کرنے کے بجائے اپنا سب کچھ لٹوا دیتا تھا۔ ہیرو پیار ایسے کرتا جیسے پورے معاشرے کا مائی باپ ہو۔ ہیروئن ایسے شرماتی جیسے پوری دنیا پر لحاف اوڑھا رہی ہو..... ان کی طوائف شریف زادی تھی، سائیڈ ہیروئن بہن بہن سی لگتی، ولن کوئی پہنچا ہوا درویش معلوم ہوتا..... وہ چھچھوری حرکتیں تو ان افسانوں میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملتیں جو دوسرے افسانہ نگار بڑے مزے سے اپنے افسانوں میں ڈال دیا کرتے تھے۔

''تم چھوڑ دو یہ کام..... دو کشتیوں میں پاؤں نہ رکھو..... شاعری سے بھی جاؤ گے۔''

لیکن مرزا جی جیسے ضد پر اڑ گئے۔

افسانہ چھوڑ اب انھوں نے کردار نگاری پر کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ بندہ جو عرصۂ تیس سال سے مشہور شاعر کی مہر اپنی ذات پر چسپاں کیے گھوم رہا ہو اور ساری زندگی لوگوں نے اس کا بازو پکڑ پکڑ کر اس سے غزل سننے کی فرمائش کی ہو۔ اسی شخص کو جب کوئی منہ موڑ موڑ کر اس کی کردار نگاری کی خامیاں بتائے تو ایسے میں اس کے دل کی حالت کا اندازہ لگانا کافی تباہ کن تصور ثابت ہوتا ہے۔

''چائے خانہ'' میں ہی ایک سیمینار تھا۔ جہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی تقاریب کے ساتھ مختلف مصنفین نے اپنی نئی نگارشات بھی پڑھ کر سنانی تھیں۔ مرزا جی نے گزارش کی کہ انھیں بھی ایک افسانہ سنانے کا موقع دے دیا جائے۔ اجازت مل گئی۔ دو ہفتے جان کنی کے عالم میں گزرے اور ان دو ہفتوں میں بس ایک افسانہ تیار ہو سکا اور وہ دن مرزا جی پر بہت بھاری گزرا..... ان کی اب تک کی زندگی کا مشکل اور بھیانک ترین دن..... افسانہ سنانے کے بعد پورے ہال کو سانپ کیا سونگھنا تھا، وہاں تو ایسے قہقہے اُمڈے جو رات گئے تک مرزا جی کے کانوں میں گونجتے رہے.....

وہ منافق معاشرے پر چوٹ کرنا چاہتے تھے۔ انھیں بتانا چاہتے تھے کہ کردار نگاری تو یہ ہے کہ ہم برے کرداروں کو بھی اس طرح سے پیش کریں کہ وہ اسے پڑھ کر اچھے ہو جائیں۔ طوائف کو بتائیں کہ اس کے اندر ایک شریف زادی بھی موجود ہے۔ بچوں کو بتائیں کہ ماں باپ سے شرم وحیا کیا چیز ہوتی ہے؟ ہیروئن کو بتائیں کہ عاشق کے لیے گھر سے بھاگ کر عشق کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ عاشق کو نصیحت کریں کریں کہ وہ عشق اور ہوس میں فرق کو سمجھے۔ وہ اخلاقیات پھیلانا چاہتے تھے۔ اُلٹا بداخلاقی سے سب نے ان کا ہی مذاق بنا دیا۔

''مجھ سے نہیں ہوتی یہ منافقت..... میں جیسا خود ہوں، ویسے ہی میرے کردار ہوں گے۔'' وہ چلا اُٹھے، لیکن منافق معاشرہ جو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، انھوں نے مرزا جی کی یہ چیخ برابر دلیل نہ سنی..... اور مرزا جی سٹیج سے نیچے اُتر آئے۔

☆☆☆

وہ برسات کے دنوں کی رات تھی۔ تالابوں میں مینڈک ٹرٹرا رہے تھے۔ مرزا جی چائے خانے کی کینٹین میں بیٹھے اپنے فن کو کوس رہے تھے۔ جب ہادی صاحب ایک بار پھر سے ان کے پاس آ بیٹھے۔ کینٹین کے 'چھوٹے' کو دو کپ گرم گرم چائے لانے کو کہا۔ ایک اپنی اور ایک اداس بیٹھے مرزا جی کی..... اور پھر نرمی سے مرزا جی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''قلم کے زور سے معاشرہ ٹھیک نہیں ہو سکتا..... کردار نگاری تو سونے کی سخت دھات پر نقش اُبھارنے جیسا کام ہے۔ بہت سی چوٹوں سے کہیں ایک گھڑت پیدا ہوتی ہے اور بہت سی گھڑتوں سے کہیں ایک نمونہ..... بالکل ویسے ہی انسان اور اس کے لکھے کردار پر بہت سی نصیحتوں، فصیحتوں، تجربوں کے بعد کہیں جا کر کردار نگاری پنپنا شروع ہوتی ہے۔ یہ سفید صفحے پر سیاہ لفظوں کا کھیل نہیں ہے مرزا..... اس کے لیے جان کنی میں جیتے ہوئے کرداروں میں جان ڈالنی پڑتی ہے۔''

خدا جانے ہادی صاحب کا اتنی گہری بات کہنے میں کیا مقصد پوشیدہ تھا اور پھر یہ بات انھوں نے مرزا جی کو کہی بھی نجانے کس انداز اور کس لہجے میں کہ بات مرزا جی کے دل میں میر کے دیوان کی طرح حفظ ہو کر رہ گئی۔ شاید ہادی صاحب سوچے ہوئے تھے کہ ہمیشہ کی طرح ان کی باتوں کے ''مجازی معنیٰ'' بھی سننے والے کو کہاں سمجھ میں آئے ہوں گے لیکن مرزا جی ''حقیقی معنیٰ'' جالیں گے۔ ہادی صاحب یہ بات بھی تو نہ جانتے تھے۔

☆☆☆

سیاہ رات مرزا جی کی نظر میں اس وقت کچھ زیادہ ہی سیاہ ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اور دائیں بائیں اندھیرا سا چھانے لگا۔ بڑی دیر بعد انھیں کہیں جا کر کچھ نظر آیا، جب کینٹین کا چھوٹا لڑکا کرمو اُن کے سامنے گرم گرم چائے کے کپ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

یہ چھوٹا کرمو بھی ویسے عجیب مخلوق تھا۔ ہر وقت ناک بہتی رہتی تھی اس کی..... نہ کپڑے صاف نہ ذات..... پگلا سا تھا دیوانہ..... ہر کوئی پھٹکارتا تھا اسے..... کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ بڑے بڑے فلسفی، پڑھے لکھے اس کے سامنے آتے ہی سارے فلسفے بھول جاتے۔ کینٹین کا مالک اسے بے دردی سے پیٹ رہا ہوتا تو سب کے دلوں میں خواہش اُٹھتی کہ وہ بھی دو چار لگا کر اپنا ہاتھ سیدھا کر لیں۔ غریب کی تو ویسے ہی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، اس میں تو پاگل پن کی اعلیٰ ترین خوبی بھی تھی۔ ایسے میں اس پورے ''چائے خانہ'' میں اس سے بڑھ کر کوئی رذیل نظر ہی نہ آتا۔

پھر ایک دن وہ چھوٹا کرمو غائب ہو گیا۔ کسی کو پہلے کونسی پروا تھی اس کی جو بعد میں کوئی فکر کرتا..... لیکن سننے میں آیا کہ اس چھوٹے کرمو کو مرزا جی اپنے گھر لے گئے ہیں۔ ''چائے

خانہ'' کے مستقل مکینوں نے سن کر ٹھٹھول کیا کہ مرزا جی نے افسانہ چھوڑ، اب بچہ پالنا شروع کر دیا ہے۔

اس دن کے بعد سے پھر کسی نے مرزا جی کو بھی دوبارہ وہاں نہیں دیکھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں دنیا کا سب سے بڑا ''جن'' وقت ہے جو سب کھا جاتا ہے۔ انسانوں سمیت درخت، چرند پرند، بہار خزاں، خوشی، غمی سب کچھ..... اور اس طرح کھا جاتا ہے کہ پھر کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتا..... نئے آنے والے پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو سوائے راکھ کے انھیں اور کچھ نہیں ملتا.....

''چائے خانہ'' بدل گیا تھا۔ لوگ بدل گئے تھے۔ رسم رواج بدل گئے تھے۔ پرانے چہروں کی جگہ نئے چہروں نے لے لی تھی۔ کیونکہ پچیس سال کا عرصہ باقیات دھونے کے لیے کافی تھا۔

جس چائے خانے میں مرزا جی کی پچیس سال پہلے خوب ''خدمت'' ہوئی تھی اب وہاں ان کا اکلوتا بیٹا آنے لگا تھا۔ کمال..... اپنے نام کی طرح باکمال تھا اور تحریروں میں بے مثال..... نثر نگاری میں تو اس کا کوئی ثانی تھا ہی نہیں..... کم عمری میں ہی ایسے شاہکار افسانے، ناول لکھے تھے کہ سب نے اپنے قلم اور دل تھام رکھے تھے کہ یہ آگے چل کر کیا کرے گا؟

کبھی کمال کے آگے مرزا جی کے افسانوں کی بات چل نکلتی تو خود بھی اپنے باپ کا ایسے ہی مذاق اُڑاتا جیسے کبھی لوگوں نے اُڑایا تھا۔

''ابا جان سے کبھی افسانہ لکھا ہی نہیں گیا۔ انھیں کردار بنانے آئے ہی نہیں.....'' وہ ہنستا..... اتفاق کرتے بوڑھے پوپلے منہ سے ہاں میں ہاں ملاتے..... لیکن کمال کی ہنسی میں کہیں نہ کہیں ایک طنز بھی ہوتا۔ ایک عنصر ایسا ہوتا تھا جسے کوئی سمجھ تو نہ پاتا لیکن خاموش سا رہ جاتا۔ سننے والے کو نجانے کیوں ایسا لگتا کہ یہ اپنے باپ پر نہیں بلکہ ان سب پر ہنس رہا

ایک مثالی استاد

بھارت کی جنوبی ریاست کیرالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہائش پزیر ریاضی کے استاد عبدالملک گزشتہ بیس برس سے روزانہ ندی تیر کر پار کرتے ہیں اور دوسرے گاؤں کے سکول میں پڑھانے جاتے ہیں۔

استاد عبدالملک نے ۲۰ سال میں کبھی سکول پہنچنے میں تاخیر نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی چھٹی لی ہے۔ آج بھی وہ سر پر بیگ رکھ کر ربر کے ٹائر کے سہارے تیر کر بچوں کو پڑھانے اسکول جاتے ہیں۔ اسکول سے ندی کی دُوری کے بارے میں بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسکول میرے گاؤں سے گزرنے والی کادالندی ندی کے دوسرے کنارے پر آباد ایک گاؤں میں ہے۔ سڑک کے ذریعے اسکول کا فاصلہ سات کلومیٹر ہے جبکہ ندی عبور کر کے جانے میں یہ فاصلہ صرف ایک کلومیٹر رہ جاتا ہے۔ اس گاؤں میں نہ تو کوئی اُستاد ہے اور نہ ہی کوئی ڈاکٹر۔ یہ گاؤں تین طرف سے ندی سے گھرا ہوا ہے۔ استاد بننے کے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے خیال میں استاد بننے سے ہمیں اچھا شہری بننے میں مدد ملتی ہے۔ میں بچپن سے ہی استاد بننا چاہتا تھا۔ تعلیم ہمیں بچوں کے لیے مثالی بننے میں مدد کرتی ہے۔

ہے۔اگر ایسا تھا تو سراسر غلط تھا۔ مرزا جی کے بوکس افسانوں کا ایک عالم گواہ تھا۔ ان کے کرداروں کے جھول سب کے سامنے عیاں تھے۔

کمال کے ساتھ ہی چائے خانے میں کچھ دنوں سے ایک اور لڑکا بھی آنے لگا تھا۔ بڑا پیارا سا نام تھا اس کا ..... وجاہت..... اور نام کی طرح وہ خود بھی وجاہت سے بھرپور تھا۔ پینٹ کوٹ پہنتا، لمبی سی سیاہ رنگ کی مہنگی کار میں آتا، بارعب شخصیت، سحر میں جکڑتی خوشبو، مہنگا سگار، نفیس شیو، خوبصورت چہرہ..... سارے مردوں اور عورتوں کے دل تھم سے جاتے اسے دیکھ کر..... بڑا ٹھسہ تھا اس کی شخصیت میں، بڑا رعب تھا اس کی چال میں..... ذات کے تفاخر کی تو بات ہی نرالی تھی لیکن اس سب کے باجود زبان میں عاجزی بہت تھی۔

بات کرتا تو لگتا کہ اس نے لہجہ فرشتوں سے مستعار لیا ہے۔ کسی سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ اڑے ہوئے کام منٹوں میں کروا دیتا۔ سب کے مسئلے اس نے چٹکی بجاتے حل کیے تھے۔ بنا کوئی فیس لیے..... اس لیے سب کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔ کمال سے تعلق داری اتنی تھی کہ قربت داری لگتی، اکثر دونوں ایک ساتھ آتے جاتے..... ہنسی مذاق ایسے کرتے جیسے بچپن کے دوست ہوں۔

''یہ سرکاری بندہ کیا لگتا ہے تمہارا کمال.....'' کسی ایک نے تجسس سے تنگ آ کر پوچھا۔

''ارے..... بڑا بھائی ہے میرا.....''

''لیکن مرزا جی کا تو ایک ہی بیٹا تھا، کمال..... اور وہ تم ہو... پھر..... یہ..... کون.....؟''

''یہ ابا جان کا لے پالک بیٹا ہے۔''

''اچھا.....'' ہنکارا بھرا گیا یا پتا نہیں خود پر تف کیا گیا۔

کچھ لوگ وجاہت کی شخصیت سے اتنے متاثر تھے کہ اس کی کھد بد لینے لگے۔ جو ان کے لیے کچھ ایسا مشکل ثابت نہ ہوا۔

''یہ وجاہت جو مرزا جی کا لے پالک بیٹا ہے۔ یہ اصل میں کرموہے۔ کرمو چائے والا.....

وہ پگلا، دیوانہ..... جس کی ہر وقت ناک بہتی رہتی تھی اور جو ہر وقت اپنے مالک سے مار کھایا کرتا تھا۔''

کسی ایک نے اعلان کرتے ہوئے بتایا۔

''کیا..... کرمو..... کرم دین..... چائے والا..... وہ پاگل لڑکا.....؟''

آنکھوں کے آگے اندھیرا جو پھیلا تو وہ پھر چھٹ نہ سکا۔ کہاں وہ کرمو..... بہتی ناک والا، پگلا دیوانہ سا، اور کہاں یہ وجاہت..... خوش شکل، پڑھا لکھا، سرکاری بندہ..... جس کے آگے تعریف و توصیف کے سارے لفظ چھوٹے پڑتے نظر آتے تھے۔

''لیکن یہ معجزہ ہوا کیسے.....؟''

''یہ معجزہ میرا باپ ہی کر سکتا تھا، کیونکہ وہ شاعری میں باکمال تھا اور..... اور افسانہ نویسی میں بے مثال.....''

کمال نے ایک نظر سب کی طرف بھرپور طنز سے دیکھا۔

''یہ ہے میرے باپ کی کردار نگاری.....''

کمال نے کہا اور چائے خانے میں موجود سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

مرزا جی کی آخری خواہش پوری ہوئی۔ ◆◆◆

تھل کے صحرا کی ایک سسکتی، بلکتی کہانی

"پیاس"

صفحہ نمبر 178 پر۔

شاکر لطیف

سوہنا آلو

"اوئے مودے" آلو! کسی نے آواز لگائی تو اس نے قہر بار نگاہوں سے آواز کنندہ کو دیکھا۔ وہ اسی کے گاؤں کا ایک لڑکا تھا اور اس وقت سائیکل پر سوار تھا ورنہ شاید اسے اسی جگہ لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ محمود خود کو آلو کے صیغے سے مخاطب کرنے والوں کا حساب موقع پر ہی بیباق کرنے کا عادی تھا۔ مودے کی حد تک تو قابل برداشت تھا کیونکہ گاؤں میں اکثر لوگوں کو ان کا نام بگاڑ کر ہی پکارا جاتا، جیسے بشیر کو بشیرا، ہاشم کو ہاشو لیکن آلو کا خطاب محمود کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ اس خطاب سے نوازنے والوں کی موقع پر ہی درگت بنا ڈالتا مگر اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ سائیکل کے پیچھے دوڑنا تو درکنار، اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ وہ بمشکل چل ہی پاتا۔ اس لیے وہ لڑکا اسے چھیڑنے کے بعد آسانی سے نکل گیا۔

محمود اس وقت اسکول جا رہا تھا۔ گاؤں کا اسکول اس کے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ ماں کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تو پرورش کی ذمہ داری دادی نے بخوبی نبھائی۔ والد گاؤں کے چودھری ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے زمیندار بھی تھے اور ان کا زیادہ وقت اپنی زمینوں پر ہی گزرتا۔ انھیں اکلوتے بیٹے محمود سے بہت پیار تھا، اسی وجہ سے انھوں دوسری شادی نہ کی کیونکہ وہ محمود کو سوتیلی ماں کے سائے سے بھی دُور رکھنا چاہتے تھے۔ دادی کو بھی اپنے اکلوتے پوتے سے بے حد پیار تھا۔ چودھری منیران کا اکلوتا بیٹا تھا اور اب محمود بھی بیٹے کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے بے حد لاڈلا تھا۔

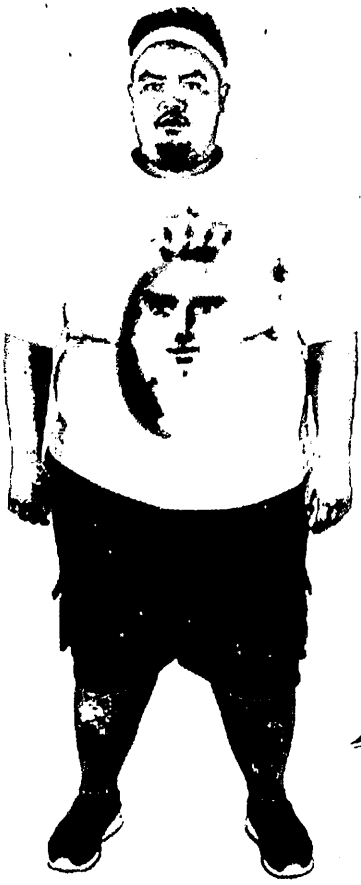

وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا... سرکاری افسر اور گاؤں کا چودھری بھی تھا مگر نام...؟

دادی کو محمود کی صحت کی بہت زیادہ فکر رہتی۔ وہ ناشتے میں دیسی گھی کے تین کے بجائے دو پراٹھے کھاتا تو دادی کو تشویش لاحق ہوجاتی کہ کہیں پوتے کی طبیعت تو خراب نہیں۔ وہ جب تک اسے تین پراٹھوں کے ساتھ آدھ پاؤ مکھن اور ایک گلاس لسی کا نہ پلا لیتیں، انھیں چین نہ ملتا۔ دوپہر کے کھانے پر بھی چکنائی سے بھرپور کھانے سے محمود کی تواضع کی جاتی اور پھر رات کو سونے سے پہلے بھوری کے دو گلاس دودھ بھی پینے ہوتے۔ ویسے تو چودھری منیر کا بھینسوں کا پورا باڑہ تھا مگر یہ بھوری بھینس سب سے گاڑھا دُودھ دیتی تھی اس لیے اس کا دُودھ محمود کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ محمود کے والد اور دادی ماہرینِ خوراک کے اس نظریے سے بالکل متفق نہیں تھے کہ موٹاپا ایک بیماری ہے۔ دادی تو محمود کو موٹاپے کی وجہ سے ہی گاؤں کا سب سے صحت مند بچہ سمجھتی تھیں۔ ان کے نزدیک بچے کا موٹا تازہ ہونا ہی صحت کی علامت تھا۔

محمود اب چودہ برس کا اور آٹھویں جماعت کا طالبعلم تھا۔ بچپن کی خوش خوراکیوں اور بھوری کے دُودھ نے اس کی جسامت پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ دُور سے دیکھنے پر یہی محسوس ہوتا کہ بھوری بذات خود چلی آرہی ہے۔ محمود سے مودے اور پھر آلو کا سفر اس کے گھر سے ہی شروع ہوا۔ دادی اسے مودے پتر کہہ کر مخاطب کیا کرتی اور پھر انھوں نے ہی اس کی گول مٹول اور بھاری جسامت کی وجہ سے اسے میرا 'سوہنا آلو' کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔

محمود آلو کہنے پر اکثر اوقات دادی کے سامنے سراپا احتجاج بن جاتا، تاہم دادی خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواباً کہہ دیتی کہ تُو میرا سوہنا آلو ہی تو ہے۔ ایسے میں محمود بے بسی سے منہ بسور کر رہ جاتا۔ وہ دادی سے لڑ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

'آلو' جب تک محمود کے گھر میں رہا تب تک خیر تھی، مگر کچھ عرصہ بعد 'آلو' نے گھر کی دیواریں پھاند لیں اور اب اسے گاؤں میں بھی آلو کہہ کر مخاطب کیا جانے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ محمود نے جواباً جارحانہ انداز اپنا لیا تھا۔ لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے اسے یہی طریقہ مناسب لگا تاہم کچھ سر پھرے اب بھی باز نہیں آتے تھے۔ اس سائیکل سوار کا تعلق بھی سر پھروں کے اسی گروہ سے تھا۔

محمود اکثر اوقات لوگوں کے اس رویے کی شکایت اپنے والد سے بھی کرتا تاہم چودھری منیر یہ بات سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ آخر وہ بھی دادی کے بیٹے تھے۔ وہ اکثر اسے سمجھاتے، ''دیکھو بیٹا! لوگ تمہیں اسی لیے چھیڑتے ہیں کیونکہ تم چڑتے ہو۔ اگر تم چڑ کر لوگوں سے لڑنا چھوڑ دو تو وہ بھی تمہیں چھیڑنا چھوڑ دیں گے کیونکہ جواب نہ ملنے سے ان کا تمہیں تنگ کرنے کا لطف ختم ہوجائے گا۔ ورنہ یاد رکھنا ایک دن یہ نام تمہاری پہچان بن جائے گا۔''

شاید چودھری منیر کی بات درست تھی مگر باپ کی نصیحت پر عمل کرنا محمود کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا

کہ خود کو آلو کہنے والے کا گلا ہی دبا ڈالے۔

محمود نے میٹرک تک تعلیم اپنے گاؤں کے اسکول سے ہی حاصل کی اور اس کے بعد گاؤں سے کچھ دُوری پر واقع کالج کی زندگی کا آغاز ہوگیا۔ وہاں جانے کے لیے محمود کو ایک موٹر سائیکل لے دی گئی۔

کالج کی زندگی بہت منفرد اور خوبصورت تھی۔ وہاں محمود کے بہت سے دوست بن گئے جن میں سے کچھ دوست اس کے ساتھ مخلص تھے مگر کچھ اس کی جیب میں موجود پیسوں کی خاطر اس سے دوستی کا دم بھرنے لگے۔ محمود چودھری منیر کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ وہ باپ سے جتنے پیسے مانگتا اسے مل جاتے اور پھر دادی بھی اسے چوہدری منیر سے چھپ کر پیسے دیتی رہتی۔ اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ وہ طبیعت کا بھی فیاض تھا۔ دوستوں پر دل کھول کر پیسے لٹانا اس کا معمول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دن بدن اس کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ اور بات کہ ان میں مخلص دوست کم اور مطلبی زیادہ تھے۔

کالج کی زندگی کا سب سے منحوس دن وہ تھا، جب کسی نے اسے آلو کہہ کر پکارا۔ اس کے گاؤں کے کچھ لڑکوں نے اسی کالج میں داخلہ لیا تھا اور ان کے ساتھ ساتھ 'آلو' نے بھی کالج کی راہ دیکھ لی تھی۔ اس پر آوازے کسنے والے کا منہ کسنا بہت ضروری تھا۔ محمود نے موقع پر اس کی ایسی درگت بنائی کہ دوبارہ اس نے کبھی محمود کو آلو کہنے کی جسارت نہیں کی مگر کالج میں دوسرے، بہت سے سر پھرے اور جھگڑالو لڑکے بھی موجود تھے اور آلو ان تک بھی رسائی حاصل کر چکا تھا۔ ایسے لڑکوں کا منہ زبردستی بند کرنا محمود کے بس کی بات نہیں تھی۔ آئے روز ان رمعاش لڑکوں کی جانب سے اکثر اوقات محمود کو آلو کے خطاب سے نوازا جانے لگا۔ یہ لڑکے محمود کے گاؤں کے نہیں تھے، اس لیے انھیں اس بات کا بھی کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ گاؤں کے چودھری کا بیٹا ہے۔ محمود ان سے جھگڑا نہیں کرتا تھا تاہم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہتا۔ وہ اپنے باپ چودھری منیر سے بھی شکایت کرتا رہتا۔

''ابا جان! اب تو کالج میں بھی لڑکوں نے مجھے آلو کہہ کر چھیڑنا شروع کر دیا ہے اور ان تک یہ نام ہمارے گاؤں کے لڑکوں کی وجہ سے پہنچا ہے۔ آپ ان کے ماں باپ کو یہاں بلا کر ان سے باز پرس کریں۔ آخر آپ گاؤں کے چودھری ہیں۔''

محمود کی باتوں پر حسب معمول چودھری منیر جواباً ایک ہی بات دہراتے، ''دیکھو بیٹا! اب تم بڑے ہو چکے۔ بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ میں نے تمھیں پہلے ہی کہا ہے کہ تم ان شرارتی لڑکوں کی باتوں پر مشتعل ہونا چھوڑ دو، وہ تمھیں تنگ کرنا چھوڑ دیں گے ورنہ ایک دن یہی نام تمہاری پہچان بن جائے گا۔ انسان جتنا بھی بڑا آدمی بن جائے، ماضی اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتا۔'' محمود کو باپ کی یہ نصیحتیں خاصی ناگوار گزرا کرتیں۔ دادی بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالنا نہ بھولتی۔

''تو میرا سوہنا آلو نہیں تو اور کیا ہے؟'' دادی کی بات سن کر محمود شکایتی نظروں سے باپ کی جانب دیکھتا اور پھر چودھری منیر کے چہرے پر پھیلی شرارت بھری مسکراہٹ دیکھ کر منہ بسورتے ہوئے ان کے پاس سے اُٹھ جاتا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس بارے میں باپ سے بات کرنا فضول ہے۔

گزرتے بھاگتے وقت کے ساتھ محمود نے کالج کی تعلیم مکمل کر لی۔ بیٹا بی اے کر چکا تھا اس لیے چودھری منیر نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے محکمۂ زراعت میں اسے نوکری پر لگوا دیا۔ محمود چودھری منیر کی سیکڑوں ایکڑ زمین کا اکلوتا وارث تھا۔ اس لیے سرکاری نوکری کے لیے یہی محکمہ مناسب تھا۔ باپ کے تعلقات کی وجہ سے اس کا عہدہ بھی اچھا تھا۔ اب موٹر سائیکل سے گزارا ممکن نہ تھا۔ محمود کا دفتر چونکہ شہر میں واقع تھا، اس لیے دفتر آنے جانے کے لیے ایک

گاڑی لے کر دے دی گئی۔ دفتر میں اسے چودھری محمود کہہ کر پکارا جانے لگا اور کیوں نہیں؟ اس کے سارے رکھ رکھاؤ چودھریوں والے ہی تو تھے۔ کلف لگی شلوار قمیص پہن کر جب وہ دفتر جاتا تو رعونت سے اکڑی گردن دیکھ کر یہی گمان ہوتا گویا گردن پر بھی کلف لگا ہے۔

بیٹا سرکاری نوکری لگا تو چودھری منیر کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ دادی کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے پوتے کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ ہم پلہ خاندانوں میں اس کے لیے لڑکی کی تلاش شروع ہوئی اور پھر ایک لڑکی پسند آتے ہی چودھری منیر نے بات پکی کر دی۔

لڑکی والے بھی جانتے تھے کہ محمود سیکڑوں ایکڑ زمین کا اکلوتا وارث ہے اس لیے انھوں نے اپنی انتہائی دبلی پتلی نازک اندام لڑکی کے لیے محمود جیسے بھاری بھرکم لڑکے کا رشتہ قبول کر لیا ورنہ شروع میں وہ ہاں کرنے کے معاملے میں تذبذب کا شکار تھے۔

چودھری منیر کے اکلوتے بیٹے کی شادی پر سارے ارمان پورے کیے گئے۔ لڑکی والے بھی خاصے مال دار تھے۔ محمود کو اتنا جہیز ملا کہ گھر بھر گیا۔ دادی بیمار رہنے کی وجہ سے خواہش کے باوجود بارات کے ساتھ نہ جا سکی تاہم جب محمود نئی نویلی دلہن کے ساتھ ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تو انھوں نے بستر سے اُٹھ کر محمود کا استقبال کیا۔ ''مودے پتر! بڑا چاہ تھا مجھے تیرا ویاہ دیکھنے کا میرا سوہنا آلو۔''

دادی کی زبان آج بھی بند نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود تو بیمار تھیں مگر ان کی زبان پوری طرح صحت مند تھی۔ محمود کھسیانی نگاہوں سے اپنی نئی نویلی دلہن کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ دادی کہا کرتی تھی کہ نہ جانے کب فرشتۂ اجل دروازے پر دستک دے دے۔ وہ ٹھیک ہی کہا کرتی تھی۔ ایک دن فرشتۂ اجل نے دروازے پر دستک دے دی مگر نمبر دادی کا نہیں بلکہ محمود کے والد چودھری منیر کا تھا۔ ان کے دل میں اچانک تکلیف ہوئی۔ انھیں فوراً اسپتال منتقل کیا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ دل کا یہ دورہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

دادی اور محمود کے لیے چودھری منیر کی موت بہت اچانک اور غیر متوقع تھی۔ ان کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ گھر میں کئی ماہ تک سوگ کی کیفیت طاری رہی۔ اب دادی کا زیادہ وقت چودھری منیر کو یاد کر کے روتے ہوئے گزرتا۔ ان دنوں محمود کی بیوی نے اس کا اور دادی کا بہت خیال رکھا۔

وقت سے زود اثر مرہم کوئی نہیں ہوتا۔ دادی اور محمود بھی رفتہ رفتہ اس صدمے کی کیفیت سے باہر نکل آئے اور زندگی پھر اپنی ڈگر پر چل پڑی۔

چودھری منیر کی موت کے بعد گاؤں والوں نے چودھری محمود کو اس کا درجہ دے دیا۔ اب گاؤں میں ہونے والے اکثر تنازعات کا فیصلہ چودھری محمود ہی کرتا۔ لوگوں کی زمینوں کے مسائل وہی حل کرواتا لیکن اسے لوگوں سے زیادہ اپنی زمینوں تک بروقت پانی پہنچنے کی فکر لاحق رہتی۔ سرکاری نوکری کے باعث وہ یہ کام بھی آسانی سے کروا لیتا۔ اب گاؤں میں سب اسے عزت سے بلاتے تھے۔ آلو ماضی کے صیغے میں کہیں کھو سا گیا تھا۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ مزید تین سال گزر گئے۔ اس دوران چودھری محمود کے ہاں دو بیٹیوں کی پیدائش بھی ہوئی۔ دادی کو تو گویا پڑپوتوں کی صورت میں کھیلنے کے لیے کھلونے مل گئے۔ ان کا زیادہ وقت محمود کے بچوں کے ساتھ ہی گزرتا۔ محمود کی محکمے میں بھی ترقی ہو گئی۔ اب اس کا شمار افسروں میں ہونے لگا تھا۔ کلف لگے شلوار قمیص کی جگہ اب پینٹ کوٹ اور ٹائی نے لے لی تھی۔ کلف اب بس گردن تک محدود رہ گئی تھی جو آج بھی ہمیشہ کی طرح تکبر سے اکڑی رہتی۔

یہ پیر کا دن تھا۔ چودھری محمود اپنے سرکاری دفتر میں بیٹھ کسی فائل کے مطالعے میں مصروف تھا۔ اسی لمحے اس کا ایک

ماتحت اندر داخل ہوا۔ ''سر کچھ کاشت کار ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں اپنی فصلوں کے لیے نہری پانی نہیں مل رہا اور اس وجہ سے نقصان کا اندیشہ ہے۔'' اس نے محمود کی طرف استفسار طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ، چودھری محمود نے ہنکارا بھرا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کاشت کار اکثر اوقات اس کے پاس نہری پانی کی کمی یا چوری کی شکایت لے کر آتے رہتے تھے۔

''انھوں نے کون سی فصل کاشت کی ہے؟'' چودھری محمود نے پوچھا۔

''سر وہ آلو کے کاشت کار ہیں۔'' ماتحت افسر نے بات کرتے ہوئے نظریں چرا لیں۔ وہ بھی اسی کالج سے پڑھا تھا جہاں سے محمود نے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ محمود اور آلو کے 'تعلق' سے بخوبی آگاہ تھا۔

''آلو.....'' چودھری محمود نے یوں منہ بنایا جیسے اسے لقوہ مار گیا ہو۔ ماتحت کا اس پر طنز کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اس وقت چودھری محمود کو ایسا لگا جیسے اس نے طنز کیا ہو۔ چودھری محمود کے ذہن میں اپنے باپ کی باتیں گونجنے لگیں۔

''انسان کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل جائے، اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ وہ جہاں بھی جائے گا، ماضی اس کا تعاقب کرے گا۔''

''میرے پاس فالتو وقت نہیں۔ ان سے کہو کہ پھر کسی وقت آجائیں۔'' وہ درشت لہجے میں کہہ کر فائل کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ ماتحت نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر کندھے اُچکا تا دفتر سے باہر نکل گیا۔

کاشت کار چودھری محمود کا انکار سننے کے بعد مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ چند ماہ بعد چودھری محمود بھی اس قضیے کو بھول گیا۔

ایک دن جب وہ اپنے دفتر میں موجود تھا تو باہر شور کی آواز سن کر چونک پڑا۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا تو مرکزی دروازے کے باہر لوگوں کا ہجوم پایا۔ ان لوگوں میں سے کچھ تو اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تاہم گیٹ کی سیکیورٹی پر مامور اہلکار انھیں روک رہے تھے۔ دھکم پیل بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جلد ہی صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ باہر کھڑے لوگ 'چودھری محمود مردہ باد' کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔

محمود نے اپنے ماتحت سے ان افراد کے بارے میں پوچھا تو انکشاف ہوا کہ یہ آلو کے وہی کاشتکار ہیں جن کے نمائندے چند ماہ پہلے نہری پانی کی عدم دستیابی کی شکایت لے کر آئے تھے مگر چودھری صاحب نے ملنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اب پانی نہ ملنے کی وجہ سے ان کی فصل بہت کم ہوئی جس وجہ سے وہ سراپا احتجاج ہیں۔ وہ سب بڑی بڑی ریڑھیوں اور ٹرالیوں پر آلو لاد کر ساتھ لائے ہیں اور انھوں نے دفتر کے مین گیٹ کے سامنے بھی آلوؤں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ اس وجہ سے صرف پیدل آنے جانے کا راستہ بچا ہے۔''

''ان کی یہ جرأت کہ میرے خلاف احتجاج کریں، چودھری محمود کے خلاف؟'' وہ اپنے ماتحت کی بات سن کر آپے سے باہر ہو گیا اور رعونت بھرے انداز میں چلتا ہوا ان کاشت کاروں کی جانب بڑھ گیا۔ ماتحت بھی مجبوراً اس کے پیچھے چل پڑا تاہم اس کے چہرے پر تشویش کے تاثرات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ محمود کو اس بپھرے ہوئے مجمع کے پاس نہیں جانا

چاہیے تھا مگر چودھری محمود سیکیورٹی کو پیچھے ہٹاتا ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

''یہ احتجاج کا کوئی طریقہ ہے؟''

چودھری محمود نے گرج دار آواز میں مجمع کو مخاطب کیا۔ تم لوگ جانتے نہیں کہ میں کتنا اثر رسوخ رکھتا ہوں۔ ابھی تم سب کو تھانے میں بند کروادوں گا۔''

چودھری محمود کو جواب مجمع کی جناب سے منہ پر پڑنے والی زور دار ضرب سے ملا۔ کسی نے تاک کر اس کے منہ پر ایک بڑا سا آلو دے مارا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

''یہ جرات کس نے کی ہے؟'' وہ دھاڑتے ہوئے بولا مگر مجمع اس کی توقع سے کہیں زیادہ بپھرا ہوا تھا۔ اس کے منہ پر پڑنے والا آلو تو بارش کا پہلا قطرہ تھا اور پھر گویا اس پر آلوؤں کی بارش سی شروع ہوگئی۔ سیکڑوں برستے ہوئے آلوؤں میں وہ سب کا اکیلا نشانہ تھا۔ اس کا ماتحت اور سیکورٹی والے خاموشی سے ایک جانب کھسک گئے تھے۔ جب قصور چودھری محمود کا تھا تو وہ سب کیوں مار کھاتے؟ بپھرے ہوئے لوگوں کو سنبھالنا اب ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی لوگوں کے احتجاج دیکھے تھے۔ گندے انڈے اور ٹماٹر برستے دیکھے تھے مگر آلوؤں کی یہ انوکھی برسات پہلی بار ان کے مشاہدے میں آئی تھی۔ بہر حال محمود ان کا افسر تھا۔ اپنے افسر کو بچانے کے لیے انھوں نے پولیس طلب کر لی، مگر پولیس کی آمد تک غصے میں بھرے کسانوں نے چودھری محمود کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی۔ آلوؤں کی برسات نے اس کے چہرے پر گومڑوں کی صورت میں کئی آلو بنا ڈالے۔ پولیس نے لاٹھی چارج کر کے محمود کی جان چھڑائی۔ اس کے ماتحتوں نے اسے اسپتال جانے کا مشورہ دیا مگر اس نے منع کر دیا۔ تاہم اس نے کسانوں کے خلاف خود پر حملے کا مقدمہ درج کروا دیا۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ شام کو اپنے گھر پہنچا تو ایک نئی مصیبت اس کی منتظر تھی۔ دادی نے اس کے سوجے ہوئے چہرے کا فکرمندی سے جائزہ لیا پھر زبردستی چولہے کے پاس بٹھا کر گرم توے پر کپڑا رکھا اور چودھری محمود کے چہرے کی ٹکور شروع کر دی۔ اس کی بیوی بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ دادی گرم توے پر کپڑا رکھ کر اسے گرم کرتیں اور پھر اس سے محمود کے چہرے پر ٹکور کرتے ہوئے کہتی جاتیں۔

''میرا سوہنا آلو! ہائے ظالموں نے میرے سوہنے آلو کو کتنی بے دردی سے مارا ہے۔'' دادی کے منہ سے کبھی پھول تو برسے نہیں تھے، ہمیشہ آلو ہی برسے تھے۔ چودھری محمود بے بسی سے کبھی دادی کو دیکھتا اور کبھی پاس بیٹھی اپنی بیوی کو۔

ایک گھنٹے تک اس کے چہرے پر مسلسل ٹکور کرنے کے بعد دادی نے جان چھوڑی تو چودھری محمود بیوی کو چائے بنانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں اس کے دونوں بیٹے موجود تھے۔ انھوں نے باپ کو دیکھا تو اجنبی سمجھ کر رونے لگے۔ سوجے ہوئے چہرے کی وجہ سے وہ اُسے پہچان ہی نہ

پائے۔

کسانوں کے ہاتھوں درگت بننے کے باوجود چودھری محمود کے تکبر اور رعونت میں رتی بھر بھی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ اب بھی غریب کاشتکاروں کو ملاقات کا وقت مشکل سے ہی دیا کرتا اور آلو کے کاشتکاروں کو تو بالکل نہیں۔

اسے اس بات پر بھی فخر تھا کہ وہ اپنے علاقے کا چودھری ہے۔ گاؤں میں سب اس کے رعب و دبدبے سے ڈرتے ہیں۔ کسی میں جرأت نہیں کہ اسے اب کسی اُلٹے سیدھے نام سے مخاطب کرے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے والد چودھری منیر کی یہ بات درست نہیں تھی کہ انسان کا ماضی اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتا۔

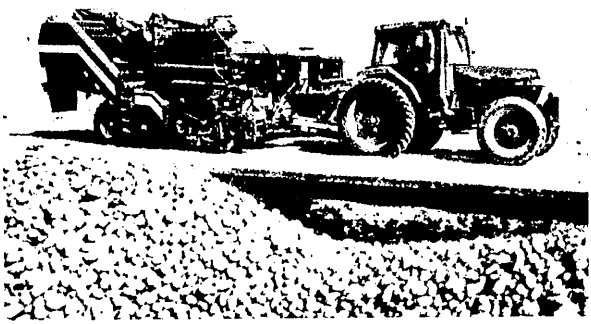

دادی اب بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ علیل تو وہ پہلے سے ہی تھیں۔ وہ محمود سے اکثر کہا کرتیں کہ اب ان کا وقت پورا ہو چکا۔ کسی بھی وقت بلاوا آنے والا ہے۔ ان کی یہ بات درست تھی۔ ایک دن واقعی بلاوا آ گیا مگر دادی کا نہیں..... خود چودھری محمود کا۔

ان دنوں محمود بخار میں مبتلا ہوا۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے بخار کی عام دوائیاں استعمال کرنا شروع کر دیں، مگر بخار نے دو تین دنوں میں ہی اتنی شدت اختیار کر لی کہ محمود کے لیے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے کچھ ٹیسٹ کرنے کے بعد کہا کہ یہ ملیریا ہے۔ عام طور پر ملیریا کے بخار سے لوگ صحت مند ہو جاتے تھے مگر محمود کے معاملے میں ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ یہ بخار اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ اس نے اپنے پسماندگان میں بوڑھی دادی، ایک بیوہ اور دو بیٹے چھوڑے تھے۔ اس کی ناگہانی موت نے سبھی کو سوگوار کر دیا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ سرکاری افسر ہونے کے ساتھ ساتھ گاؤں کا چودھری بھی تھا۔ اس کے جنازے پر ایک جم غفیر اُمڈ آیا۔ آس پاس کے گاؤں کے علاوہ شہر سے بھی لوگ آئے تھے۔

''یار یہ اتنا بڑا جنازہ کس کا جا رہا ہے؟'' دوسرے گاؤں سے آئے ہوئے ایک راہ گیر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''ارے تمہیں نہیں معلوم؟ چودھری محمود فوت ہو گیا ہے۔''

''کون چودھری محمود؟'' راہ گیر نے دوبارہ پوچھا۔

''میں اس گاؤں کے چودھری کی بات کر رہا ہوں۔ چودھری منیر مرحوم کے بیٹے چودھری محمود کی وفات ہوئی ہے۔''

''اوہ اچھا اچھا'' راہ گیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تو پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟ سیدھی طرح کہو کہ مودہ آلو فوت ہو گیا ہے۔ سن کر بہت افسوس ہوا۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔''

چودھری محمود کا خیال تھا کہ اس کے والد کی یہ بات غلط تھی کہ انسان کا ماضی اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتا مگر شاید اس کے باپ کی بات درست تھی۔ انسان کا ماضی واقعی اس کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔

☆☆☆

ہاتھی میرے ساتھی

کیا یہ جثیم حیوانِ واقعی چوہے اور چیونٹی سے ڈرتا ہے؟

حیرت انگیز معلومات پر مبنی تحریر

اسد شریف

کچھ ماہ قبل ایک اندوہناک، انسانیت سوز اور اخلاق کی پست ترین مثال دیکھنے اور سننے کو ملی۔ عقلِ انسانی دنگ اور زبان گنگ رہ گئی کہ کیا انسان محض اپنی طبع تفریح کے لیے اس قدر گر سکتا ہے؟ کیا جانور، محض اس کے لیے دل بہلانے کی چیز ہے یا اپنے اندرونی انتشار و خلفشار کا بدلہ لینے کے لیے آسان و بے زبان ہدف؟ کیا انسان کی روح نہیں کانپتی؟ یا انھیں خوفِ خدا نہیں رہا۔ سوشل میڈیا، نیوز چینلوں میں وائرل ہونے والی یہ خبر کچھ اس طرح سے تھی۔

''کیرالہ میں ایک ۱۵ سالہ حاملہ ہتھنی کی موت نے انسانیت پر سنگین سوالات اس وقت کھڑے کیے جب بعض شر پسند عناصر نے ہتھنی کو دھماکہ خیز مواد سے بھرا اَنناس کھلا دیا۔ محکمۂ جنگلات کے مطابق اندر سے زخمی ہونے کے بعد وہ اس قدر تکلیف میں تھی کہ تین دن تک دریائے ویلیار میں کھڑی رہی تاہم اس کو طبی امداد فراہم کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔''

یہ نیچ اور گھٹیا حرکت کرنے والوں کے عزائم کیا تھے؟ وہ ہندو تھے، مسلماں تھے، سکھ تھے عیسائی تھے یا ان کے نزدیک یہ بے چاری ہتھنی کسی خاص 'دشمن' مذہبی عقائد کی حامل تھی۔ کیا وہ انسان تھے؟ کیا انھیں انسان کہلانے کا شرف حاصل ہونا چاہیے؟ یہ بھی سننے میں آیا کہ آتش گیر مادے سے بھرا اناناس کھانے کے بعد ہتھنی کا منہ اور زبان بھی بری طرح زخمی ہوگئی تھی، اس کے ساتھ ساتھ ہتھنی اندر سے بھی بری طرح زخمی تھی۔ بعض شر پسند عناصر کا بس چلتا تو وہ اسے بھی مذہبی فرقہ واریت کا رنگ دیتے ہوئے سیاست چمکا لیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس فعل سے خود انھوں نے اپنے ہی مذہب کے پرخچے بھی اُڑا ڈالے کیونکہ وہ گنیش (ہاتھی) کی پوجا کرتے ہیں۔ اب جس ملک میں بھگوانوں کی یہ درگت بنائی جارہی ہو، وہاں انسانیت کا کیا حال ہوتا ہوگا، یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

☆☆☆

ہاتھی ایک ایسا جانور ہے جو بیک وقت معصومیت اور جارحانہ انداز کا حامل ہے۔ یہ کرۂ ارض پر پایا جانے والا طاقت ور ترین ممالیائی جانور ہے۔ ان کی روئے زمین پر تین سو پچاس سے زیادہ اقسام پائی جاتی ہیں جن میں ان کی دو بڑی اقسام افریقی ہاتھی (Loxodonta Africana) اور ایشیائی ہاتھی (Elephas Maximus) بہت مشہور ہیں۔ اِس کے علاوہ سری لنکن اور بھارتی ہاتھی بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

افریقا کے ہاتھی

افریقن ہاتھی دوسری اقسام کے ہاتھیوں کے مقابلے میں سائز، وزن اور جسامت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ افریقن ہاتھی کی لمبائی ۸.۲ فٹ سے ۱۳ فٹ تک ہوتی ہے اور یہ ڈھائی سے سات ٹن تک وزنی ہوتے ہیں جبکہ ان کی اوسط عمر ستر سال تک ہوتی ہے۔ ان کی نسبت ایشیائی ہاتھی پستہ قد معلوم ہوئے ہیں۔ اِن کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۹.۷ فٹ اور وزن ۲.۷ ٹن تک ہی محدود ہوتا ہے جبکہ اِن کی اوسط عمر بھی پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔

دماغی کارکردگی اور نیند:

ہاتھیوں کا دماغ ہر زمینی جانور سے بڑا ہوتا ہے۔ اِن کا دماغ دس پاؤنڈ وزنی اور اِنسانی دماغ سے چار گنا زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے ہاتھیوں میں اہم درجے کی یادداشت پائی جاتی ہے جو برس ہا برس برقرار رہتی ہے۔ جنوبی افریقی ماہرین کے مطابق جنگلی ہاتھی چوبیس گھنٹوں میں صرف دو گھنٹے سو کر اپنی نیند پوری کر کے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑی جسامت والے جانوروں میں کم ترین نیند کا عالمی ریکارڈ بھی ہے۔ دراصل افریقی ماہرینِ ماحولیات نے سروے کے ذریعے معلوم کرنا چاہا تھا کہ ہاتھی قدرتی ماحول میں کتنی دیر سوتے ہیں؟ دو ماہ سے بھی زیادہ وقت تک جنگلی ہاتھیوں کی نگرانی کے بعد ان پر یہ بھی منکشف ہوا کہ ہاتھی مسلسل چالیس گھنٹوں تک جاگ سکتے ہیں۔ اِن سے پہلے بڑی جسامت والے جانوروں میں گھوڑے کو سب سے کم نیند لینے والا جانور قرار دیا جاتا تھا جو روزانہ پونے تین گھنٹے کی نیند سے ہی تازہ دم ہو جاتا ہے۔

اعلیٰ درجے کا سماجی جانور

یہ اپنے قبیلے، گروہ اور خاندان سے بے انتہا محبت کرنے والا اور ان کا خیال رکھنے والا جانور کہلاتا ہے۔ ان کے گروہ میں ایک چھوٹا بچہ خواہ کسی بھی ہتھنی کا ہو، اس بچے کی حفاظت پورا جتھہ مل کر کرتا ہے۔ یہ غول در غول جب سفر کرتے ہیں تو پورا خاندان، چھوٹے بچوں کو اپنے درمیان میں چلاتا ہے اور ہر بالغ ہاتھی اور ہتھنی، ان بچوں پر پوری نظر رکھتا ہے کہ کہیں وہ قافلے سے جدا نہ ہو جائے۔

اِن کو اعلیٰ درجے کا سماجی جانور بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اگر اِن کے گروہ سے کوئی ہاتھی گم ہو جائے، تو دوسرے ہاتھی اِسے ڈھونڈنے کے لیے بڑی تگ و دو کرتے ہیں اور اَپنے ساتھی کو تلاش کرنے کے لیے کئی دنوں تک اپنی نیند تک حرام کر دیتے ہیں۔

بے انتہا ذہین اور حساس:

نہ صرف بہترین یادداشت بلکہ ہاتھی اپنی ذہانت کی وجہ سے بھی انسانوں کی طرف سے دی گئی تربیت بہت کم وقت میں سیکھ لیتے ہیں جس کا عملی مظاہرہ ہم اکثر و بیشتر فلموں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ انھیں حساس ترین جانور بھی کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا۔ یہ صلاحیت اِن کو دشمن کی شر انگیز حرکات سے محفوظ رکھتی ہے۔ اِن کے متعلق ایک مفروضہ بہت مشہور ہے کہ ہاتھی، چوہوں سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں کہ کہیں چوہا اِن کی سونڈ میں نہ گھس جائے، لیکن ماہرینِ جنگلی حیات اس بات کو غلط تصور کرتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق ہاتھی صرف چوہے سے ہی نہیں، بلکہ ہر تیز حرکت کرنے والی چیز سے گھبرا جاتا ہے۔

گروہ اور خاندان:

یہ ہمیشہ گروہ کی صورت میں رہتے ہیں جو دس سے لے کر سو ہاتھیوں پر مشتمل ہوتا ہے جس کی سربراہی گروہ کی سب سے بڑی ہتھنی کرتی ہے جسے شاہ مادر (Matriarch) کہا جاتا ہے۔ نر ہاتھی اپنے خاندانی گروہ کو بارہ سے پندرہ سال کی عمر میں چھوڑ کر دوسرے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

ہاتھی اپنے گروہ کے ارکان کو اتنا عزیز رکھتے ہیں کہ اگر اِن میں سے کوئی مر جائے، تو دوسرے ہاتھی اُس کے مردہ جسم کی حفاظت پر مامور ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنے پرانے دوست کے آنے کی خوشی میں اِسے گول دائرہ بنا کر گھیر لیتے ہیں اور اَپنے کانوں کو پھڑ پھڑا کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ہاتھی اپنے کانوں کا استعمال سننے کے علاوہ اپنے جسم سے گرمی خارج کرنے کے لیے بھی کرتے ہیں۔ اپنے جسم کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے کان ہلاتے رہتے ہیں۔

معمر ترین ہاتھی اور ہتھنی:

سب سے بڑی عمر کے ہاتھی کا اعزاز بھارت کی اِندرا نامی ہتھنی کو حاصل ہے۔ بھارتی ریاست کرناٹکہ سے تعلق رکھنے والی یہ ہتھنی جنوری ۲۰۱۷ء میں انتقال کر گئی تھی جس کی عمر ۸۵ سے ۹۰ سال کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ اِندرا نامی اِس ہتھنی کو تقریباً ۵۲ برس قبل ۱۹۶۸ء میں کرناٹکہ کے جنگلوں سے پکڑا گیا تھا۔ اِس کی طویل العمری کا راز اِس کی خوراک کا سبز پتوں والی غذا پر مشتمل ہونا ہے۔

اِندرا سے پہلے ایشیا کے طویل العمر ہاتھی کا اعزاز تائیون کے لِن ویِنگ نامی ہاتھی کو حاصل تھا جو ۲۰۰۳ء میں تائیوان کے ''تائی پائی'' رانی باغ میں ۸۶ برس کی عمر میں چل بسا تھا۔ اِس کے انتقال پر رانی باغ انتظامیہ نے اِس کے اعزاز میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی تھی۔ لِن ویِنگ نے چین اور جاپان کی جنگ (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۵ء) کے دوران چینی افواج کے لیے خدمات سرانجام دیں تھیں۔ جنگِ عظیم دوئم میں بھی لِن ویِنگ نے دیگر بارہ ہاتھیوں سمیت بھرپور حصّہ لیا تھا اور ۱۹۵۴ء میں تائی پائی رانی باغ منتقل ہوا جہاں زندگی کے آخری دنوں تک رہا۔

خوراک اور رہائش:

ہاتھی کی ایک دن کی خوراک تین سو پاؤنڈ پر مشتمل ہوتی ہے جس میں پتے، جنگلی گھاس، پودوں کی جڑوں کی بیرونی چھال، بانس (گھاس کی جنس سے گرم علاقوں کا جنگلی درخت) اور درختوں کی جڑیں شامل ہیں۔ ہاتھی تقریباً ۲۰۰ لٹرز کے قریب روزانہ پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ زیادہ تر ہاتھی ایشیا اور افریقا کے جنگلات اور سبزہ زار والے علاقوں کو اپنا مسکن بناتے ہیں۔ افریقی ملکوں میں ہاتھی بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اِس لیے کینیا کو ہاتھیوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔

تہذیب و ثقافت:

جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں بھی ہاتھیوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے جن میں سری لنکن ہاتھی، چینی ہاتھی، انڈین

ہاتھی اور اِنڈونیشیا کے جزیرے سماٹرا کے ہاتھی قابلِ ذکر ہیں۔ ایشیائی ہاتھیوں کو ایشیا کی تہذیب و ثقافت میں بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت میں ہاتھیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ مغلیہ حکمران ہاتھیوں پر سفر کرنا اپنی شان سمجھتے تھے اور جنگوں میں اِن پر سوار ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔ اِس کے علاوہ ان کو ایشیائی ممالک میں نقل و حمل، مذہبی تقریبات اور بھاری بھرکم اشیاء کو ایک سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

ہاتھیوں کی سونڈ (Trunk) اِنھیں دوسرے جانوروں سے ممتاز بناتی ہے۔ یہ اپنی طاقت ور سونڈ میں تقریباً سات لٹر پانی بھر سکتے ہیں اور ساڑھے تین سو کلو وزن بآسانی اُٹھا سکتے ہیں اور سونڈ سے اپنی پیٹھ پر مٹی انڈیلتے ہیں تاکہ ان کی پیٹھ گرمی اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے۔

ہتھنی ہر پانچ سال بعد ایک بچے کو جنم دیتی ہے اور اپنی پوری زندگی میں صرف چار بچوں کو ہی جنم دیتی ہے۔ اِن کا وضع حمل کا دورانیہ تمام جانوروں سے طویل یعنی ۲۲ ماہ تک ہوتا ہے جو دوسرے ممالیائی جانوروں کے مقابلے میں طویل ترین وقت ہے۔ اِن کے بعد دوسرے نمبر پر اسپیرم وہیل (Sperm Whale) ہے جس کا وضع حمل ۱۸ ماہ بعد ہوتا ہے۔

بآسانی پیغام رسانی

سری لنکا سے تعلق رکھنے والے ایلیفینٹ ریسرچ پروجیکٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیرمن ڈی سلوا کے مطابق ہاتھی اپنی گرج دار آواز کے ذریعے طویل فاصلے سے بھی ایک دوسرے کو بآسانی پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ ہاتھی وہ پیغام اپنی حساس جلد کے ذریعے وصول کرتے ہیں جو ان کے جسم کے دو حصّوں پیروں اور سونڈ پر موجود ہوتی ہے۔

نیپال میں ہر سال ہاتھیوں کے میلے کا انعقاد کیا جاتا ہے جس کا مقصد سیاحت کے فروغ اور ہاتھیوں کی بقا اور تحفظ کی جانب توجہ مبذول کرانا ہوتی ہے۔ تھائی لینڈ میں ہاتھیوں کی مدد سے پولو ٹورنامنٹ منعقد کیا جاتا ہے۔

لاہور چڑیا گھر کی واحد ہتھنی سوزی مئی ۲۰۱۷ء میں بیماری کے باعث محض ۳۶ سال کی عمر میں دَم توڑ گئی تھی۔ سوزی کو ۱۹۸۶ء میں چھے برس کی عمر میں بیجنیم سے لاہور چڑیا گھر میں لایا گیا تھا۔

حیران کن حس شامہ

ہاتھیوں کی سونگھنے کی حس حیران کُن حد تک تیز ہوتی ہے یہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ اِن کے مقابلے میں انسانوں کی سونگھنے کی طاقت بہت کمزور ہے۔ ہاتھیوں میں بھی انسانوں کی طرح کے احساسات پائے جاتے ہیں جن میں خوشی، غمی اور رنجیدہ ہونا شامل ہیں۔ ہاتھی کو عام طور پر شریف جانوروں میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن جب اِن کو محسوس ہو کہ وہ اور اِن کے بچے خطرے کی زد میں ہیں، تو

خلافِ توقع حملہ بھی کر دیتے ہیں۔ اِن کا حملہ اتنا شدید اور خطرناک ہوتا ہے کہ اِن کی زد میں آنے والے انسان یا جانور کی کچھ ہی دیر میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہاتھی کے انسانوں پر حملہ آور ہونے کے واقعات اکثر و بیشتر سامنے آتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر مہاوت اِن کا شکار بنتے ہیں۔

غصیلے ہاتھی سے اللہ بچائے

اگست ۲۰۱۷ء میں بھارت میں بدمست ہاتھی نے پندرہ افراد کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل کر ہلاک کر دیا تھا۔ ہاتھیوں کے قاتلانہ حملوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنی بستیاں بنانے کے لیے جنگلوں کی کٹائی شروع کر دی ہے جس کی وجہ سے ہاتھی قریبی دیہات اور شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ جنگلات کی کٹائی اور اِن کے دانتوں کے حصول کے لیے اِن کا شکار کیے جانے کی وجہ سے اِن کی نسل کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ زیادہ تر اِن کا شکار دانتوں کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے، کیونکہ اِن کے دانتوں میں موجود قیمتی جزو Ivory سے قیمتی زیورات بنائے جاتے ہیں اور اِن کی کھال بھی مختلف چیزیں بنانے کے کام آتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہاتھی دانت کے حصول کے لیے سالانہ پچاس ہزار ہاتھیوں کو ہلاک کیا جاتا ہے۔

نسل کو درپیش خطرات

۲۰۱۶ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۴ء تک چور شکاریوں (Poachers) نے مشرقی افریقا میں تقریباً ایک لاکھ چوالیس ہزار ہاتھی ہلاک کیے تھے۔ علاوہ ازیں ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۳ء کے درمیان چور شکاریوں نے وسطی افریقا کے دو تہائی جنگلی ہاتھی ہلاک کیے تھے۔ مئی ۲۰۱۶ء میں کینیا میں ایک سو پانچ ٹن وزنی ہاتھی دانتوں کی کھیپ پکڑی گئی تھی جس کو بعد ازاں نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ چین نے ہاتھیوں کی نسل کو درپیش خطرات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مارچ ۲۰۱۷ء سے ہاتھی دانت کا کاروبار کرنے والی فیکٹریوں کو بند کرنے کا اعلان کیا تھا جو ہاتھیوں کی نسل کی بقا اور تحفظ کے لیے انتہائی مثبت پیش رفت ہے۔

ہاتھی کے دانت کی مانگ

واضح رہے کہ جون ۲۰۱۶ء سے امریکی حکومت نے ہاتھی دانت کے کاروبار پر مکمل طور پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اُمید کی جا رہی ہے کہ ایسے اقدامات سے ہاتھیوں کی چوری (Elephant Poaching) اور اِن کے دانتوں کے کاروبار میں بڑی حد تک کمی واقع ہوگی جو اِن کی نسل کی بقا کے لیے خوش آئند بات ہے۔ ۱۲/اگست ۲۰۱۲ء سے مسلسل ہاتھیوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے جس کا مقصد ہاتھیوں کی بقا اور تحفظ کا شعور اجاگر کرنا ہے۔ جنگلات کی کٹائی کی وجہ سے فضائی آلودگی بھی عالمی مسئلہ بنتا جا رہا ہے جس میں گزشتہ چند سالوں میں بے پناہ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ فضائی آلودگی کی وجہ سے متعدد امراض سر اُٹھا رہے ہیں۔

ایک تازہ تحقیق کے مطابق فضائی آلودگی کی وجہ سے سالانہ تقریباً ستر لاکھ قبل از وقت اموات ہوتی ہیں اور لوگوں کی ذہنی صلاحیت بھی کم ہو رہی ہے، لہٰذا جانوروں کے تحفظ اور جنگلات کو بچانے کے لیے سنجیدہ اقدامات نہ کیے گئے، تو آئندہ چند سالوں میں بنی نوع انسان کو اِس کے بھیانک اثرات سے واسطہ پڑ سکتا ہے جن میں سیلاب سرِفہرست ہے۔ ◆◆◆

مگرمچھ کے ہولناک شکار کی
سنسنی خیز داستان
"سُرخ آنکھیں"
صفحہ نمبر 188 پر

نعیم اقبال

دوپہر اپنے جوبن پر تھی۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ سنسان سڑک پر سائے بھی کسی سائے کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ دُور دُور تک کسی انسان کے وجود کے آثار نظر نہ آتے تھے اور تو اور کتے بھی اپنی زبانیں نکالے درختوں کے سائے میں ایسے ہانپ رہے تھے جیسے دنیا میں اپنا حساب چکتا کروا رہے ہو۔

ایسے میں، مَیں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ مجھے کچھ اچھی طرح سے یاد نہیں۔ ہاں یاد آیا! میں تو آج صبح ہی سے کسی کی تلاش میں نکلا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں ہر ایک سمت میں نگاہ دوڑاتے ہوئے پھر سے چل پڑا۔ جب سڑک پر دُور دُور تک کوئی انسان نظر نہ آیا تو میں بغلی گلی میں گھس گیا۔ گلی بھی ویران پڑی تھی اور بالا خانے بھی خالی۔ میں بالکل مایوس گلی در گلی پھرتا رہا۔

سورج آگ برسا برسا کر تھک کر ڈھلنے لگا تو مجھے بھی گھر کی یاد آئی جسے میں اب تک بھولا ہوا تھا۔ سورج اور میں دونوں ہی کل کے مقابلے کے لیے پھر سے تازہ دم ہونے کے لیے اپنے اپنے ٹھکانے پر جانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن ابھی تک مجھے یہ یاد نہ آیا تھا کہ میں سارا دن کس کی تلاش میں خاک چھانتا رہا اور کیا کل پھر اسے تلاش کرنے جانا اتنا ہی لازمی امر ہے جس کے آگے میں بے بس ہوں۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی میرا سامنا اپنی بیوی سے ہوا جو دروازے ہی سے چپکی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے غصے سے میرا دماغ پھٹنے لگا اور دوسرے ہی لمحے جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔ اِدھر وہ مجھے اکیلا دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی اور اپنے ڈوپٹے کے پلو سے آنکھیں پوچھتی کمرے کے اندر چلی گئی۔

کچھ دنوں سے میری یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ بہت سی باتیں مجھے یاد ہی نہیں رہتیں اور اکثر اوقات لوگوں کے طرزِ عمل کی وجوہ جاننے سے بھی قاصر رہتا ہوں۔ بالکل ویسے ہی جیسے اب

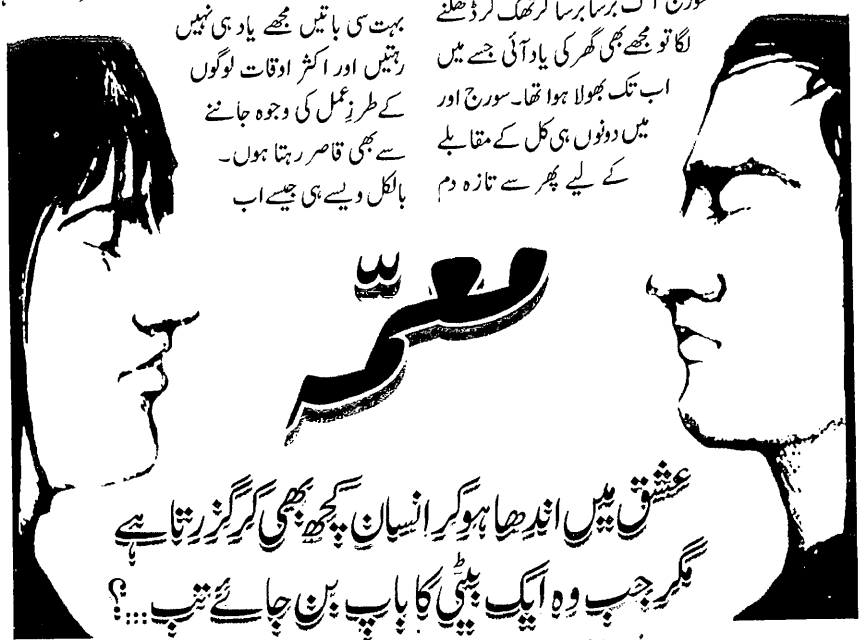

زندگی میں بہت سے ایسے موڑ آتے ہیں جب انسان ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے اور اپنے کیے ہوئے کچھ افعال پر نادم ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ غلطیاں ناقابلِ تلافی ہوتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ گزرا وقت ہم واپس نہیں لا سکتے کہ اُن غلطیوں کو سدھارنے کا ہمیں کوئی موقع مل سکے۔ زیرِ نظر یہ کہانی بھی ایک نوجوان کی ایسی ہی کچھ غلطیوں کو دہراتے ہوئے مکافاتِ عمل کا پہیہ چلا رہی ہے جو جوانی کے نشے میں یہ بھول گیا تھا کہ جوانی سدا نہیں رہتی اور ہمارا اپنا کیا ہوا ایک دن ہماری اولاد کے روپ میں کبھی نہ کبھی ہمارے سامنے آ ہی جاتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ میری بیوی کس کے انتظار میں دروازے سے چپکی کھڑی تھی اور پھر مجھے آتا دیکھ کر کیوں وہ غم زدہ سی ہو کر اندر چلی گئی..... اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ پچھلے چند دنوں سے میری بیٹی کیوں سہمی سہمی پھرتی ہے اور ابھی جب وہ میرے آگے سے گزری ہے تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں تھی۔

اور تو اور پچھلے کئی دنوں سے میں خود اپنا طرزِ عمل بھی سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جیسا کہ میں نہیں جانتا کہ اپنی بیوی کو دیکھنے پر مجھے ایک لمحے کے لیے غصہ کیوں آیا اور دوسرے ہی لمحے غائب کیوں ہو گیا؟ شاید کوئی اور موقع ہوتا تو میں اپنی بیٹی یا بیوی سے اپنا مسئلہ بیان کر کے ان سے مدد لیتا مگر پچھلے چند دنوں یا شاید ہفتوں سے (میں صحیح طور پر کچھ بھی یاد نہیں کر سکتا) ہمارے گھر میں بول چال بند ہے۔ اسی لیے میں نے ان سے بھی کچھ کہنے پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔

میں صحن پر بچھی چارپائی پر لیٹ گیا اور ذہن پر زور دیا کہ خود ہی وجہ دریافت کر لوں۔ اسی سوچ بچار پر میرے سر میں ایک درد سا اُٹھا اور ساتھ ہی یادوں کا ایک جھونکا بھی لایا۔ یہ یادیں میری جوانی کے دور کی تھیں۔

مجھے یاد آیا کہ اپنے دور میں مَیں بہت بڑا عاشق مزاج تھا۔ پہلے پہل جب مجھے پتا چلا کہ پیار کا بھی اس دنیا میں کوئی وجود ہے تو ابھی میری مَسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ لہٰذا بنا کسی تاخیر کے میں پیار میں گرفتار ہو گیا اور گرفتار کرنے والی ایک پیاری سی، بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی حسینہ تھی۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی اور پھر یوں ہوا کہ ایک دن جب میں اس کے گھر کے باہر چکر لگانے گیا تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ابا کا نام استعمال کرتے ہوئے آس پاس سے گھر والوں کا دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو چکے۔ میں نے دل ٹوٹنے کا سوانگ رچانے کی بہت کوشش کی مگر چند ہی دنوں میں میرا یہ شو فلاپ ہو گیا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہ محض ایک دل لگی تھی۔

دوسری دفعہ مجھے محبت کا بخار اس وقت چڑھا جب مجھے یہ احساس دلایا گیا کہ میرے والدین میری شادی خاندان ہی کی ایک لڑکی سے کرنے کے چکر میں ہیں۔ جب فرار کی راہیں مسدود نظر آنے لگیں تو مجبوراً میں اسی لڑکی کے پیار میں پگھلنے لگا اب اس کے بنا مجھے زندگی ادھوری لگتی۔ جب وہ کسی اور کے ساتھ بیاہی گئی تو بجائے رونے کے میں اپنی محبت پر دل کھول کر ہنسا۔

میں ایک بار پھر اکیلا میدانِ محبت میں آن دھمکا کہ اپنا جوڑ تلاش کر سکوں۔ انھی دنوں کسی کام سے باہر جاتے ہوئے پڑوس میں مجھے آصفہ کی ایک جھلک دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی میری یہ تلاش بھی تمام ہوئی۔ پتا نہیں میرا دل واقعی اس پر آ گیا تھا یا پھر اکیلے پن کا اثر تھا کہ میں نے اسے اپنی سچی محبت سمجھا۔

ادھر آصفہ بھی شاید اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کی دھن میں تھی۔ جب کوئی اور ذریعہ نہ ملا تو وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگی اور اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں ڈولنے لگے۔

گھر میں سب سے پہلے اس کی خبر اماں کو ہوئی۔ پتا نہیں عورتوں کو گھر بیٹھے ایسی باتوں کا پتا کیسے چل جاتا ہے جن سے عموماً مرد بھی نابلد ہی رہتے ہیں۔ اماں سے ہوتی ہوئی بات ابا تک پہنچی۔ پھر دونوں روز روز لیکچر دینے، نصیحت کرنے لگے اور آصفہ کی برائیاں کرتے کرتے اس کے شجرۂ نسب تک پہنچ جاتے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہم دونوں کو کبھی ایک نہ ہونے دیں گے۔

ایسے ہی ایک دن جب وہ آصفہ کی برائیاں کرتے ہوئے مجھے نصیحتیں گھول گھول کر پلا رہے تھے، میں پہلی دفعہ ان کے سامنے ڈٹ گیا اور غصے سے لال آنکھیں لیے گھر سے چلا آیا اور پھر کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا۔

کچھ دن اپنے ایک دوست کے ساتھ رہا اور ان ہی دنوں میں نے آصفہ کو اپنے ساتھ بھاگ چلنے کے لیے تیار کر لیا۔ ایک رات ہم دونوں کسی دوسرے شہر بھاگ گئے اور وہاں شادی رچالی۔ میں ایک فیکٹری میں ملازم ہو گیا اور ہمارا گزارا اچھا ہونے لگا۔

چار چھے ماہ ہم ایک دوسرے کے پیار میں کھوئے رہے۔ دھیرے دھیرے میں آصفہ سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ یہ کھنچاؤ اور گریز وحشت میں تبدیل ہوا اور وحشت نفرت میں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ شاید مجھے کبھی کسی سے محبت رہی ہی نہیں۔ وہ سب کی سب خود ساختہ تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی موت آپ مر گئیں۔

اب میرے دل میں ایک خلش سی رہنے لگی کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سے کیوں شادی رچالی؟ اب یہ خیال ستانے لگا تھا کہ جو لڑکی والدین کی بیس سال کی شفقت محض تین ماہ کی آشنائی کے لیے ٹھکرا سکتی ہے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ کبھی میں دل کو یہ بودی تسلی دیتا کہ آخر یہ سب کچھ اس نے کیا تو میرے لیے ہی نا..... اس سوچ کے ساتھ ہی پھر یہ خیال کچوکے لگانے لگتا کہ تُو اس کا کیا لگتا تھا؟ اسی ذہنی کشمکش میں نفرت اور شک کو پروان چڑھاتے ہوئے میری زندگی کٹنے لگی۔ کبھی یہ میرے پورے وجود پر حاوی ہو جاتی اور میں بہت مشکل سے انھیں اپنے اندر مقید کرتا۔ انھیں اپنے وجود کے اندر دباتے دباتے ذہن نے میرا ساتھ دینا چھوڑ دیا اور اکثر میں غیر حاضر دماغی کی وجہ سے شرمندگی اُٹھانے لگا۔

ہاں یاد آیا میرا ایک بیٹا بھی تو ہے جو بالکل مجھ پر گیا ہے۔ وہ بھی نرا عاشق مزاج ہی تو ہے۔ اس کے معاشقوں کے قصے سنتے سنتے میرے تو کان پک چکے۔ آصفہ کے منہ سے اپنے بیٹے کے کارنامے سنتے ہوئے اپنے بیٹے سے زیادہ مجھے خود سے اور آصفہ سے گھن آنے لگتی۔ بیٹے کو سمجھاتے ہوئے میں ویسے ہی ڈرتا ہوں کہ وہ غصے کا بہت تیز ہے۔ مگر نا جانے کیوں جب وہ میرے ساتھ زبان درازی کر رہا ہوتا ہے تو مجھے اس کی پشت پر کھڑا ایک عکس دکھائی دیتا ہے۔ مجھ پر ہنستا ہوا، میری طرف اشارے کرتا ہوا اور قہقہے لگاتا ہوا، وہ میرا ہمشکل ہی ہے۔ کیا وہ میں ہوں؟ یا میرا ماضی؟

میرا بیٹا..... شاید ایک ہفتہ یا پھر مہینہ ہونے کو آیا، وہ ایک لڑکی کے ساتھ بھاگ چکا۔ پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے تو آج تک اسے کسی بات پر نہیں ٹوکا۔ منع کرتا بھی تو کس منہ سے؟ شاید لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے روک ٹوک ہوئی ہو یا پھر جنہوں نے جانا ہو وہ جا کر ہی دم لیتے ہیں چاہے کوئی ٹوکے یا نہ ٹوکے۔

میری بلا سے..... چلا گیا تو چلا گیا۔ ویسے بھی میں اس کے سامنے شرمندہ شرمندہ پھرتا تھا..... مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے جانے کے بعد غنڈے بدمعاش قسم کے کچھ لوگ میرے گھر پہنچ گئے اور لڑکی کا مطالبہ کرنے لگے۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ یہاں نہیں ہے اور نہ ہی میرا اپنے بیٹے سے اب کچھ رشتہ ہے سوائے باپ کے، مگر وہ میری ایک نہ

مانے اور دھمکیاں دینے لگے۔

میں توصحیح طور پر دھمکیاں نہیں سن سکا یا پھر سننے کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہیں مگر ہاں اس دن سے میری بیٹی ڈری سہمی سی رہنے لگی ہے۔ اس کی گھبراہٹ اور بے چینی دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ آج تو مجھے آتا دیکھ کر وہ بدحواس سی ہو کر کمرے میں بھاگ گئی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ غنڈوں کی دھمکیوں میں میری بیٹی کا بار بار ذکر آرہا تھا۔

شاید اسے اپنے بھائی کی بہت فکر ہے۔ شاید اگر اس کا بھائی واپس آجائے تو اس کی ساری پریشانی اور گھبراہٹ دُور ہو جائے اور آنکھوں کی چمک بھی لوٹ آئے۔ شاید وہ ایک پیار کرنے والی بہن ہے یا کچھ اور بات ہے؟ میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بہن سے یاد آیا میری بھی تو ایک چھوٹی بہن تھی اور وہ کسی طور پر مجھ سے کم محبت نہ کرتی تھی۔ جب سے میں گھر سے نکلا ہوں دوبارہ اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں اور کس حال میں ہے۔ زندہ اور محفوظ ہاتھوں میں بھی ہے یا پھر.....

ایک عرصہ پہلے ابا میاں کو اسی شہر میں گرم دوپہر میں کچھ ایسے حال میں گھومتے دیکھا تھا جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہو، مگر ان کے پاس جانے کی ہمت نہ پڑی۔ جانے وہ اب کہاں ہوں گے۔ یادوں کی اس دنیا سے باہر نکلتے ہی مجھے احساس ہوا کہ رات کا کافی حصہ گزر چکا۔ بجلی نہ ہونے سے پنکھا رُکا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی اور حبس سے جان نکلتی تھی۔ میں صحن میں اکیلا سویا ہوا تھا۔ اس جان نکلتے حبس میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیے ماں بیٹی اندر سوئے ہوئے تھے۔ میں بھی کروٹ لے کر سونے لگا کہ کل پھر تلاش کرنے کے لیے نکلنا ہے مگر کس کی تلاش؟

یہ ابھی تک معمّہ ہے۔

☆☆☆

عشق، عقل اور اقبال

عقل راز کو سمجھ کر اس کا ادراک کرتی ہے۔ جبکہ عشق اسے آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یعنی حقیقت ہستی کا بلا واسطہ مشاہدہ کرتا ہے۔

عقل زمان و مکان کی پابند جبکہ عشق زمان و مکاں کی حدود سے نکل کر اُس عالم نا محدود میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں حقیقت بے حجاب ہوتی ہے اور یہ معرفت کا مقام ہے۔ عقل کی منزل مقصود ہستی مطلق کی معرفت وہ خدا جو ہے لیکن اس کی جستجو ناتمام ہے۔

عشق خدا نما ہے جو راہ طلب میں عقل کی رہبری کرتا ہے۔

گویا اقبال کے نزدیک عقل اور عشق میں بنیادی تضاد اتنا زیادہ نہیں بلکہ ابتدائی مراحل پر تو عقل کی ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

عقل میں بہت سی صفات موجود ہیں البتہ اس میں وہ جوش و خروش، تڑپ، حرکت اور وہ جرأت نہیں جو عشق کا شیوہ ہے۔ عقل اگرچہ آستانِ حقیقت سے دُور نہیں لیکن اکیلی اس تک پہنچ نہیں سکتی۔ عقل گو آستاں سے دور نہیں

بقول اقبالؔ

اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

☆☆☆

ڈاکٹر صفدر محمود

مولوی گُڈّو

کھانے پینے کی اشیاء دیکھتے ہی وہ وہاں پہنچ جاتے.... دلوں پر چھائی پژمردگی دور کرنے والی شگفتہ تحریر

مولوی گڈّو کے نام کی وجہ تسمیہ کا تو مجھے علم نہیں اور نہ مَیں نے کبھی جاننے کی کوشش کی۔ اللہ نے اُنھیں مفصل تن و توش سے نواز رکھا تھا، مگر حیرت ہے کہ اُن کا نام مولوی گُڈّو پڑ گیا تھا۔ تکبیر کی یہ تصغیر کس طرح عمل میں آئی، اِس امر سے کالج کا کوئی طالبِ علم آگاہ نہ تھا۔ ہوسکتا ہے مولوی صاحب بچپن میں ''گُڈّے'' (پتنگ) اڑاتے رہے ہوں یا بچپن میں بزرگوں نے پیار سے گُڈّو کہا ہو اور پھر وہ پیار کا نام اصل نام پر حاوی ہو گیا ہو۔

مولوی گُڈّو بارعب بزرگ تھے۔ دیکھنے میں ہرگز اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک کالج کی ویران سی مسجد کے امام ہوں گے۔ ظاہری طور پر وہ سیاست دان یا گاؤں کے چودھری لگتے تھے جو عام طور پر ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر کے لگ بھگ نو سو یا اِس سے زیادہ چوہے پورے کر لینے والی بلی کی طرح تائب ہوجاتے ہیں۔ عمل میں نماز اور جسم میں ڈاڑھی کا اضافہ کر لیتے ہیں اور قریب آتی ہوئی قیامت کی چاپ کے خوف سے اُسی مولوی کے پیچھے باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کر دیتے ہیں جس کو جوانی کے زمانے میں گالیاں دے کر بھی بے مزا نہ ہوتے تھے۔ البتہ جب مولوی گُڈّو اپنی خضابی ریش مبارک کی اوٹ میں چھپے ہوئے باریک باریک ہونٹوں کو جنبش دیتے اور گفتگو فرماتے، تو چند ہی منٹوں میں اپنی اصلیت ظاہر کر دیتے۔ اِس حد تک سب اُن کی حق گوئی و بے باکی کے قائل تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بہت سے 'قدرتوں' سے قریبی واقفیت رکھتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے خطبے میں ان قدرتوں کا ذکر کچھ اِس اعتماد سے کرتے تھے جیسے وہ اللہ تعالیٰ کی نہ ہوں، بلکہ اُن کی اپنی 'قدرتیں' ہوں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی ایک واضح قدرت سے واقف نہ تھے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے لاتعداد انسان صرف دیکھنے کے لیے پیدا کیے ہیں، بولنے کے لیے نہیں اور بہت سوں کو صرف بولنے کے لیے پیدا کیا ہے، دیدار فروشی کے لیے نہیں۔ مولوی گُڈّو ''دیدارو'' لوگوں میں سے تھے، ''گفتارو'' لوگوں میں سے نہیں تھے۔

مولوی گُڈّو کا قد چھے فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ تقریباً یہ قطر پیٹ کا بھی تھا۔ قد لمبا نہ ہوتا، تو سر سے پاؤں تک پیٹ ہی پیٹ رہ جاتا۔ گردن اتنی موٹی تھی کہ معلوم ہوتا تھا سر براہ راست دھڑ پر پڑا ہے۔ یہی کیفیت دیگر اعضائے رئیسہ و غیر رئیسہ کی تھی۔ سردیوں میں وہ عام طور پر سیاہ شیروانی زیبِ تن کرتے، جو اُن کی روایت کے مطابق نواب صاحب نے

اُن کی ایک عالمانہ تقریر سے مغلوب ہو کر ہدیۂ حقیر کے بطور پیش کی تھی۔

مولوی گُنڈو کے حاسدوں کا کہنا تھا کہ وہ شیروانی نواب صاحب نے اُن پر ترس کھا کر بھجوائی تھی۔ جبھی تو اب کچھ وقت گزرنے کے بعد شیروانی اُن پر پھبتی کم تھی اور پھٹتی زیادہ تھی۔

اُن کی شخصیت کا دوسرا جزو اُن کا سائیکل تھا جو اُس وقت عمر کی چالیس بہاریں دیکھ چکا تھا اور اپنے تمام تر بڑھاپے کے باوجود مولوی صاحب کا بوجھ برداشت کر رہا تھا۔ عینی شاہدوں کا بیان تھا کہ مولوی صاحب اپنے سائیکل کی دیکھ بھال اپنی گھر والی سے بھی زیادہ کرتے تھے۔ پطرس کے سائیکل کی مانند، مولوی گُنڈو کے سائیکل کا بھی ہر حصّہ، ماسوا گھنٹی کے خوب بجتا تھا، بلکہ شور مچاتا تھا اور کبھی اُن پر ترس آتا اور کبھی سائیکل پر۔ بہرحال دیکھنے والے سائیکل کی خوئے وفا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ مولوی صاحب جب سائیکل کی کاٹھی پر براجمان ہوتے، تو اُن کے ڈھیلے ڈھالے پیٹ کا فالتو گوشت گدی کے دونوں طرف تھیلوں کی مانند لٹکتا نظر آتا۔ ہر وقت یہ خطرہ رہتا کہ نہ جانے کب کون سا حصّہ ناقص پلستر کی طرح زمین پر آن گرے۔ مولوی صاحب ہینڈل پر یوں جھک کر سائیکل چلاتے گویا سائیکل سے پہلے منزل پر پہنچ جانے کا ارادہ ہو۔ جب سائیکل سفر کا آغاز کرتا، تو پہلے پہل چُوں چُوں چاں چاں شُوں شوں اور گرر گرر کی پُرسوز آوازیں سنائی دیتیں۔ جب سائیکل دردِزہ کی ابتدائی منزل سے نکل کر ذرا رفتار پکڑتا اور اُن آوازوں کے ساتھ پھٹ پھٹ کی آوازیں بھی شامل ہو جاتیں، تو عجب سماں ہوتا۔ گویا سڑکوں پر خطرے کا الارم بج جاتا۔ لوگ دُور دُور تک سڑک کے ایک طرف ہٹ جاتے اور اِس آفتِ ناگہانی کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگتے۔ اردگرد کے درختوں سے پرندے گھونسلے چھوڑ کر فضا کی بلندی میں پناہ تلاش کرنے لگتے اور کتے کسی خطرے کی آمد کے احساس سے بھونکنا شروع کر دیتے۔ یوں مولوی صاحب کے استقبال کا منظر انتہائی دلچسپ ہوتا۔

مولوی گُنڈو کو مسجد سے ملحق ہاسٹل میں ایک کمرا بھی دیا گیا تھا تاکہ اُن کو حجرے کی کمی محسوس نہ ہو اور وہ خانۂ خدا کی قیمتی اشیا اِس کمرے میں برائے حفاظت رکھ سکیں۔ چنانچہ اِس کمرے میں ایک چارپائی اور کرسی کے علاوہ مولوی صاحب کی صابن دانی مع دیسی صابن، تولیہ، سرمہ دانی، سرسوں کے تیل کی شیشی، کنگھی، موچنا اور سرخ ڈنڈی والا استرا ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ وہ اِس تمام ''شرعی ساز وسامان'' کو مسجد کی چیزوں کے مانند احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لہٰذا شاذ و نادر ہی استعمال کرتے۔ البتہ پڑوسی طلبہ کی چیزوں کو بے تکلفی سے استعمال کرنا اپنا ''بنیادی'' حق سمجھتے تھے، کیونکہ اسلام نے پڑوسی کے حقوق پر بہت زور دیا ہے۔

مولوی صاحب کی تقرری کا دائرہ صرف نمازیں پڑھانے تک محدود تھا، لیکن اُنھوں نے ایک زائد فرض خود اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا جس کی بجاآوری کو وہ اپنے لیے ذریعۂ مغفرت سمجھتے تھے۔ وہ زائد فرض تھا طلبہ میں تبلیغ اور اُن کے کردار و اخلاق کی اصلاح۔

مولوی صاحب بڑے تکلف سے مجسمۂ عجز و انکسار بنتے، مگر جیسا کہ لازمۂ مولویت ہے، وہ خود کو کسی بھی دوسرے عالمِ دین سے کم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب سے اپنے تعارف کا حادثہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مجھے ابھی ہاسٹل کا اسیر ہوئے چند ہی روز گزرے تھے۔ رات کے کھانے کے لیے میز پر بیٹھا تھا کہ اچانک روٹیوں کی ترسیل منقطع ہو گئی۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سینئر سے پوچھا، تو کہنے لگا کہ مولوی گُنڈو صاحب آئے ہیں۔ اب سپلائی کا رخ اُس طرف ہو گیا ہے۔ ''لیکن اُن کے آنے سے پہلے ہم کئی طلبہ کھانا کھا رہے تھے، پھر بھی روٹیاں مسلسل مل رہی تھیں۔'' مَیں نے پوچھا۔ اُس نے کہا ''کھانا کھانے کے

بعد مَیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔'' ہم کھانے سے فارغ ہوئے، تو میرا ساتھی مجھے مولوی گُڈّو کی میز پر لے گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ مولوی صاحب کے سامنے سالن کی تین پلیٹیں اور تنوری روٹیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مولوی صاحب ''معرکہ سالن و روٹی'' میں اِس قدر انہماک سے دادِ شجاعت دینے میں مصروف تھے کہ اُنھوں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ مَیں اِس منظر سے بہت محظوظ ہوا اور زیرِ لب مسکراتا ہوا ڈائننگ ہال سے نکل گیا۔ روٹیوں کا ڈھیر اور تین پلیٹ سالن کی منطق میری سمجھ سے بالا تھی، مگر میرے ساتھی کی تفسیرِ احوال نے یہ گتھی سلجھا دی۔ اُس نے کہا کہ آج کل مولوی گُڈّو فقر کی ابتدائی منازل طے کر رہے ہیں اور وہ تین پلیٹیں سالن اور تیرہ تنوری روٹیاں کھا کر ۳۱۳ کی حجت پوری کرتے ہیں۔ مَیں نے پوچھا ''یہ ۳۱۳ کا کیا فلسفہ ہے؟''

بولا: ''میاں! ۳۱۳ تاریخِ اسلام میں ایک معروف عدد ہے اور مولوی صاحب کے دل میں اسلام کا بے پناہ احترام ہے۔''

مَیں نے دل میں سوچا، اگر مولوی صاحب کے جملہ مقتدین نے بھی ۳۱۳ کے احترام میں ہانڈی روٹی سے یہی سلوک کیا، تو پاکستان کو گندم میں خود کفیل ہونے میں ایک مزید صدی درکار ہوگی۔

تبلیغ کے ضمن میں مولوی گُڈّو کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ وہ رات کے مختصر سے کھانے کے بعد جس کا مختصر سا ذکر آپ سن چکے ہیں، ہاسٹل کا چکر لگاتے اور جس کمرے میں اُنھیں چند طلبہ اکٹھے دکھائی یا سنائی دیتے، وہ اُس کمرے میں تشریف لے جاتے۔ اُنھوں نے 'روحانی' طور پر اِس قدر پختگی حاصل کر لی تھی کہ اُن کے قدم ہمیشہ اُسی کمرے کی جانب اُٹھتے جس کے مقیم کو اُس روز مہینے کے خرچ کی رقم موصول ہوئی ہو یا جس کمرے میں اُس روز پھل، مٹھائی، شربت روح افزا کی بوتل یا کوئی اور ذائقہ دار شے اُتری ہو۔ اِس معاملے میں مولوی گُڈّو نے کبھی غلطی نہ کھائی۔ وہ جانتے تھے کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُن کے نام کی مہریں فرشتوں نے کچھ زیادہ ہی لگا رکھی ہیں..... تاہم یہ قصور فرشتوں کا تھا، نہ کہ ہمارے مولوی صاحب کا۔

کمرے پر قبضہ کرنے کے بعد مولوی گُڈّو کا انداز بالکل ہائی جیکر کا سا ہوتا۔ یعنی کمرے میں موجود طلبہ کو اُٹھنے، کھانسنے بلکہ دم مارنے کی بھی اجازت نہ ہوتی۔ فوری طور پر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہو جاتا، چنانچہ اگر کسی بے چارے کو بیت الخلا جانا ہے یا اگلے دن کے پرچے کی تیاری کرنی ہے یا اُس کی محبوبہ کے فون آنے کی نازک گھڑی آن پہنچی ہے تو کیا؟ مولوی صاحب کی موجودگی میں کوئی ہل نہ سکتا تھا کیونکہ وعظ و تبلیغ کے دوران اُٹھنا گویا دین کی شان میں گستاخی ہے اور گستاخی بڑھ کر کفر بھی بن سکتی ہے۔ (یوں بھی مولوی صاحب کو کفر کا فتویٰ دینے کا بہت شوق تھا) پھر ہمارے مولوی صاحب یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ انسان ایک بار کافر ہو جائے، تو پھر کافر ہی رہتا ہے، خواہ بعد میں امام مسجد ہی کیوں نہ بن جائے۔ لطف تو اُس وقت آتا جب کوئی طالبِ علم کام کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے اپنے قلم میں سیاہی بھرنے آتا اور خالی پین ہاتھ میں پکڑے، کفر کے فتوے سے بچنے کے لیے انتہائی بے بسی کے عالم میں میز کی نکڑ پر بیٹھ کر مولوی صاحب کی باتیں سننے لگتا۔ ایسے میں بے چارے کی عجیب و غریب حالت ہوتی۔ بار بار یہ خیال آتا کہ کمرا کھلا ہے، ہو سکتا ہے واپسی تک کوئی شے غائب ہو جائے۔ اِدھر مولوی صاحب کا لیکچر ختم ہونے کے

کوئی آثار نہ ہوتے، کیونکہ لیکچر کے خاتمے کے قریب مٹھائی، پھل یا کم از کم روح افزا پر ''ختم'' پڑھا جاتا تھا اور پھر ختم شریف والی شے حاضرین کو سونگھا کر مولوی صاحب کی نذر کر دی جاتی تھی تاکہ مولوی صاحب میزبان کے لیے نالۂ نیم شبی کے دوران انتہائی خلوص اور خضوع و خشوع سے بخشش کی دعا کر سکیں..... چنانچہ نوگرفتار کا دل اور ذہن اپنے کمرے میں اٹکا رہتا اور جسم اُس میز کی نکڑ سے لٹکا رہتا جس کی گرفت سے اب وہ مولوی صاحب کی ''رخصتی'' تک آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ سوز و سازِ رومی سے محروم وہ بے چارہ اندر ہی اندر 'پیچ و تاب رازی' کھاتا رہتا اور مولوی صاحب کے حق میں ''دعائے خیر'' کرتا رہتا۔

مولوی صاحب کے وعظ کے ضمن میں اُن کے سامعین کو ایک بڑی نادر سہولت میسر تھی۔ وہ یہ کہ اُن کی گفتار دلپزیر آسانی سے نہیں بھولتی تھی، کیونکہ وہی چند ایک باتیں یعنی قیامت کا خوف، فرشتوں کا گنہگاروں کی گردنوں کو توڑنا، مارنا، پیٹنا اور جہنم کی آگ میں پھینکنا جیسے وہ اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق نہ ہوں، کسی پنجابی فلم کے ہیرو ہوں یا کسی تھانے کے سپاہی۔

مولوی صاحب نے مبلغ یہی گنی چُنی باتیں اپنے استاد بڑے مولوی صاحب سے وراثت میں پائی تھیں اور انتہائی سعادت مند شاگرد کے مانند اِس متاعِ گراں مایہ کو اپنی اصل حالت میں سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس میں کمی یا اضافہ کر کے وہ انحراف یا تجاوز کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے اور نہ کبھی ہوئے۔ یوں بھی اِس علم خاص میں اضافے کے لیے قدرے محنت کی ضرورت تھی اور مولوی صاحب فقر کی جس منزل میں تھے، وہاں اُن کو اپنی جسمانی تربیت سے ہی فرصت نہ تھی کہ وہ ذہنی تربیت کا سوچ سکتے۔ اِس صورتِ حال سے اُنھیں ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ ماسوا جمعہ کی نماز کے، باقی نمازوں میں وہ خود ہی مؤذن، خود ہی مقتدی اور خود ہی امام ہوا کرتے اور یوں اُن کے خضوع و خشوع میں خلل پڑنے کا کوئی اندیشہ نہ ہوتا۔

باقاعدگی سے جمعہ کی نماز پڑھنے والوں میں مَیں بھی شامل تھا۔ مولوی گُڈّو اپنے وعظ کا آغاز قیامت کی نشانیوں سے کرتے، بڑی رقت اور دِقت سے آنکھوں میں آنسو لا کر بتایا کرتے کہ قیامت نزدیک آ رہی ہے۔ ''کچھ کرنا ہے تو کر لو، ورنہ اگلے جہان میں فرشتے مار مار کر تمہاری گردنیں توڑ دیں گے۔ یہ بھی قیامت کی قربت کے آثار ہیں کہ بانگیں (اذانیں) ہوتی رہتی ہیں اور تم پڑے سوتے ہو۔ کالج میں لیکچرار (لیکچر) دیتے رہتے ہو، لیکن نماز پڑھنے نہیں آتے ہو۔ اللہ کی قدرتوں پر غور کرو۔ دیکھو! بھینس گھاس سبز رنگ کی کھاتی ہے، لیکن دودھ سفید رنگ کا دیتی ہے۔ کچھ کرنا ہے، تو کر لو۔ قیامت آ رہی ہے، فرشتے مار مار کر تمہاری گردنیں توڑ دیں گے۔''

دورانِ وعظ کچھ گناہ گار بار بار اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے کہ فرشتوں کے ڈنڈے شاید یہاں پڑیں گے اور کچھ معصوم ہنسی روکنے کے لیے بار بار وضو کے بہانے اِدھر اُدھر کھسک جاتے اور اُن کے وضو کا عمل وعظ سے طویل تر ثابت ہوتا۔

شبِ معراج آئی، تو مولوی صاحب نے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کر دی اور یوں اُنھوں نے کم از کم تین چار سو روپے اکٹھے کر لیے۔ طلبہ سے کہا کہ شبِ معراج کو نماز عشاء کے بعد مسجد میں ختم شریف ہوگا اور بعد ازاں 'بوندی' کے لڈو تقسیم کیے جائیں گے۔ ہم جب مسجد میں پہنچے، تو دو ٹوکرے لڈوؤں کے سجے سجائے رکھے تھے۔ ابھی نماز میں کچھ وقت تھا اور مولوی صاحب حسبِ معمول وعظ کے نام پر سامعین کی گردنیں توڑ رہے تھے۔ اسی دوران لڑکوں نے کھسر پھسر شروع کر دی کہ یہ لڈو بمشکل سو روپے کے ہوں گے۔ باقی رقم کہاں گئی؟ کچھ طلبہ کا خیال تھا کہ مولوی صاحب نے مٹھائی کی دُکان پر کھڑے کھڑے باقی رقم کی مٹھائی کھا لی ہوگی، لیکن

قدرے سمجھ دار طلبہ کا کہنا تھا کہ اِتنی رقم کی مٹھائی کھانے کے بعد مولوی صاحب کی زبان میں جو مٹھاس اور شیرینی آنی چاہیے تھی، وہ غائب ہے، چناںچہ اُنھوں نے مٹھائی نہیں، رقم ہی کھائی ہے۔ قیاس آرائی کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ نماز کا وقت ہوگیا۔ اکثر نوجوان نماز پڑھنے نہیں، لڈو کھانے آئے تھے، چنانچہ اُنھوں نے ہر دو چار رکعات نماز کے بعد مولوی صاحب سے آنکھ بچا کر ٹوکروں پر حملے شروع کر دیے۔ چند ایک حملوں کے بعد مولوی صاحب کو صورتِ احوال کا احساس ہوا، تو غصے کے عالم میں ٹوکرے اُٹھا کر اپنے سجادہ کے قریب رکھ لیے اور اعلان کر دیا کہ اب جو نابنجار ٹوکرے کو ہاتھ لگائے گا، کافر ٹھہرے گا۔ اس اعلان کے بعد مولوی صاحب نے مطمئن ہوکر دوبارہ نماز کی نیت باندھ لی۔ مولوی صاحب کی مصروفیت سے فائدہ اُٹھا کر بعض شرپسند عناصر نے سجدے کی حالت میں ٹوکرے سے ہاتھوں ہاتھ لڈو نکال نکال کر دوستوں میں تقسیم کرنے شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی چھینا جھپٹی اور ہنسی مذاق کا سلسلہ چل نکلا۔ مولوی صاحب نے تنگ آ کر جلد از جلد نماز ختم کی اور ٹوکرے اپنے سامنے رکھ کر ختم پڑھنے لگے۔ ختم شریف کے بعد مولوی صاحب نے لڈو خوروں کو جہنم کی بشارت دی اور اُن کی گردنیں فرشتوں سے نزوا کر طلبہ سے کہا کہ قطار بنائیں اور باری باری لڈو حاصل کریں۔ اب یہ ہوا کہ یار لوگ لڈو لے کر پھر قطار میں آن کھڑے ہوتے۔ کچھ دیر کے بعد جب مولوی صاحب کو اِس حرکت کا احساس ہوا، تو اُنھوں نے غصے سے لڈو تقسیم کرنے بند کر دیے اور باقی بچا ہوا ٹوکرا اُٹھا کر ہاسٹل کی جانب چل دیے۔

جونہی مولوی صاحب لڈوؤں کا ٹوکرا کمرے میں رکھ کر اُسے تالا لگا کر اطمینان سے گھر کے لیے رخصت ہوئے، شرپسندوں نے میٹنگ بلائی جس میں طے پایا کہ بہرحال باقی ماندہ لڈوؤں کا بھی صفایا لازم ہے۔ تالا کھولنے کی کوششیں کی گئیں، لیکن وہ سخت جان نکلا۔ شاید جاتے ہوئے مولوی صاحب تالے پر 'لاحول ولا' پڑھ گئے تھے۔ جب یہ ترکیب

کامیاب نہ ہوئی، تو فیصلہ کیا گیا کہ 'گوریلا پن' کا مظاہرہ کرتے ہوئے روشن دان سے حملہ آور ہوا جائے۔ روشن دان مناسب حد تک کھلا تھا اور اُس سے کمرے میں داخل ہونا مشکل نہ تھا۔ ایک پھرتیلے نوجوان نے یہ مشن اپنے ذمے لیا اور اندر داخل ہو کر لڈو قسط وار روشن دان سے برآمدے میں منتظر دوستوں تک پہنچا دیے۔ یہ پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا کہ مالِ غنیمت تقسیم کر کے کھایا جائے گا اور اِس پر جھپٹنے، پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا تاکہ مشن کو قدرے خفیہ رکھا جا سکے۔

مَیں صبح ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا، تو مولوی صاحب ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ چہرے پر خلافِ معمول رونق تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ رات کے لڈوؤں کی غذا نے مولوی صاحب کی صحت پر خوش گوار اثرات ثبت فرمائے ہیں۔

بیرے کو یہ کہہ کر چلے گئے کہ ناشتا کمرے میں پہنچادو۔ مَیں یہ سن کر زیرِلب مسکرایا کہ مولوی صاحب جس چیز کے لیے کمرے میں ناشتا منگوا رہے ہیں، وہ تو ''نانی تیری مورنی کو مور لے گئے'' کا مصداق بن چکا۔

ناشتے کے بعد کتابیں لینے کمرے میں آیا اور ابھی کتابیں کاپیاں ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور پھر مولوی صاحب نمودار ہوئے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا جیسے کسی بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوئے ہوں۔ مَیں نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے چہرے پر سنجیدگی کا خول چڑھایا اور پوچھا:

''جی فرمایئے''۔

کہنے لگے ''کسی دوزخی نے سارے لڈو چرا لیے، حتیٰ کہ میرے ناشتے کے لیے بھی کچھ نہیں چھوڑا اور نہ ہی محلے کے بچوں کے لیے۔''

'محلے' سے اُن کی مراد اُن کی زوجہ محترمہ تھیں جن کا بالغوں سے ذکر کرنا مولوی صاحب کے نزدیک ایک غیر شرعی فعل تھا۔ مَیں نے اظہارِ ہمدردی کیا اور وعدہ کیا کہ مجرموں کی نشان دہی کر کے ثوابِ دارین حاصل کروں گا۔ مولوی صاحب چند لمحوں کے لیے کچھ سوچتے رہے اور پھر کسی اور ہمدرد سے داستانِ غم یا ''لڈو آشوب'' عرض کرنے چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد مولوی صاحب دوبارہ تشریف لائے۔ مَیں نے پوچھا:

''قبلہ کچھ پتہ چلا۔''

رونی سی شکل بنا کر کہنے لگے:

''پتا کیا چلنا تھا۔ لڈوؤں کے ساتھ ساتھ میری باقی اشیاء بھی غائب ہیں۔ کوئی بدمعاش تیل، صابن، تولیہ، سرمہ، کنگھی سب کچھ لے اُڑا ہے۔ صرف استرا چھوڑ گیا ہے۔ میرے ہاتھ آئے تو اسی استرے سے میں اُس کا سر مونڈھ دوں گا۔''

مَیں نے مولوی صاحب کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن وہ چور پر لعنت کی آگ برساتے ہوئے اور قیامت کے رو فرشتوں کے ہاتھوں عمل میں آنے والی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کالج کھلا اور مَیں جمعہ کی نما ادا کرنے گیا، تو مولوی صاحب نظر نہ آئے۔ کسی اور بزرگوا نے نماز پڑھائی اور ہم ہاسٹل واپس آ گئے۔

رات کے کھانے پر مولوی صاحب کا ذکر چھڑا، تو میر نے پوچھا:

''مولوی صاحب کہاں ہیں؟ نظر نہیں آئے۔''

ایک باخبر طالبِ علم نے بتایا:

''مولوی صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے۔''

''کیا ہنی مون منانے گئے ہیں؟''

''ہنی مون کیا منائیں گے، وہ شہر چھوڑ گئے ہیں۔''

''ہائیں! وہ کیوں؟''

''دراصل اُنھوں نے لڑکی کے والدین سے اجازت لیے بغیر اُس سے شادی فرمالی تھی۔''

''افسوس! ہم اُن سے شادی کے لڈو بھی نہ کھا سکے۔''

اُسی طالبِ علم نے سرد آہ بھر کر کہا جس نے مولوی صاحب کے کمرے سے لڈو چرانے کا آپریشن مکمل کیا تھا۔

◆◆

آپ کی صحت کے بدترین دشمن

آپ کے ہی گھر میں ہیں

''جانی دشمن''

صفحہ نمبر 198 پر

ظلِ ھما

خواتین میں بڑھاپا... ناممکن!!!

کیا آپ اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگی ہیں؟ کیا اب آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی عمر میں تیزی سے اضافہ ہو رہا اور اسی لیے آپ آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے سے بھی گریزاں رہنے لگی ہیں؟ ان سوالوں کے جواب دریافت کرنے کے لیے آپ کو اپنی روزمرّہ کارکردگی کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا کہ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ آپ کیا اور کیسا کھانا کھاتے ہیں؟ آپ کس انداز میں سوتے ہیں اور ایسی ہی کئی عادات جو آپ کے بڑھاپے میں تیزی سے اضافہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ ماہرینِ طب وطبیعات ونفسیات نے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ چند ایسی عادات پر ریسرچ کی، جنہیں اپنانے سے آپ وقت سے پہلے بوڑھے نظر آنے لگتے ہیں۔

زیادہ میٹھا کھانا یا شکر کی زیادتی:

یہ عادات تیزی سے عمر میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے آپ کے دانت اور مسوڑھے بھی شدید متاثر ہوتے ہیں۔ شوگر میں پائے جانے والے مالیکیول جسم میں موجود سیل میں پائے جانے والی پروٹین فائبر سے جڑے ہوتے ہیں۔ جو مٹھاس کی زیادتی سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس پورے پراسیس کو (GLYATION) کہا جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر چہرے کی تازگی اور سرخی ختم ہونے لگتی ہے۔

کم خوابی:

نیند کا پورا نہ ہونا بھی عمر زیادہ نظر آنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بننے لگتے ہیں اور آنکھیں سوجی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ماہرین تجویز کرتے ہیں کہ کم سے کم سات گھنٹوں کی مکمل اور بھرپور نیند صحت پر خوش گوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ نیند کے لیے ضروری ہے کہ جیسے ہی آپ کو نیند آنے لگے۔ آپ اپنا وقت کسی اور کام میں صرف نہ کریں۔ مطالعہ ترک کردیں، ٹی وی اور موبائل سوئچ آف کردیں اور بستر پر لیٹ جائیں۔ نیند سیاہ حلقوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ چہرے کی ٹون بگڑ جاتی ہے اور آنکھوں کے نچلے حصے میں سوجن پیدا ہونے لگتی ہے۔ ساتھ ہی چہرے کی لکیروں اور جھریوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ چہرے پر پائے جانے والے مساموں کا سائز بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح اگر آپ سدا بہار جلد کے مالک بننا چاہتے ہیں۔ تب شوگر اور اس سے تیار کی گئی اشیاء سے دُور رہیں۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ایسی عادات فوری ترک کردیں جو آپ کی عمر کم کررہی ہیں

کی کمی کئی مسائل کا سبب بنتی ہے۔ توجہ اور ارتکاز میں رکاوٹ پیدا ہوتی اور وزن میں اکثر اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام علامات عمر رسیدگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور وقت سے پہلے بڑھاپا طاری کرتی ہیں۔ اس لیے آپ اپنی نیند کا دورانیہ مقرر کریں اور سونے سے پہلے تمام کام ترک کر دیں۔ یاد رہے کہ آپ کے سونے سے تین گھنٹے قبل رات کا کھانا از حد ضروری ہے۔

ورزش سے گریز

اگر آپ دن کا زیادہ وقت بیٹھ کر گزارتے ہیں تو یہ علامات صحت کے لیے بہتر نہیں۔ یہ اطوارِ زندگی کسی بھی طور پر صحت مند اور خوشگوار زندگی کی ضمانت فراہم نہیں کرتا۔ ایسے

افراد جو اپنے دن کا زیادہ تر وقت کرسی یا صوفے پر بیٹھ کر گزارتے ہیں۔ انھیں گردے، کینسر اور (CARDIO VASCULAR) جیسی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس لیے اس عادت کو فوراً ترک کر دیجیے اور ایسے انداز اپنائیے جن میں آپ کی ٹانگیں زیادہ حرکت کریں۔ کوشش کریں کہ روزانہ ورزش کی عادت پیدا ہو۔

ورزش کرنے سے نا صرف آپ مندرجہ بالا امراض سے دُور رہ سکیں گے بلکہ آپ کی عمر میں بھی اضافہ ہو گا۔ چاق و چوبند رہنا اور چشتی و مستعدی اپنانا زائد العمری کے اثرات زائل کر دیتے ہیں۔

برٹش جرنل آف اسپورٹس میڈیسن کی ایک اسٹڈی رپورٹ کے مطابق جو افراد ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ دنوں میں ۱۵۰ فٹ تک ورزش کرتے ہیں وہ اپنی عمر میں ۱۳ سال تک کا اضافہ کر لیتے ہیں۔

آنکھوں سے بے پروائی

آنکھوں کا خیال نہ رکھنا بے حد مہلک ہے۔ چہرے کی جلد کی حفاظت پر بھی اوّلین ترجیح کے تحت توجہ دینا بے حد ضروری ہے۔ چہرے کی نسبت آنکھوں کے گرد جلد انتہائی پتلی اور باریک ہوتی ہے۔ جہاں سب سے پہلے عمر کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور جھریوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ آنکھوں کے گرد کا حصہ موئسچرائز رکھیں۔ یہ عمر کے کئی سال کم کر دیتا ہے۔ ایسی کریم کا استعمال کریں جس میں وٹامن (E . A) اور (HYALURONIC) اور اینٹی آکسیڈینٹ کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔ یہ مخصوص آئی کریم آنکھوں کے گرد جلد کو سخت رکھے گی اور یہاں پر بننے والی لائنوں کا خاتمہ کرنے میں مدد دے گی۔ اس لیے رات سونے سے قبل آئی کریم سے آنکھوں کے گرد انگلی کی مدد سے ہلکا مساج کریں اور اسے لگا رہنے دیں۔

سن بلاک یا سن اسکرین کا استعمال

سن بلاک یا سن اسکرین کا استعمال کبھی کبھار کرنا غلط ہے۔ سورج کی شعاعیں براہِ راست چہرے پر پڑنے سے جلد بہت تیزی سے خراب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ عمر رسیدگی

کے اثرات تیزی سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ موسم چاہے بارش کا ہو، آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں، گھر سے باہر کسی بھی کام سے جانے سے قبل ایک معیاری سن بلاک جو ۳۰ سے ۵۰ کے درمیان کا ہو ضرور استعمال کریں۔

میک اپ کا غیر ضروری استعمال

میک اپ کا بے تحاشا استعمال بھی چہرے کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اس عمل سے بھی عمر زیادہ نظر آنے لگتی ہے۔ بہت زیادہ میک اپ اپلائی کرنا خاص طور سے ایسی میک اپ مصنوعہ استعمال کرنا جن میں آئل ملا ہو، جلد کے مساموں کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی مصنوعات میں مختلف کیمیکل بھی شامل کیے جاتے ہیں جس سے جلد کی قدرتی چکنائی ختم ہو جاتی اور وہ خشک رہنے لگتی ہے۔ خشک جلد پر لکیریں اور جھریاں بڑی تیزی سے نمودار ہوتی ہیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ میک اپ کے طریقے ایسے بھی ہیں جنہیں بروئے کار لانے سے آپ اپنی عمر سے زیادہ بڑے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس لیے سادہ اور قدرتی میک اپ کو ترجیح دیں اور ایسی اشیاء کا استعمال کریں جو آئل فری ہوں۔ جلد کی حفاظت اور صحت کے لیے ہربل اشیاء کو ترجیح دیں اور رات سونے سے قبل میک اپ اچھی طرح صاف کر کے اور چہرہ دھو کر سوئیں۔

سونے کا غلط انداز

عمر تیزی سے بڑھنے کی ایک وجہ آپ کا سونے کا انداز بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ اپنا چہرہ تکیے پر رکھ کر سونے کے عادی ہیں۔ یعنی ایک طرف کروٹ لے کر یا پھر پیٹ کے بل تو یہ جلد کے لیے بے حد خطرناک ہے۔ چہرہ ایک طرف سے تکیے پر رکھ کر سونے سے جھریاں پیدا ہوتیں اور ان میں تیزی سے اضافہ ہونے لگتا ہے۔

اس عمل سے چہرے کے خلیات کمزور ہو جاتے ہیں اور ان میں سستی آ جاتی ہے۔ اس لیے جب آپ ایک طرف کروٹ لے کر سوتے ہیں تو آپ کی جلد میں نرمی ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس سے لکیریں نمودار ہوتی ہیں اور چہرے پر مستقلاً جگہ بنا لیتی ہیں۔ اسی بنا پر آپ اپنی اس عادت کو فوراً ترک کر دیں اور کمر کے بل سونے کی عادت اپنائیں۔

سافٹ ڈرنکس کا استعمال

سافٹ ڈرنکس پینا ہر شخص کو پسند ہے لیکن انھیں اسٹرا سے پینا نہ صرف دانتوں کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ اس سے آنکھوں کے گرد لکیریں بھی بننے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہونٹوں کے گرد بھی لمبی لمبی لکیریں نمودار ہوتی ہیں جو اس مستقل عمل سے چہرے کو تیزی سے عمر رسیدہ بنا دیتی ہیں۔ اسٹرا کے علاوہ تمباکو نوشی سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ اس لیے سافٹ ڈرنک پینے کے لیے اسٹرا کے بجائے گلاس کا استعمال کریں اور سگریٹ نوشی ترک کرنا تو آپ کی صحت اور عمر کے لیے ناگزیر اہمیت کا حامل ہے۔

چکنائی کا استعمال

کچھ لحمیات جسم کے لیے انتہائی ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ جن کا تعلق موڈ اور خوشگواریت سے ہوتا ہے۔ اومیگا ۳ فیٹی ایسڈ سے بھرپور غذائیں مچھلی، اخروٹ اور FLAX بیج کا استعمال جلد کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ یہ غذائیں جھریوں کے عمل کو روکتیں اور جسمانی دماغی صلاحیتوں کو بہتر بناتی ہیں۔ ہفتہ میں دو بار مچھلی آپ کے کھانے کی میز پر ضرور ہونی چاہیے۔

ایک ہی انداز میں بیٹھے رہنا

اگر بہت دیر تک ایک ہی انداز میں ایک کام کرنے کے عادی ہیں تو یہ بھی آپ کی صحت اور جلد کے لیے نقصان دہ ہے۔ کئی گھنٹوں تک لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ کر کام کرنا یا رات گئے تک ایک ہی نشست میں ٹی وی دیکھنا یا بہت دیر تک کتاب پڑھنا بھی کسی طرح آپ کے لیے سودمند نہیں۔ چہرے کے عضلات میں اُتار چڑھاؤ اس میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ ایسی عادات نظر انداز کیجیے۔

یاد رکھیے، عمر بڑھنے کا عمل قدرتی ہے لیکن اپنی سمجھ بوجھ اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے ہم اس کی حفاظت کر سکتے ہیں اور اس کے برے اثرات کو قابو میں کر کے تادیر جوان، صحت مند اور ہشاش بشاش رہنا ممکن ہے۔

◆◆◆

مریم حجاب

پیاس

تھل کے ریگستان میں سورج اس وقت آگ برسا رہا تھا۔ گرمی سے انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ساتھ مادی اشیاء بھی جھلس کر رہ گئی تھیں۔ اس وقت تھل میں سورج سوا نیزے پر تھا اور وہاں قیامت کی سی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس حال میں کہ جب گرمی اور دھوپ سے ہر چیز جھلس کر رہ گئی تھی، تھل کے رہنے والے اپنے امورِ زندگی کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ وہ اپنی جھلستی جلدوں اور سوکھے گالوں کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں ایسے مصروف تھے جیسے گرمی سے انھیں کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو بلکہ وہ شاید اس سے بھی زیادہ گرمی اور پیاس جھیلنے کے عادی ہوں۔ یہ بات سچ بھی تھی کہ وہ اس سے

سورج سوا نیزے پر آگ برسا رہا تھا اور ایک قیامت خدا بخش کے تعاقب میں تھی

"کچھ انتظام ہوا؟" وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا بیوی نے فوراً پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مایوسی سے کہا اور ایک بار پھر ڈھونڈنے چلا گیا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکا تھا مگر پانی جیسے نہ ملنا تھا اور نہ ہی وہ ملا۔ اس وقت چھوٹے سے اُس کچے جھونپڑے میں ایک بچہ پانی کے لیے تڑپ رہا تھا مگر باوجود لاکھ کوشش، پانی دستیاب ہی نہیں تھا۔ اس جگہ پہ ٹھنڈا پانی سونے سے زیادہ قیمتی تھا!!

زیادہ صحرا کی تپش جھیلنے کے عادی تھے۔

وہ کئی کئی دن تک پانی کے بغیر گزارہ کیا کرتے۔ اس تپتے تھل کے ایک گاؤں میں بسا چار افراد پر مشتمل خاندان بہت پریشان تھا۔ خاندان کا سربراہ خدا بخش چرواہا تھا اور صحرا میں دُور دُور تک مویشی چرانے کے لیے جایا کرتا مگر یہ سارے جانور اس کے نہیں بلکہ گاؤں کے سیٹھ کے تھے، جسے سب 'سیٹھ جی' کہا کرتے تھے۔

سیٹھ جی تھل کے سب سے بڑے مویشیوں کا بیوپاری اور بے حد ظالم اور سفاک انسان تھا۔ اس کی حویلی میں مال و دولت کی کمی نہ تھی مگر وہ غریب گاؤں والوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی جائز اُجرت بھی کاٹ لیتا۔ خدا بخش کی بیوی رحمت اور دو بچے صغرا اور رمضو تھے۔ وہ سب کئی دن سے بھوکے اور اس وقت تین سالہ رمضو کی وجہ سے پریشان تھے کیونکہ وہ اب بھوک اور پیاس کی شدت کی وجہ سے قریب المرگ تھا۔ رحمت رمضو کی حالت دیکھ کر تڑپ رہی تھی۔

خدا بخش کو جانے کیا سوجھی کہ وہ رمضو کو لے کر سیٹھ جی کی حویلی میں چلا گیا۔ خدا بخش کا سارا خاندان بھوکا پیاسا تھا۔ خدا بخش، اس کی بیوی اور بیٹی تو کسی طرح برداشت کر رہے تھے مگر معصوم رمضو جو ابھی تھا تو دو سال کا مگر نا کافی خوراک کے باعث چھے ماہ کا لگتا، غربت سے نابلد بھوک و پیاس سے پریشان تھا کیونکہ کئی روز سے بارش نہ ہونے کے باعث ان کے پاس پانی کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ تھل کے صحرا میں پانی کی دستیابی کا واحد ذریعہ بارش ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو لوگ عارضی نہروں اور تالابوں میں پانی جمع کر لیتے اور بعد میں کئی ہفتوں تک یہی پانی استعمال کرتے ہیں۔

خدا بخش جب سیٹھ جی کی حویلی پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کھلے عام رزق کا ضیاع ہو رہا ہے اور دوسری طرف گاؤں میں خدا بخش اور اس جیسے کئی لوگ اس رزق کے ذرّے ذرّے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اس کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو بھی تیار تھے۔ خدا بخش کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ سیٹھ جی اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے ہر مہینے سامان بڑے شہر سے وافر مقدار میں منگواتا تھا۔ اس میں سے ایک دانہ بھی گاؤں والوں کو نصیب نہ ہوتا۔

اس گاؤں میں سیکڑوں پریشان حال خاندان آباد تھے۔ مگر سیٹھ جی اور اس کے خاندان والے صرف اپنے اور اپنے چہیتے ملازمین پر رقم خرچ کرتے تھے۔ چوہدری کے بیٹے اِردگرد کے گاؤں میں غنڈے مشہور تھے۔ عورتوں اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ تو ان کا معمول تھی۔ جب کوئی گاؤں والا ان کی غلطی سے شکایت کر بیٹھتا تو اکثر قریبی شہر کے تھانے کی پولیس انھیں پکڑ لے جاتی۔ سیٹھ جی فوراً جاتے اور اپنے لاڈلے بگڑے ہوئے بیٹوں کو چھڑا لاتے۔ اب تو تھانے والے ان کے اور یہ تھانے والوں کے عادی ہو گئے چکے تھے۔

☆☆☆

'سیٹھ جی! وہ گاؤں سے آپ کے مویشیوں کے ریوڑ کا چرواہا آیا ہے۔'' سیٹھ جی کے چہیتے ملازم نتھو نے انھیں تقریباً ہانپتے ہوئے اطلاع دی۔

سیٹھ جی جو اس وقت پھلوں کا تازہ رس پینے میں مصروف تھے بولے، ''کیوں آیا ہے وہ؟ ایسی بھی کیا موت پڑی تھی اسے۔'' سیٹھ جی کی کانی آنکھ جو سوج کر سیاہ مائل نیلی ہو چکی تھی، ان کے چہرے کو اور بھی مکروہ بنا رہی تھی۔

''لگتا ہے امداد مانگنے آیا ہے اور ساتھ اپنا مریل سا بچہ بھی لایا ہے۔'' نتھو نے بتایا۔

سیٹھ جی نے گلاس خالی کر کے فرش پر پھینکا اور خدا بخش کو اندر بلوایا۔ وہ اپنے نیم جاں بیٹے رمضو کے ساتھ اندر آیا تو نوکر سیٹھ جی کو پھلوں کے رس کا ایک اور گلاس پیش کر رہا تھا۔

خدا بخش اندر آتے ہی گڑگڑایا، ''سیٹھ جی اللہ کے واسطے کچھ مدد کیجیے۔ میرا رمضو تین دن سے بھوکا پیاسا ہے۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے ورنہ یہ مر جائے گا۔''

''ہم نے تیرے اور دیگر گاؤں والوں کے بچوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا! ہر روز کوئی نہ کوئی اپنا مریل سا بچہ لے کر آجاتا ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے ایک غریب کسان کو کچھ پیسے کیا دے دیے تم سب گاؤں والے تو میرے سر پر چڑھ دوڑے ہو۔ چلو نکلو یہاں سے۔ کسی کو کچھ نہیں ملے گا'' سیٹھ جی سفاکیت سے بولے۔

رمضو کی سانس اب آہستہ آہستہ اٹک رہی تھی۔ خدا بخش سیٹھ جی کے پیروں میں بیٹھ کر التجا کرنے لگا، ''سیٹھ جی اللہ کے واسطے مدد کر دیجیے اور کچھ نہیں تو اس ماہ کی میری بقیہ اُجرت

ہی ادا کر دیں۔'' جیسے ہی خدا بخش نے یہ کہا سیٹھ جی نے کھسیاہٹ میں اُسے زوردار ٹھوکر ماری۔ خدا بخش کے ساتھ ساتھ معصوم رمضو بھی دُور جا گرا۔ سیٹھ اب اونچی آواز میں چیخ رہا تھا۔

''ساری اُجرت تیری سزا کے طور پر کاٹ لی ہے اور آئندہ حویلی کا رخ بھی نہ کرنا۔ اوئے لالو، شیرو..... جلدی آؤ اور نکالو اس کمی کمین کو حویلی سے۔'' سیٹھ جی کے ملازم ان کی ایک آواز پر دوڑے چلے آئے اور خدا بخش کو دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔

رمضو اب خدا بخش کے ہاتھوں میں ڈھلک چکا تھا۔ اسے اللہ نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس ظلم پر خدا بخش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک نظر وہ حویلی پر ڈالتا اور دوسری نظر اپنی گود میں موجود رمضو کے مردہ جسم پر۔ وہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ اپنی خستہ حال جھونپڑی کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اس رات تھل میں خوراک کی کمی کے باعث اور بھی بچے انتقال کر گئے۔ رحمت نے جب رمضو کے مردہ جسم کو دیکھا تو چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ خدا بخش گھبرا گیا۔ کچھ دیر بعد جب رحمت ہوش میں آئی تو خود کلامی کرتے ہوئے بولی، ''اللہ کا شکر ہے کہ میرا بچہ اب مزید نہیں تڑپے گا۔ اللہ پاک جنت میں اسے سیراب کر دے گا۔''

خدا بخش بیوی کی بات سن کر تڑپ کر رہ گیا۔ رحمت اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ اُسے اس کے حال پر چھوڑ کر خدا بخش باہر چلا گیا۔ رات کو رمضو کی تدفین کے بعد خدا بخش جھونپڑی کے صحن میں رکھی چارپائی پر آلیٹا۔ سوچتے سوچتے اس کا ذہن کربلا کے میدان میں جا پہنچا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کربلا کے میدان میں موجود ہو۔ نواسۂ رسول ﷺ کے شیر خوار بیٹے معصوم علی اصغر کو ظالموں نے کس طرح بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔

مولا حسینؑ بھی تو اپنے معصوم بیٹے کی پیاس سے بے تاب ہو کر اسے پانی پلانے لے گئے تھے۔ افواج نے کیا کیا! معصوم علی اصغر کو پانی کے بجائے لہو سے سیراب کر دیا۔ مولا حسین نے بیٹے کو بانہوں میں اُٹھا کر پانی مانگا ہی تھا کہ دشمن کی افواج میں سے کسی نے ہانک لگائی، ''بچے کا نام لے کر

پانی خود پیے گا۔'' امام حسینؑ نے یہ سن کر علی اصغر کو تپتی ریت پر لٹا دیا۔

چھے ماہ کے بچے نے ''العتش العتش'' کہتے ہوئے پانی کی فریاد کی۔ اس سے پہلے کہ افواج کے باقی فوجیوں کو رحم آتا شمرِ ملعون کے اشارے پر حرملہ نے تین پھل والا تیر (وہ تیر جو شکار اور جنگ کے دوران بھاگتے ہوئے بڑے جانوروں کو گرانے کے کام آتا ہے جیسے ہاتھی، گھوڑا، اُونٹ اور دیگر حیوان) کھینچ کر مارا۔ معصوم علی اصغر کا گلا چھلنی ہو گیا اور ساتھ ہی مولا حسینؑ کا بھی بازو زخمی ہو گیا۔ اگر علی اصغر امام حسینؑ کی بانہوں میں نہ ہوتا تو جہاں جہاں تیر جاتا علی اصغر تیر کے سنگ اُڑتا ہوا ساتھ جاتا کیونکہ تیر کا وزن علی اصغر سے کہیں زیادہ تھا۔

جب اُمِ رباب (والدہِ علی اصغر) اور امام حسینؑ نے بیٹے کو چھپ کر خیمے کے احاطے میں دفنایا تو اس پر ظالموں نے نیزہ مار کر ننھے سے علی اصغر کے جسدِ خاکی کو زمین سے نکالا اور سر بھی کاٹا۔ سر کاٹ کر دیگر شہدائے کربلا کے سروں کے ہمراہ شام لے گئے۔ تین دفعہ افواجِ یزید نے علی اصغر کو شہید کیا مگر رمضو تو صرف ایک بار ہی مرا تھا۔ اب خدا بخش کو طفلِ امام حسینؑ کے غم کے سامنے اپنا غم کچھ بھی نہ لگا۔ وہ سکون سے سو گیا۔

دوسرے دن رحمت نے اپنے شوہر کو پُرسکون دیکھا تو حیران ہوئی۔ ابھی وہ اپنی حیرت کا اظہار کرنے ہی والی تھی کہ اس کی بیٹی صغرا روتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ دونوں پریشان ہو گئے۔ رمضو کے مرنے کے بعد صغرا ان کی واحد اولاد تھی۔

''کیا ہوا دھی رانی؟'' خدا بخش نے بیٹی سے پوچھا۔

''ابا! آج پھر سیٹھ جی کے آوارہ بیٹے نے اتنے لوگوں کے سامنے میرا ڈوپٹا چھین کر زمین پر پھینک دیا۔ میں اس وقت کنویں سے پانی بھر رہی تھی۔ سب لوگ بجائے اسے روکنے کے اُلٹا ہنسنے لگے۔ میں جلدی سے اپنا ڈوپٹا اُٹھا کر گھر آ گئی مگر گھڑا وہیں رہ گیا۔'' صغرا یہ سب بتاتے ہوئے اب باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اور رحمت اُسے تسلی دے رہی تھی۔

صغرا کی بات نے خدا بخش کو ایک بار پھر کربلا کی یاد دلا دی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کربلا میں ہو اور یزید کے سپاہی امام حسینؑ کی شہادت کے بعد سیدزادیوں

کے سروں سے نیزوں کی نوک سے چادریں چھین رہے اور خیموں کو آگ لگا رہے ہیں۔ فاطمہ زہراؑ کی بیٹیاں ننگے سر کھڑی تھیں۔ اندھیرا ہونے والا تھا۔ سب بیبیوں نے چہرے اپنے لمبے بالوں میں چھپا لیے تھے۔

خدا بخش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ صغرا کے رونے کی آواز سن کر وہ حال میں واپس آیا۔ صغرا رو رہی تھی اور رحمت پاس بیٹھی اُسے چپ کروا رہی تھی۔

''کیا تمہارا سر زخمی ہے؟'' خدا بخش نے روتی ہوئی صغرا

سے اچانک پوچھا۔ صغرا نے جواباً نفی میں سر ہلایا۔

''کیا تمہاری مصیبت سیدہ زینبؓ کی مصیبت سے بڑی ہے؟ جنہیں ننگے سروں کے ساتھ بھرے بازار میں گھمایا گیا۔''

صغرا نے نفی میں سر ہلایا۔ خدا بخش نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''بیٹا یہ ظلم اور یزیدیت کا دور ہے۔ ظالم ابھی طاقتور ہے۔ یزید صرف امام حسینؓ کا قاتل ہی نہیں بلکہ ہر وہ ظالم یزید ہے جو انسانیت کو پامال کرے، اس کا قتل کرے اور مظلوموں پر ظلم ڈھائے مگر ظلم اور ظالم ہمیشہ طاقتور نہیں رہتے۔ ہر یزید کو کچلنے کے لیے ایک امیر مختار آتا ہے۔ سیٹھ جی کے لیے بھی کوئی مختار ثقفی ضرور آئے گا۔'' خدا بخش یہ کہہ کر خود تو باہر چلا گیا مگر صغرا کو سوچ میں ڈال گیا۔

اگلے کچھ مہینوں تک بارش نہ ہوئی۔ علاقے میں قحط پڑ گیا۔ لوگ پانی کے ایک گھونٹ اور اناج کے ایک ایک دانے کو ترس گئے۔ انسان اور جانور ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ باقی لوگوں کے مویشیوں کی طرح سیٹھ جی کے جانور بھی ایک ایک کر کے مر رہے تھے۔ اس کے آدھے سے زیادہ مویشی ہلاک ہونے کے باوجود سیٹھ جی کی تجوریوں میں اس وقت اتنی دولت تھی کہ وہ کئی سالوں تک بغیر کام کیے گھر بیٹھ کر عیش و عشرت کی زندگی جی سکتا اور وقت آنے پر مزید جانور بھی خرید سکتا تھا۔

جن دنوں سیٹھ کی بستی اور آس پاس کی بستیوں میں لوگ بھوک سے مر رہے تھے، اِس وقت سیٹھ جی کی حویلی میں ہر روز نت نئی دعوتیں منعقد ہو رہی تھیں۔ انھی دنوں چودھری کا بڑا بیٹا سکندر گاؤں آیا ہوا تھا۔ سکندر قریبی شہر میں گریجوایشن کا طالبعلم تھا۔ اپنے باپ اور بھائیوں کی نسبت سکندر ایک باشعور انسان تھا۔ وہ بچپن سے ہی رحمدل تھا اور اب تو تعلیم نے اس کے اندر مزید شعور جگا دیا تھا۔ سکندر جب شہر سے آیا تو وہ گاؤں گھومنے جانا چاہتا تھا مگر سیٹھ جی نے اسے نہ جانے دیا کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں سکندر کو ان کے مظالم کی خبر نہ ہو جائے۔

سکندر کے آنے کی خوشی میں سیٹھ جی نے سب رشتے داروں کی دعوت کی۔ ایک طرف سیٹھ جی کی دعوت میں کھانا بری طرح سے ضائع کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف بستی کے سیکڑوں نفوس بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ دوسرے دن سکندر سیٹھ جی کو بغیر بتائے گاؤں چلا گیا۔ وہاں کے لوگوں کو بھوک اور پیاس سے تڑپتا دیکھ کر وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے کئی لوگوں کی نظروں میں اپنے لیے نفرت و حقارت دیکھی۔ اس نے ایک بزرگ سے اس کی وجہ پوچھی۔

''بابا جی کیا بات ہے؟ آپ سب لوگ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''یہ بات اپنے باپ سے پوچھو جا کر۔ بستی والوں کی زمینوں اور جانوروں پر فرعون بن کر بیٹھا ہے۔ اور تو اور گاؤں کے اکلوتے کنوئیں پر بھی قبضہ کر رکھا ہے۔ ہر روز سیکڑوں لوگ بھوک پیاس سے مر جاتے ہیں یہاں۔ صرف تمہارے باپ کی وجہ سے۔'' بابا جی کے لہجے میں نفرت، ڈر اور بے بسی تھی۔

''وہ کیسے۔'' سکندر نے پوچھا تو بابا جی نے سیٹھ جی کا ظلم تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ اپنے باپ اور بھائیوں کے کارنامے سن کر سکندر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کو یقین نہ آیا کہ وہ ایسا بھی کر سکتے ہیں! اس نے اپنے طور پر تحقیقات کا فیصلہ کر لیا

وہ چپ چاپ وہاں سے حویلی واپس چلا گیا۔

اگلے دن حسبِ معمول شہر سے حویلی کا تین مہینے کا راشن، کھانے پینے کا سامان اور ایک میٹھے پانی کا ٹینکر شہر سے آیا۔ جب دونوں گاڑیاں حویلی کے قریب پہنچیں تو اِردگرد سے بھوکے پیاسے لوگ حویلی کے دروازے میں اکٹھے ہو کر للچائی نظروں سے سامان کی طرف دیکھنے لگے۔

سکندر کو اُن پر بہت ترس آیا۔ اس نے راشن اور کھانے پینے کا سارا سامان گاؤں والوں میں بٹوا دیا۔ اس کے بعد گاؤں والوں کے گھروں سے برتن منگوا کر ٹینکر کا سارا پانی ان میں تقسیم کر دیا۔ سب گاؤں والے سکندر کا شکریہ ادا کرتے اور ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔

سیٹھ جی کے وفادار ملازم نے اُسے یہ سب کچھ کرنے سے روکنے کی کوشش کی مگر سکندر بھی اپنے ارادے کا پکا تھا۔ اس نے ملازم کی ایک نہ سنی اور ملازم کو منہ بند رکھنے کی تلقین کر کرتا ہوا اندر چلا گیا۔

اس دن اتفاقاً سکندر حویلی میں اکیلا تھا۔ باقی سب گھر والے کسی رشتے دار کی طرف مدعو تھے۔ شام کو جب وہ واپس آئے تو ملازم نے سیٹھ جی کو صبح کا سارا واقعہ بتا دیا۔ اس سے قطع نظر کہ سکندر نے بتانے سے منع کیا تھا! سیٹھ جی نے سکندر کو کمرے میں بلایا۔

''کیوں بھئی صاحب زادے! کچھ دن شہر میں کیا گزار لیے، خود کو حاتم طائی ہی سمجھ بیٹھے۔ یاد رکھ تُو شہر میں بھی میرے پیسوں پر عیش کرتا تھا۔ کس سے پوچھ کر تُو نے سب کچھ گاؤں والوں میں بانٹا؟ کیا میرا حرام کا مال ہے جو ان کمی کمینوں پر لٹاتا پھروں؟'' سیٹھ جی نے انتہائی مکروہ لہجے میں کہا۔

سکندر پہلی بار باپ سے ایسا کچھ سن رہا تھا۔ اسے بابا جی کی ساری باتوں کا ثبوت مل گیا۔ مزید تحقیقات کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے اپنے باپ سے کہا:

''اللہ نے آپ کو دولت ہی ہے۔ اس پر اللہ کے بندوں کا سب سے زیادہ حق ہے۔''

سیٹھ جی نے مزید نفرت سے کہا: ''وہ ہماری زمینوں پر رہتے ہیں۔ یہیں پلتے بڑھتے ہیں ہمارے پیسے پر۔ ہماری مرضی کہ کسے دیں اور کسے نہ دیں۔ اگر کوئی بھوکا پیاسا مرتا ہے تو میری بلا سے۔''

سکندر یہ سب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

''ابّا ڈر واللہ سے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ میں تمہارا پیسہ خرچ کر کے اس ظلم کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔ اسی لیے آج سے تم میرے بابا اور نہ میں تمہارا بیٹا۔ خدا حافظ۔''

سکندر یہ کہہ کر گھر سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے گھر سے کچھ ساتھ نہ لیا سوائے اپنی کتابوں کے۔ سکندر بھی اپنے ظالم باپ کو چھوڑ گیا بالکل اسی طرح جیسے یزید کا بیٹا معاویہ ابن یزید ظالم باپ کو چھوڑ کر قطع تعلق کر گیا تھا۔

☆☆☆

سکندر کے جاتے ہی سیٹھ جی کا زوال شروع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ سارے جانور مر گئے۔ آگے پیچھے پھرنے اور ہاں میں ہاں ملانے والے خوشامدی سارے ملازم ساتھ چھوڑ گئے۔ سیٹھ جی کے سب سے خاص ملازم نے ان کے بھروسے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تجوری کی ساری دولت چرا لی۔ سیٹھ قلاش ہو گیا۔ زمینوں پر رشتے داروں نے قبضہ کر لیا۔ بیوی سیٹھ جی کو چھوڑ کر سکندر کے پاس شہر چلی گئی۔ گاؤں میں نیا افسر آیا۔ اس نے آتے ہی سیٹھ جی اور اس کے چہیتے بیٹوں کو سرکاری امداد ضبط کرنے اور دیگر جرائم کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ گاؤں میں نیا سربراہ مقرر کر کے افسر شہر واپس چلا گیا۔

جانتے ہیں نیا سربراہ کون تھا؟

''خدا بخش۔'' خدا بخش جیسا غریب انسان سربراہ کیسے بنا؟ یہ بات پھر کبھی!

●●●

محمد حسنات حمید

گوس مینار

برصغیر میں مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں بے پناہ علمی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور تعمیراتی خدمات سرانجام دیں۔ بالخصوص مغلوں کا دور ہر اعتبار سے قابل ذکر اور روشن رہا۔ برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں مغل حکمرانوں کی یادگاریں ان کے درخشاں ماضی کی گواہ ہیں۔

لاہور مغلوں کے پسندیدہ شہروں میں سے ایک رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس شہر کو متعدد باغات، مساجد اور مختلف تعمیرات سے مالا مال کیا۔ گو سنگدل ہاتھوں نے ان عمارات کو لوٹ مار کر ویران کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان کی شان و شوکت کو تباہ نہ کر سکے۔ آج بھی لاہور کے متعدد گلی کوچے اور بازار اس کے گزرے کل کی خوشگوار یادیں سینے میں بسائے وقت کی ستم ظریفی پر نوحہ خواں ہیں۔

لاہور کے علاقہ گڑھی شاہو میں بھی کئی تاریخی یادگاریں ہیں۔ انھی میں تاریخ کی نشانی ''کوس مینار'' بھی شامل ہے۔ ایسے مینار مغل فرمانروا شہنشاہ جہانگیر کے حکم سے لاہور سے آگرہ تک تعمیر کیے گئے تھے۔ باقی مینار تو افتادِ زمانہ کی نذر ہو گئے مگر لاہور میں صرف ایک مینار کسی نہ کسی طرح بچا ہوا ہے۔

نورالدین محمد جہانگیر نے 1604ء میں راج سنگھاسن سنبھالا تو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ اس سلسلے میں اس نے بارہ اصلاحی احکامات نافذ کیے جو دستورالعمل کہلائے۔ ان احکامات کی بجا آوری سلطنت کے ہر مرد پر لازم تھی۔ اس دستورالعمل میں شاہراہوں کے تحفظ، تاجروں اور تجارتی قافلوں کی حفاظت، چوری، ڈکیتی کے انسداد اور عام شہریوں کی فلاح کے لیے خصوصی اقدامات اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ شاہراہوں کے متصل سرائیں، مساجد اور کنوئیں تعمیر کیے گئے۔ مسافروں کی سہولت اور آرام کے لیے

وطنِ عزیز میں تاریخی مقامات کی بے قدری کے باوجود جو ''زندہ'' رہ گیا

تاریخی عمارات ملک وقوم کی ثقافت کی علامت اور قومی تاریخی ورثہ ہوتی ہیں، آئندہ نسلوں تک اپنی ثقافت پہنچانے اور تاریخی عمارات کو محفوظ بنانے کے لیے حکومت کے ساتھ مل کر عوام کو بھی ہر ممکن تعاون فراہم کرنا ہوگا۔ قدیم عمارتوں کو ماضی کے نقوش کے مطابق ازسرنو تزئین وآرائشی کام فن مہارت کا دلکش شاہکار ہوتا ہے۔

یہ تاریخی عمارتیں اور ثقافتی ورثہ صرف آپ کی نسل کے لیے نہیں کہ آپ اسے درست کر کے، کسی حد تک گزشتہ حالت میں بحال کر کے اس کو ایک خوبصورت کھلونے کی طرح استعمال کریں اور اس کی وہ حالت کر دیں آپ کے بعد کی نسلیں اس کے کھنڈرات پر آ کر ماتم کریں اور کہیں کہ کبھی یہاں فلاں تاریخی عمارت ہوا کرتی تھی۔

راستے کا تعین کرنے کے لیے مینار بن گئے اور وہاں درخت لگائے گئے۔

تفرکِ جہانگیری میں جہانگیر رقم طراز ہے کہ اس کے حکم سے دریائے اٹک تک سڑک کے دونوں جانب درخت لگائے گئے تھے۔ اس سے قبل آگرہ سے بنگال تک اسی طرح سڑک کے دورویہ درخت لگائے جا چکے تھے۔ ان انتظامات کے بعد مغلیہ سلطنت میں سفر کرنا انتہائی آسان اور آرام دہ ہو گیا تھا۔

پروفیسر شجاع الدین کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ جہانگیر نے 1618ء میں حکم دیا کہ آگرہ سے لاہور تک شاہراہ اعظم پر کوس کوس کے فاصلے پر ایک مینار تعمیر کیا جائے اور ہر تین کوس کے فاصلے پر کنواں کھودا جائے تاکہ مسافر ان کنوؤں سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ آپ مزید لکھتے ہیں کہ جہانگیر کے بنوائے ہوئے کوس مینار اب بھی پرانی شاہراہ پر لاہور اور آگرہ کے درمیان ملتے ہیں۔

لاہور میں ایک کوس مینار ریلوے اسٹیشن سے مشرقی جانب جہاں ملتان اور امرتسر کی طرف جانے والی ریلوے لائن ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ دونوں لائنوں کے درمیان اس جرنیلی سڑک سے متصل گڑھی شاہو سے مغل پورہ کے کارخانوں کی طرف جاتی ہے واقع ہے۔

یہ مینار فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اگرچہ اس کوس مینار سے متصل اس وقت پرانی شاہراہ کے آثار نہیں ملتے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے مغلیہ دور کی شاہراہ گزرتی ہوگی۔ یہ شاہراہ شہر کے دہلی دروازے سے نکل کر محلہ چوک دادا سے ہوتی ہوئی مغل پورہ میں آ جاتی تھی اور مغل پورہ سے ہوتی ہوئی دہلی کی جانب جاتی تھی۔

مؤرخ لاہور نور محمد چشتی اپنی تصنیف ''تحقیقات چشتیہ'' میں اس مینار کو مینار شاہ جہانی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوس مینار پونے دو دو کوس پر بنے تھے چنانچہ اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں۔

''تحقیقات چشتیہ'' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مینار جہانگیر کے دور میں نہیں بلکہ شاہ جہاں کے عہد میں بنائے گئے تھے۔ اس لیے مینار ''شاہ جہانی'' تھے۔ علاوہ ازیں یہ دو دو کوس پر واقع تھے اس لیے انھیں ''کوس مینار'' کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ پروفیسر شجاع الدین نے اپنی تحقیق میں لکھا ہے۔

''یہ مینار کس نے کب اور کتنے فاصلے پر تعمیر کیے اس بات میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ بات مصدقہ ہے کہ ان میناروں کی تعمیر کا مقصد فلاحِ عوام تھا۔ وگرنہ دنیا میں تعمیر ہونے والے بیشتر مینار کسی یادگار فتح کی علامت پر تعمیر کیے گئے۔ ایران میں 50 کے قریب تاریخی مینار ہیں۔ ان میں ''ساسانیوں'' اور ''ابوقوہ'' کے مینار خوبصورتی اور نفاست میں بے مثال ہیں لیکن ان کا کوئی خاص مصرف نہیں اس طرح ''مینارہ بابل'' محض انسان کی اس خواہش کا اظہار تھا کہ وہ آسمان تک پہنچنا چاہتا تھا اور مینار آسمان پر پہنچنے کا راستہ تھا۔

اس طرح محمود غزنوی نے اپنی وسیع سلطنت ایران، ہندوستان اور مشرق بعید میں اپنی فتح کے اظہار کے لیے مینار بنوائے تھے۔ اس کے برعکس مذکورہ مغل میناروں کی تعمیر لوگوں کو سہولت اور سفر میں آسانی پیدا کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس قسم اور نوعیت کے مینار شاید بہت کم دنیا میں بنائے گئے ہیں۔

کوس مینار یا مینار شاہ جہانی کے لاہور میں موجود آخری آثار گڑھی شاہو کی لا ریکس کالونی نشتر پارک میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے قریب ہی گرڈ اسٹیشن ۲ ہے اور اس سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔ یہ جگہ پاکستان ریلوے کی ملکیت ہے۔ محکمہ نے یہ جگہ گریڈ کے مطابق اپنے ملازمین کو ننانوے سالہ لیز پر دے رکھی ہے۔ جس پر مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔ تاہم یہ مینار ایک پلاٹ میں محفوظ کر لیا گیا۔ اس پلاٹ کا رقبہ ایک کنال کے لگ بھگ ہے۔

مینار کی بلندی تقریباً بائیس فٹ کے قریب ہے۔ اس کی شکل بوتل نما اور اس کا پلیٹ فارم ہشت پہلو ہے۔ جس پر سے پلستر ختم ہو چکا اور چھوٹی اینٹ صاف دکھائی دیتی ہے۔ مینار کے اُوپر لگا انگریزی دور کا نیلا بورڈ لکھائی سے پاک ہو چکا ہے جبکہ ایک اور بورڈ بھی ہے۔ اس پر یہ عبارت سبز رنگ سے تحریر ہے۔

''یہ عمارت قانون تحفظ آثار قدیمہ مجریہ 1975ء کے تحت محفوظ کی گئی ہے۔ جو شخص اس عمارت کو نقصان پہنچائے گا یا اس پر نام کندہ کرے گا یا اس پر ناجائز قبضہ کرے گا، اسے لمبوجب ایکٹ مذکورہ بالا سیکشن تین سال قید بامشقت جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ اس عمارت کی حدود میں بلا اجازت کسی قسم کی تعمیر کرنا خلاف قانون ہے۔ لمبوجب ایکٹ مذکورہ بالا سیکشن ڈائریکٹر محکمہ آثار قدیمہ۔

بورڈ سے سرخ رنگ میں لکھے الفاظ مٹ چکے ہیں۔ اس لیے تحریر میں سیکشن نمبر اور حدود بھی پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مینار پر کوئی پتھر یا ٹائلیں لگی ہوں گی۔ جنہیں بعد کے ادوار میں اُتار لیا گیا ہوگا۔ کیونکہ مینار پر اگر نقش ونگار بنے ہوتے تو شاید محفوظ رہتے اور کوئی انھیں ضائع نہ کرتا لیکن پتھروں کے لالچ میں ان عمارتوں کو تباہ کر دیا گیا۔

مینار والے پلاٹ میں پودے تو لگائے گئے ہیں لیکن کوڑا کرکٹ بھی بکثرت نظر آتا ہے۔ کسی محکمے کو چاہیے کہ وہ یہاں وقتاً فوقتاً صفائی کا انتظام کرے۔ یہ انتظام محکمہ ریلوے یا محکمۂ آثار قدیمہ، دونوں میں سے کوئی بھی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان محکمات کو چاہیے کہ ان میں کوئی ایک مینار سے متعلق، معلوماتی بورڈ وغیرہ بھی یہاں نصب کرا دے۔ اس طرح عام لوگوں کو جہاں مینار سے متعلق معلومات حاصل ہوں گی وہاں اہل علاقہ میں اس کے تحفظ کا احساس بھی شدت سے اُبھرے گا۔ کیونکہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کی نئی نسل میں اپنے ورثہ کے تحفظ کا شعور اور شوق اُجاگر ہو رہا ہے اور وہ ماضی کی یادگاروں کا تحفظ اب قومی فرض سمجھ کر کر رہے ہیں۔

◆◆◆

اقبال اور فقیری

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقت پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس وخاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرق ناک

☆☆☆

سُرخ آنکھیں

ڈیوڈ ہبرڈ

خوفناک مگرمچھ کی اپنے پانچ ساتھیوں کے خون کا بدلہ لینے کی سنسنی خیز داستان

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مَیں دریا میں گرا، تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے پانی میں دھکیل دیا ہے۔ میرا جسم ایک دم سُن ہو گیا اور ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ مَیں نے بمشکل اپنے اوسان بحال کیے۔ دراصل حادثہ ایسا فوری تھا کہ مَیں پانی میں گرنے سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا، ورنہ مجھ جیسا تجربہ کار اور مشاق شکاری یوں بچوں کی طرح پانی میں گر جائے، قطعی ناممکن بات ہے۔ وہ موذی مگرمچھ جس کا مَیں تعاقب کر رہا تھا، ضرورت سے زیادہ قوی اور چالاک ثابت ہوا۔ مَیں نے اپنا ہارپون متعدد مرتبہ اِس کے اُوپر پھینکا، لیکن ہر بار وہ صاف بچ نکلتا۔ مگرمچھ بار بار پانی کی تہ میں جاتا اور پھر سطح پر آتا۔ اِس کی لمبی دُم پانی میں تیزی سے گردش کر رہی تھی اور پانی دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گرمی سے اُبل رہا ہے۔ میری کشتی اب مگرمچھ کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ مَیں نے ایک بار پھر اپنا ہارپون ہاتھ میں سنبھالا اور مگرمچھ کے کھلے ہوئے جبڑے کا نشانہ لے ہی رہا تھا کہ اُس نے اپنی دُم کشتی پر اس زور سے ماری کہ کشتی جھٹکا کھا گئی اور مَیں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور اُلٹ کر دریا میں جا گرا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ گرتے گرتے بھی مَیں نے اپنے ساتھی ہنری کی آواز سنی تھی۔

''کشتی کو مضبوطی سے پکڑ لو، مگرمچھ تمہارے پیچھے ہے۔ مَیں اِس پر حملہ کر رہا ہوں۔''

مَیں ایک دم دریا کی تہ میں بیٹھتا چلا گیا اور جب چند سیکنڈ بعد سطح پر اُٹھا تو خونخوار مگرمچھ کشتی کی دوسری جانب بل کھا رہا تھا۔ ہنری نے جب مجھے پانی کے اُوپر دیکھا، تو چلّایا: ''خبردار..... اُدھر ہی رہنا.....'' پھر اُس نے اپنی ٹارچ روشن کی، ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں چکاچوندی ہوئی اور پھر مَیں نے آگے بڑھ کر کشتی کا ایک تختہ تھام لیا۔ آسمان پر تارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ''ذرا ایک منٹ صبر کرو۔ مَیں تمہارا ہاتھ پکڑتا ہوں۔ ہنری پھر چلّایا۔ اِتنے میں کشتی کو جھٹکا لگا اور میرا ہاتھ پھسل گیا اور مَیں ایک بار پھر پانی میں غوطے کھا رہا تھا۔ مَیں نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے اور کشتی تک پہنچنے کے لیے پوری قوت صَرف کر دی۔ رات ایسی اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ مَیں نے ہنری کو آواز دی، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ موجوں کے شور میں میری آواز دب گئی۔ یکایک میرا ہاتھ کسی نرم شے سے ٹکرایا اور بجلی کی ایک رَو میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میرا ہاتھ مگرمچھ کی کھال کو چھو چکا تھا جو پانی کے

اندر تیر رہا تھا۔ اِتنے میں ہنری کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی:

''ڈیوڈ! یہاں سے فوراً تیر کر دُور نکل جاؤ۔ مَیں دیکھ چکا ہو، کئی مگرمچھ ہیں اور اِن سب سے لڑنا حماقت ہے، وہ ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے ..... جلدی کرو۔'' یہ کہہ کر اُس نے پھر ٹارچ روشن کی اور خوف سے میری جان ہی نکل گئی۔ مجھ سے کوئی دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر ایک مہیب مگرمچھ اپنا جبڑا کھولے موجود تھا۔ اُس کے عقب میں دو چھوٹے مگرمچھ اور تھے۔ مَیں نے جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ مگرمچھ میرے قریب آچکا تھا۔ اِسی لمحے ہنری کی طرف سے ہارپون سنسناتا ہوا آیا اور مگرمچھ کے حلق میں گڑ گیا۔ مگرمچھ درد کی شدت سے پانی کے اندر اُلٹ گیا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ اِس کی لمبی دُم میری پشت سے آ کر لگی اور مَیں ایک بار پھر پانی کے اندر ڈبکیاں کھانے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کوڑے مار مار کر میری پشت لہولہان کر دی ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہنری نے اندھادھند ہارپون پھینکنے شروع کر دیے جو میرے سر کے اُوپر سے سنسناتے ہوئے گزرنے لگے اور مَیں نے سمجھ لیا کہ اب میرا کام تمام ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں۔ مَیں آخری بار حلق پھاڑ کر چیخا:

''ہنری، ارے بے وقوف، گدھے، یہ بند کرو، کیا مجھے مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟''

اتنے میں اُس کی ٹارچ پھر روشن ہوئی اور مَیں نے دیکھا کہ کشتی اب تیس بتیس گز دُور ہے۔ مَیں نے ایک بار پھر کشتی کی طرف ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے، لیکن مَیں تھک گیا تھا۔ دریا کے یخ بستہ پانی نے میرا جسم سُن کر دیا اور پھر دو تین مگرمچھ اب بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر موجود تھے اور مجھے ہڑپ کر لینے کے لیے مستعد ..... موت کا بھیانک چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ ذرا غور کیجیے کہ آدھی رات کا وقت ..... دریا کا سرد پانی ..... تین خونخوار مگرمچھ اور میری اکیلی جان ..... مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا کہ ایسی موت مرنا اپنی قسمت میں لکھا تھا۔ سچ ہے لالچ کے ہاتھوں یہ کڑا وقت دیکھنا پڑا۔ اِن دنوں ہم دونوں پر مگرمچھ مارنے کا بھوت بری طرح سوار تھا، کیونکہ کھالوں کی بڑی مانگ تھی اور ہم اب تک ساٹھ ستر مگرمچھ مار چکے تھے، اِس لیے دوسرے بیشتر شکاری ہم سے حسد کرنے لگے۔ اِسی لالچ کے تحت ہم نے سوچا کہ دن کو تو دوسرے شکاری بھی مگرمچھ کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہ مقابلہ ہمارے لیے بڑا کٹھن ہوتا ہے، اِس لیے کیوں نہ رات کے وقت شکار پر نکلا جائے، چنانچہ ہم آدھی رات کے وقت دریا کے سینے پر اپنی بڑی سے کشتی چلاتے اور ٹارچوں کی مدد سے مگرمچھوں کو تلاش کرتے رہتے اور جلد ہی ہمیں دو تین مگرمچھ مل جاتے جو یا تو ریت پر لیٹے آرام کر رہے ہوتے یا دریا میں تیرتے ہوئے نظر آجاتے۔ ہمارے پاس لمبے لمبے ہارپون تھے۔ یہ نیزے کی شکل کا ایک ہتھیار ہوتا ہے جس کے اُوپر کا حصّہ لمبی رسّی سے بندھا رہتا ہے۔ جونہی ہمیں مگرمچھ پانی میں نظر آتا، پوری قوت سے ہارپون اُس کے اُوپر پھینک دیتے اور ہارپون سنسناتا ہوا جاتا اور مگرمچھ کی گردن یا کمر پر گڑ جاتا۔ مگرمچھ کو اِس طرح متعدد بار زخمی کرنے کے بعد اسے گھسیٹ کر کنارے پر لے جاتے۔ ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ جب کافی رقم جمع ہو جائے گی، تو ایک رائفل خرید لیں گے اور اپنی کشتی میں موٹر بھی لگا لیں گے۔

اُس رات بھی ہم حسبِ معمول مگرمچھ کی تلاش میں نکلے، تو پہلے ہی موقعے پر یہ حادثہ پیش آیا۔ اتنا بڑا مگرمچھ اِس سے پہلے اِس دریا میں کسی نے نہ دیکھا تھا۔ ظالم میں بلا کی قوت تھی اور اِس کا جبڑا تو غار کی مانند کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم خوشی سے پھولے نہ سمائے اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارا نصیبہ اوج پر ہے۔ اِس کی کھال بیچ کر وارے نیارے ہو جائیں گے، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ مگرمچھ کے روپ میں موت میرا تعاقب کر رہی ہے۔

یکا یک مَیں نے محسوس کیا کہ مگرمچھ نے میری دونوں

ٹانگیں اپنے جبڑے میں دبالی ہیں اور مَیں آہستہ آہستہ پانی کے اندر اُتر رہا ہوں۔ مَیں نے مگر مچھ کے جبڑے سے اپنی ٹانگیں آزاد کرانے کی کوشش نہ کی، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اگر ایسی کوشش کی گئی، تو میری ٹانگیں کٹ کر اس کے جبڑے میں رہ جائیں گی۔ مَیں جانتا تھا کہ وہ مجھے ہلاک کرنے کے لیے پانی کے اندر لے جا رہا ہے، مگر فوراً ہی اسے سانس لینے کے لیے پانی کی سطح پر آنا پڑے گا۔ اِس لیے مَیں نے اپنا سانس روک لیا اور اپنے آپ کو مگر مچھ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

یقین کیجیے کہ اگر مجھے سانس روکنے کی مشق نہ ہوتی، تو آج یہ واقعہ آپ کو سنانے کے لیے میرا وجود دُنیا میں نہ ہوتا۔ مگر مچھ نے مجھے اندازاً دو منٹ تک پانی کے اندر دبائے رکھا اور جب اُس نے محسوس کیا کہ مجھ میں حرکت باقی نہیں رہی، تو وہ اِسی طرح مجھے منہ میں پکڑے ہوئے پانی کے اُوپر جانے لگا اور جونہی اُس نے اپنا سر باہر نکالا، مَیں نے پوری قوت سے جھٹکا دیا اور اِس کے جبڑے کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میری کمر کے ساتھ بندھی ہوئی چمڑے کی پیٹی میں لمبا شکاری چاقو موجود تھا۔ اِس سے پیشتر کہ مگر مچھ مجھے دوبارہ اپنے شکنجے میں گرفتار کرے، مَیں نے ہاتھ بڑھا کر چاقو اُس کی گردن کے نچلے حصّے میں گھونپ دیا۔ مگر مچھ کی گردن سے خون نکلنے لگا، لیکن اُس نے اِس زخم کا کوئی اثر قبول نہ کیا اور ایک بار پھر غصے سے بل کھا کر میری ٹانگیں اپنے جبڑے میں دبالیں۔ درد کی شدت سے مَیں تقریباً بے ہوش ہو چکا تھا، تاہم اتنا احساس باقی تھا کہ مگر مچھ مجھے گھسیٹ کر تیزی سے پانی کے اندر تیر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ احساس بھی جاتا رہا اور مَیں قطعی طور پر بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی، تو مَیں نے اپنے آپ کو ایک تاریک اور اِنتہائی بدبودار مقام پر پڑا پایا۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ ہلنے جلنے کی سکت بالکل نہ تھی۔ چند لمحے تک میں وہیں پڑا سوچنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہاں مَیں کیسے آیا اور یہ کون سی جگہ ہے۔ پھر یاد آیا کہ مجھے تو مگر مچھ گھسیٹ کر لایا تھا۔ ذہن کام کرنے لگا اور مَیں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی: تو گہرے کیچڑ کے اندر جسم دھنسنے لگا اور سڑے ہوئے گوشت کی بدبو ٹھنڈی ہوا کے ساتھ اور تیزی سے میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ میں اِس مقام پر قید ہو چکا ہوں جہاں مگر مچھ دن کے وقت آرام کرتا ہے اور اپنی شکار کی ہوئی مچھلیاں اور دُوسرے جانور یہیں چھپاتا ہے تاکہ گوشت خوب سڑ جائے، تو وہ اِسے ہڑپ کر جائے۔ مگر مچھ نے مجھے بھی مردہ سمجھ کر یہاں لا پھینکا تھا اور مجھے اب موت کے اِس گڑھے سے کسی نہ کسی طرح نکلنا تھا۔

یکا یک میں نے اِس تاریک گڑھے کے اُوپر مگر مچھ کے خراٹوں کی آواز سنی۔ یہ آواز سنتے ہی میرا رہا سہا خون بھی خشک ہونے لگا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مگر مچھ باہر موجود ہے اور اگر میں ذرا بھی حرکت کروں گا، تو وہ جاگ اُٹھے گا۔ مجھے اب چپ چاپ یہ مشاہدہ کرنا چاہیے کہ مگر مچھ کیا کرتا ہے۔ رہائی کی ایک ہی صورت ہے کہ اِسے بھوک لگے اور وہ مچھلیاں ہڑپ کرنے دریا کے اندر چلا جائے، مجھے اِس بدبودار کیچڑ سے بھرے ہوئے تاریک غار میں پڑے پڑے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا، لیکن محسوس ہوا جیسے مَیں صدیوں سے یہ عذاب جھیل رہا ہوں۔ میری دونوں ٹانگیں بری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ مگر مچھ کے لمبے دانتوں نے میرے ٹخنوں اور پنڈلی کی ہڈیوں میں سوراخ کر دیے تھے اور مَیں اِنھیں ذرا بھی حرکت دیتا، تو ناقابلِ برداشت دَرد کی ٹیسیں اُٹھنے لگتیں۔ یکا یک اِس گڑھے کے اندر دَریا کا سرد پانی آہستہ آہستہ بھرنے لگا۔ اب تو مَیں سخت گھبرایا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ قبر نما خوفناک گڑھا کم از کم سات فٹ گہرا، تین چار فٹ چوڑا تھا۔ مَیں اپنے انجام سے گھبرا اُٹھا۔ جب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں، تو مجھے اِس کے اندر بڑی بڑی ہڈیوں اور سڑے ہوئے گوشت کے ڈھیر دکھائی دیے۔ مَیں نے کان لگا کر مگر مچھ کے سانس لینے کی

آواز سننا چاہی، مگر اندازہ ہوا کہ وہ بیدار ہو کر دریا کے اندر جا چکا ہے۔ پس مَیں نے اپنی تکلیف کو نظر انداز کیا اور کیچڑ کے اندر ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا اُوپر چڑھنے لگا۔ میرے ہاتھ پیر بار بار پھسل جاتے اور مَیں دھڑام سے گڑھے کی تہ میں جا گرتا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اُس وقت میری جسمانی اور ذہنی کیفیت کا کیا عالم تھا۔ میرے کپڑے اور سارا جسم پانی اور اِنتہائی غلیظ کیچڑ میں لت پت تھا، کانوں کے اندر شائیں

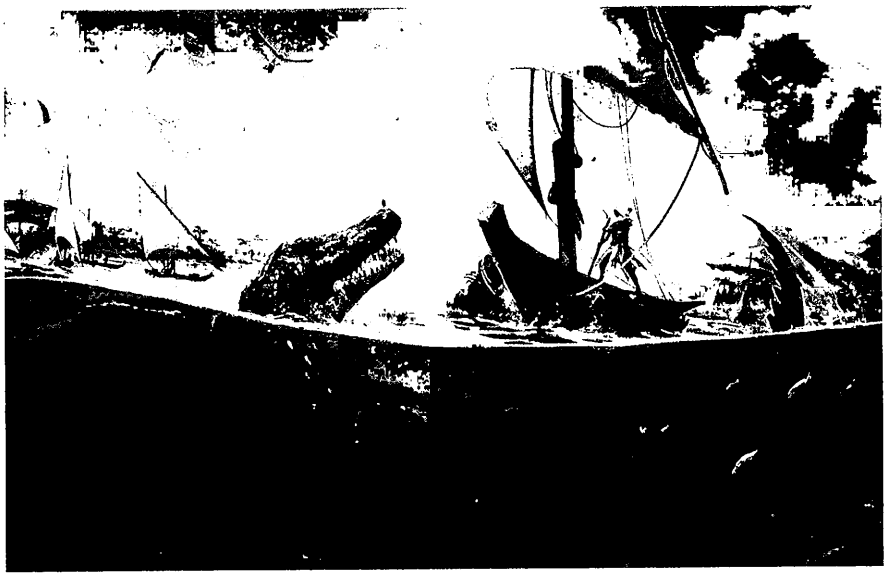

شائیں کی تیز آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں، سر چکرا رہا تھا اور پیروں کے اندر دَرد کی شدت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وزنی کیچڑ میرے پاؤں میں اچھی طرح بھر چکی تھی۔ اِس نے میرے لیے مزید اُچھلنا اور گڑھے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا خاصا مشکل کام بنا دیا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اِس اُچھل پھاند میں میرے بائیں بازو کی ہڈی بھی چٹخ گئی تھی۔

سورج طلوع ہونے تک میں گڑھے سے نکلنے کی برابر کوشش کرتا رہا، حتیٰ کہ میرا بدن تھک کر شل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ سورج کی روشنی اِس اندھیرے گڑھے میں آنے لگی اور مَیں اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہوا، تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اِس گڑھے کے ایک جانب تنگ سا راستہ ہے جو مگرمچھ ہی نے کھود کر بنایا تھا، کیونکہ وہاں بھی گوشت اور ہڈیوں کا بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مَیں اِس ڈھیر پر چڑھ گیا اور ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرنے لگا۔ آخر میرے ہاتھوں نے دریا کے پانی کی سطح کو چھو لیا اور اَگلے ہی لمحے مَیں نے اپنے آپ کو دریا کے اُس حصّے میں پایا جہاں پانی گھٹنوں گھٹنوں تک اونچا تھا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر مَیں ریت پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں ہنری نے مجھے بتایا کہ مَیں پورا ایک دن اور ایک رات وہاں لاش کی طرح پڑا رہا۔ ہنری نے میری تلاش میں دریا کا دُور دُور تک چکر لگایا اور اِتفاق دیکھیے کہ جب وہ تیسرے روز منہ اندھیرے اِسی مگرمچھ کو مار کر واپس جا رہا تھا، تو اُس نے کنارے پر کوئی کالی کالی شے پڑی دیکھی۔ شوقِ تجسس میں جب وہ اِس شے کو قریب سے دیکھنے کے لیے کشتی وہاں لایا، تو

یہ دیکھ کر اُسے خوشی ہوئی کہ اُس کا گمشدہ دوست وہاں زندگی اور موت کی درمیانی کڑیاں طے کر رہا تھا۔ اگر ہنری اُس روز مجھے وہاں نہ پاتا، تو مَیں یقیناً کسی اور مگرمچھ کے منہ کا نوالہ بن چکا ہوتا۔ یہ پہلا حادثہ تھا جو مجھے گوٹی مالا کے مشہور دریا موٹا گوا میں پیش آیا۔

تین ماہ بعد جب مَیں دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا، تو اِس دوران میں وہ تمام روپیہ جو مَیں نے مگرمچھوں کی کھالیں بیچ بیچ کر جمع کیا تھا، خرچ ہو چکا تھا اور مَیں پھر اپنی کشتی اور ہارپون لیے دریا کے کنارے کھڑا تھا اور اَب میں نے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مگرمچھوں کو ہلاک کیا اور جلد ہی دریائے موٹا گوا کو اِن آدم خور جانوروں سے پاک کر دیا۔ اِس روپے سے مَیں نے دو طاقتور رائفلیں خریدیں اور ہارپون جیسا قدیم ہتھیار چھوڑ کر اِن رائفلوں سے کام لینے لگا۔

مَیں نے اپنی پیشہ ور شکاری زندگی میں سات آٹھ سو مگرمچھ مارے اَور اِس لیے میرا نام مگرمچھ کے شکار کے لیے اپنے ہم پیشہ لوگوں میں بہت مشہور ہے۔ اِنھی دنوں شمالی روڈیشیا کے ایک گاؤں سے جس کا نام شی سانگو ہے اور یہ گاؤں بیروٹ سی لینڈ کی سرحد پر واقع ہے، میرے دو پرانے دوستوں کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ''تم گوٹی مالا کے مگرمچھوں کو مار کر شاید اپنے آپ کو بہت بڑا شکاری سمجھ رہے ہو۔ ہم تو جب جانیں کہ یہاں آؤ اور ایک آدھ مگرمچھ مار کر دکھاؤ۔''

رابنسن اور ڈالٹ دونوں بھائی سیر و شکار سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ جہاں تک مگرمچھ کے شکار کا تعلق ہے، اُن دونوں سے زیادہ چابک دست اور اَپنے فن میں ماہر شکاری میری نظر سے نہیں گزرے۔ یہ ظالم بغیر کسی ہتھیار کے بڑے سے بڑے مگرمچھ کو دریا کے اندر ہی قابو کر لیتے اور گھسیٹ کر کنارے پر لے آتے۔ اِس کام کے لیے صرف ایک موٹا رسّا انھیں درکار ہوتا، اور بس..... ان کا اصل پیشہ مگرمچھوں، کچھوؤں، پرندوں اور وحشی جانوروں کو زندہ پکڑ کر سرکسوں اور چڑیا گھروں کے لیے فروخت کرنا تھا۔ یہ دونوں شکاری ملک ملک کی سیاحت کر چکے تھے اور اَب شمالی روڈیشیا کا یہ دُور افتادہ گاؤں انھیں اِس قدر پسند آیا کہ انھوں نے مستقل طور پر وہیں ڈیرے ڈال لیے اور اپنی اپنی شادیاں بھی مقامی عورتوں سے رچا لیں۔

میرے پاس جب ان کا خط آیا، تو مجھے بے حد خوشی ہوئی اور پرانے دوستوں سے ملنے کی خواہش میرے دل میں شدت سے انگڑائیاں لینے لگی۔ مَیں نے ہنری سے کہا کہ چلو روڈیشیا چلتے ہیں، تو وہ کہنے لگا کہ کیا مجھے کسی کتے نے کاٹا ہے جو مَیں اپنا گھر بار چھوڑ کر سیکڑوں میل دور دھکے کھاتا پھروں۔ تمھیں تو اِس دنیا میں رونے والا بھی کوئی نہیں، اِس لیے تم شوق سے جا سکتے ہو۔ مَیں نے اپنا مختصر سامان باندھا اور روڈیشیا جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا۔

جس روز میں شی سانگو پہنچا، اُسی روز دونوں بھائیوں نے ایک نئی کشتی مکمل کی تھی جس کی لمبائی بارہ فٹ اور چوڑائی چار فٹ کے قریب تھی اور اِسے اُنھوں نے ایک نئے انداز سے بنایا تھا کہ دُور سے یہ کشتی لکڑی کا ایک مربع صندوق نظر آتی تھی۔ مَیں نے حیران ہو کر کہا:

''یہ تم نے کیسی کشتی بنائی ہے، کیا اِس کے ذریعے مگرمچھ کا شکار کرو گے؟''

''تم چپ چاپ دیکھتے جاؤ..... جب یہ دریا میں چلے گی، پھر اس کشتی کا فائدہ تمھیں معلوم ہوگا۔''

تین دن تک آرام کرنے اور سفر کی تھکن اُتارنے کے بعد رابنسن اور ڈالٹ نے شکار پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ آج کل زندہ مگرمچھ سے زیادہ قیمتی مردہ مگرمچھ ہے۔ حال ہی میں مگرمچھ کی کھالیں خریدنے کے لیے برطانیہ سے ایک تاجر یہاں آیا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تین شلنگ فی انچ کے حساب سے چھوٹے مگرمچھ کی کھالیں خریدنے کے لیے تیار ہے اور بیس فٹ لمبے مگرمچھ کی کھال

۳۶ پونڈ میں خریدے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ خاصا معاوضہ ہے۔

''بے شک ..... معاوضہ تو معقول ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ یہاں بیس بیس فٹ لمبے مگر مچھ بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں؟''

''بے شمار''..... والٹ نے کہا۔ ''لیکن اُن کو مارنا اپنی جان ہتھیلی پر رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ کم بخت بہت زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں اور کنارے پر تو شاذ و نادر ہی آرام کرتے ہیں۔ اِن کو دریا کی گہرائی کے اندر تلاش کر کے مارا جا سکتا ہے۔ بہر حال جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہمیں کام شروع کر دینا چاہیے۔ آدھی رات کے بعد ہم دریا پر چلیں گے کیونکہ یہ وہ وقت ہے جب اکثر مگر مچھ خطرے سے بے پروا ہو کر کناروں پر نیند کے مزے لُوٹا کرتے ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ میری آمد کی خوشی میں شکار کے لیے رائفلیں استعمال کی جائیں گی۔

اِن بھائیوں کے چھوٹے سے خوبصورت مکان سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر دریائے شانگو بہتا تھا اور مَیں دیکھ چکا تھا کہ یہ دریا مگر مچھوں کی بہت بڑی پرورش گاہ ہے۔ اِس دریا کا پاٹ کافی وسیع تھا اور اِس کے اندر چھوٹے بڑے مگر مچھ مچھلیوں کی مانند تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ دوپہر کے وقت جب مَیں اور رابنسن دریا کی طرف گئے، تو ایک درجن کے قریب مگر مچھ ریتیلے کنارے پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ہماری آہٹ پاتے ہی وہ بڑی پھرتی سے غڑاپ غڑاپ پانی میں کود گئے اور دریا کے درمیانی حصّے میں تیرنے لگے۔ رابنسن نے کندھے سے رائفل اُتاری اور اِن پر فائرنگ شروع کر دی۔ کئی گولیاں مگر مچھوں کو لگیں، لیکن بے سود ..... آخر ایک گولی مگر مچھ کے مختصر سے بھیجے کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی۔ چند منٹ تک وہ دریا میں مچلتا رہا۔ آخر اِس کی لاش سرد ہو کر سطح پر تڑپنے لگی اور اِس سے پیشتر کہ ہم کنارے پر بندھی ہوئی کشتیوں میں سے ایک کشتی پر سوار ہو کر مردہ مگر مچھ کو گھسیٹ کر لاتے، چھے سات دوسرے مگر مچھ ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے اور لاش گھسیٹ کر پانی کی تہ میں لے گئے۔ رابنسن طیش میں آ کر اِن مگر مچھوں کو گالیاں دینے لگا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ''گزشتہ دو مہینوں میں تقریباً بیس مگر مچھ مَیں نے مارے، لیکن صرف پانچ مگر مچھوں کی لاشیں حاصل کر سکا۔ بقیہ پندرہ لاشیں دوسرے مگر مچھ ہڑپ کر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اِن موذیوں کو زندہ پکڑنے ہی میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں۔ اللہ نے اِن دریائی جانوروں کو ایسی سخت جان عطا کی ہے کہ وہ آسانی سے نہیں مرتے۔ ایک مرتبہ مَیں نے کوئی اٹھارہ فٹ لمبا مگر مچھ دھوپ میں آرام کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کی زرد کھال دھوپ میں چمک رہی تھی اور اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ مَیں نے بلا مبالغہ اُس پر دس فائر کیے ہوں گے اور میرا کوئی نشانہ خطا نہیں گیا، لیکن خدا معلوم اُس کی کھال فولاد کی بنی ہوئی تھی کہ دس گولیاں کھا کر بھی اُس نے کوئی اثر نہ لیا، بلکہ تیزی سے رینگتا رہا اور دریا میں کود گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اِس قدر زخمی ہونے کے باوجود وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ پس میں چار گھنٹے تک اس کا انتظار کرتا رہا کہ اب اس کی لاش پانی کی سطح پر ابھرے گی، لیکن دریا میں دُور دور تک تلاش کرنے کے باوجود مجھے اُس کا سراغ نہ ملا۔ ایک ہفتے بعد جب کہ وہ مگر مچھ میرے ذہن سے اتر چکا تھا اور مَیں ایک قوی الجثہ کچھوے کو شکار کر کے کنارے پر گھسیٹ کر لا رہا تھا کہ میں نے دور پانی میں اس کا جبڑا سطح پر نمودار ہوتے اور پھر فوراً ہی پانی میں غائب ہوتے دیکھ لیا۔ وہ یقیناً میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اتفاق کی بات کہ میرے پاس ایک ہارپون کے سوا اَور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اگرچہ یہ ہارپون ہلکا تھا، لیکن بدقسمتی سے اس کی رسّی زیادہ دراز نہ تھی، ورنہ میں اسے مگر مچھ پر ضرور پھینک دیتا۔ مَیں نے سوچا کہ مگر مچھ کو فریب دینا چاہیے۔ مَیں جلدی جلدی کنارے پر پہنچا اور کچھوے کی لاش بے پروائی سے ذرا دُور چھوڑ کر اُس سے تیس گز کے فاصلے پر ریت کے ایک ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا۔ ایک گھنٹہ انتظار کے بعد مگر مچھ

پانی کی سطح پر اُبھرا اور آہستہ آہستہ کنارے پر آیا اور اپنی لمبی تھوتھنی پانی سے باہر نکال کر ریت پر رکھ دی اور زرد زرد آنکھوں سے کچھوے کی لاش کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ چند فٹ رینگتا ہوا اور باہر آیا اور رُک گیا۔ مَیں سانس روکے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ مگرمچھ کو ریت پر گھسٹنے میں خاصی قوت صَرف کرنی پڑ رہی ہے، اِس کی وجہ شاید یہ تھی کہ گولیاں کھانے کے باعث جگہ جگہ سے اُس کا جسم زخمی ہو چکا تھا اور خون کی اچھی خاصی مقدار خارج ہو چکی تھی۔ قصہ مختصر کچھوے سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر وہ رُکا، لیکن پھر اپنے پنجوں کے بل گھوم کر اُس نے دریا کی طرف اِس انداز میں دیکھا جیسے سوچ رہا ہو کہ اتنی دُور آ کر اس نے غلطی کی ہے اور بلاشبہ اِس غلطی نے اُس کی جان گنوائی۔ غالباً وہ بہت بھوکا تھا اور کچھوے کا گوشت ہڑپ کرنے کے لالچ میں پانی سے اتنی دُور نکل آیا۔ اُس نے جلدی سے اپنے جبڑے میں کچھوے کو دبایا اور دَریا کی طرف پلٹا۔ بس اِسی لمحے مَیں نے ہارپون بلند کیا اور پوری قوت سے مگرمچھ کی طرف پھینکا۔ ہارپون سنسناتا ہوا گیا اور اس کا نکیلا سرا مگرمچھ کی بائیں پسلی کے اندر پیوست ہو گیا۔ مگرمچھ نے بل کھایا اور مردہ کچھوا اُس کے جبڑے سے نکل کر ریت پر گر گیا۔ اب اُس کے منہ سے سیٹی کے مانند تیز آوازیں بلند ہونے لگیں اور اُس کے زخم سے خون اُبلنے لگا، لیکن وہ اِس کے باوجود دَریا میں کود گیا۔ ہارپون سے بندھی ہوئی رسّی کا ایک سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ جب مگرمچھ دریا میں اترا، تو جھٹکے سے رسّی کا یہ سرا میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ مَیں نے دوڑ کر رسّی کو پکڑنا چاہا، مگر اتنی دیر میں مگرمچھ پانی کی تہ میں اُتر چکا تھا۔ مَیں نے بھی سوچے سمجھے بغیر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ مگرمچھ سے زیادہ میرے لیے وہ ہارپون قیمتی تھا جسے تیار کرنے میں کافی محنت اور وَقت صَرف کرنا پڑتا ہے۔

جب میں دریا میں کودا، تو مگرمچھ آہستہ آہستہ پانی کی تہ سے اُوپر آ رہا تھا۔ مَیں نے خیال کیا کہ وہ مر چکا ہے، کیونکہ اِس میں حرکت کے آثار قطعاً نہ تھے۔ ہارپون اَب بھی اُس کی پسلی میں گڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں بے جان مگرمچھ پانی کی سطح پر تیرنے لگا۔ میں نے بے دھڑک اِس کی دُم پکڑ لی، مگر دم پکڑتے ہی جیسے میرے بدن میں خون جمنے لگا، کیونکہ بجلی کی مانند مگرمچھ نے بل کھایا اور میرا بایاں ہاتھ اپنے جبڑے میں دبا لیا۔ اِس کا سارا جسم تھرتھرا رہا تھا اور اِس میں ابھی جان باقی تھی۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اِس کے جبڑے کے اُوپر کا حصّہ پکڑ لیا اور اسے اُوپر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن کہاں ایک قوی ہیکل مگرمچھ اور کہاں ایک معمولی قوت رکھنے والا انسان..... مگرمچھ مجھے لے کر پھر دریا کے اندر جانے لگا۔ مَیں نے اپنے آپ کو مگرمچھ کے منہ سے آزاد کرانے کی سرتوڑ کوشش کی، مگر جلد ہی دَم ٹوٹنے لگا اور مجھے اپنی موت کا پورا یقین ہو گیا۔ اِسی بے بسی کے عالم میں اتفاق سے ہارپون پر میرا ہاتھ جا پڑا۔ میں نے ہارپون اس کے جسم سے کھینچ لیا، مگرمچھ ایک بار پھر پانی کے اندر تڑپا اور جونہی اُس نے جبڑا کھولا، میں اُس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میں سانس لینے کے لیے پانی کی سطح پر آیا، تو مگرمچھ مجھے پکڑنے کے لیے لپکا، مگر اب وہ بھی سست ہو چکا تھا۔ مَیں نے فوراً ہی اُس کے جبڑے کے اندر ہارپون اُتار دِیا اور رسّی کو مضبوطی سے پکڑ کر کنارے کی جانب تیرنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد مردہ مگرمچھ کنارے پر پڑا تھا اور مَیں جان بچ جانے پر بار بار اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جب مَیں نے اٹھارہ فٹ لمبے مگرمچھ کی کھال اتاری، تو اُس پر ہارپون کی ضربوں اور متعدد گولیوں کے نشان موجود تھے، اِس لیے یہ کھال ٹکڑے ٹکڑے کر کے فروخت کی۔

رات اندھیری ہو رہی تھی اور ہوا شام ہی سے تیز چل رہی تھی۔ دریا کی جانب سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے جب آتے، تو میرے بدن پر کپکپی سی طاری ہو جاتی، لیکن رابنسن اور وَالٹ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر شکار پر جانے کی

تیاریوں میں اطمینان سے مصروف تھے۔ اُنھوں نے اپنی مدد کے لیے تین مقامی ملّاحوں کو بلوا لیا تھا۔ رائفلوں کو صاف کیا جا چکا تھا۔ ہارپون کی جانچ کی جا چکی تھی، شکاری چاقو کمر میں باندھ لیے گئے تھے اور برقی ٹارچیں احتیاط سے کوٹ کی جیبوں میں رکھ لی گئیں۔

ہماری صندوق نما کشتی آہستہ آہستہ دریا کی مضطرب لہروں پر اُچھلتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ چونکہ ہم بہاؤ کے اُلٹے رُخ جانا چاہتے تھے، اِس لیے ملّاحوں کو خاصا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ جب ہم دریا میں کافی دُور نکل آئے، تو رابنسن اور وَالٹ نے اپنی اپنی ٹارچیں روشن کیں اور پانی کی سطح کو دیکھنے لگے۔ اللہ کی پناہ! خوف سے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بلا مبالغہ سیکڑوں سرخ سرخ، چمکتی ہوئی آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ دریا کا یہ حصّہ مگرمچھوں سے پٹا پڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سب پانی کے اندر چلے گئے اور میرے دوستوں نے ملّاحوں کو حکم دیا: کشتی اور تیز کر دو تاکہ یہ مگرمچھ کناروں کی طرف چلے جائیں۔ پھر ہم آسانی سے پانچ دس مگرمچھ مار لیں گے۔ کشتی اور تیز ہوگئی، ہوا کا طوفان آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور دریا میں اُونچی اُونچی لہریں اُٹھنے لگی تھیں جو ہماری کشتی سے بار بار ٹکراتیں اور اِس کا رُخ پھیر دیتیں۔ اب میں سمجھا کہ اگر یہ کشتی اِس خاص طریقے سے نہ بنائی جاتی، تو اِس میں یقیناً پانی بھر جاتا۔ وَالٹ نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا: ''آج دریا زوروں پر ہے، لیکن ہم بھی پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ اِس طوفانی موسم میں بہت کم شکاری یہاں آنے کی جرأت کریں گے، اِس لیے ہمیں اِس سنہری موقعے سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔'' اتنے میں رابنسن نے اپنی ٹارچ روشن کی، تیز سفید روشنی کی ایک لمبی لکیر دریا کی لہروں سے گزرتی ہوئی کنارے تک پہنچ گئی اور وہ ایک دم چلّایا: ''وہ دیکھو..... کتنے مگرمچھ کنارے پر موجود ہیں۔ کشتی فوراً اُدھر

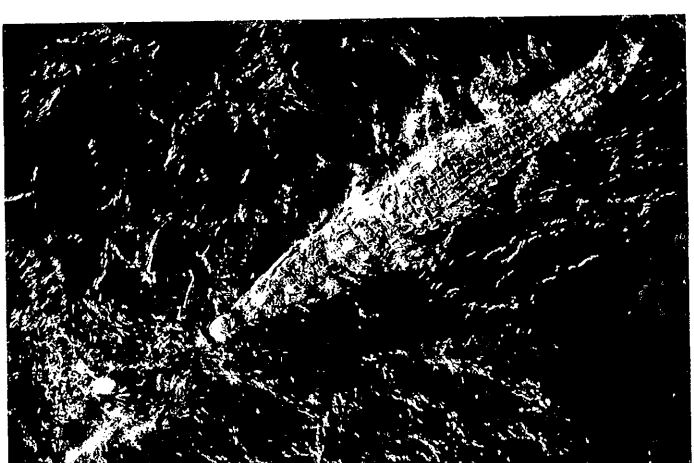

لے چلو۔'' اُس نے جوشِ اضطراب میں مگرمچھوں کو گننے کی کوشش کی۔ ''ایک..... دو..... تین..... چار..... پانچ..... چھے..... سات..... اور وہ آٹھ.....'' وہ بچوں کی طرح کشتی کے اندر تالیاں بجا کر اُچھلنے لگا۔ ''یہ سب ہمارے مہمان دوست کی برکت ہے۔''

وہ دونوں تو خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور میرا حال یہ تھا کہ بدن سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ بار بار یہ خدشہ میرے سامنے آتا کہ اگر اِس دریا میں ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی گر جائے، تو اس کی لاش تو درکنار، ہڈیوں کا بھی پتا نہ چلے۔ اللہ کی پناہ..... سارا دریا مگرمچھوں سے بھرا ہوا تھا اور میری

سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دریا میں گرنے کے بعد کوئی شخص کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟

جب کشتی کنارے سے تھوڑے فاصلے پر رہ گئی، تو ملّاحوں نے چپّو چلانے بند کر دیے تاکہ اُن کی آہٹ سے مگر مچھ خبردار نہ ہو جائیں۔ مَیں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آخر ایک جگہ کشتی رُک گئی اور ہم تینوں گھٹنے گھٹنے پانی میں اُتر گئے اور کنارے پر جا پہنچے۔ کشتی سے اُترتے وقت والٹ نے ملّاحوں کے کان میں کہا کہ وہ کشتی کو ذرا دُور ہٹا کر کنارے پر احتیاط سے باندھ دیں تاکہ وہ پانی کے تیز بہاؤ میں بھٹک نہ جائے۔ اِس کے بعد ہم تینوں گیلی گیلی ریت پر پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ چند منٹ بعد جب میری آنکھیں اندھیرے میں کام کرنے لگیں، تو یہ دیکھ کر روح فنا ہوگئی کہ مجھ سے صرف بیس فٹ کے فاصلے پر پانچ مگر مچھ آرام کر رہے ہیں جن کی کھلی تھوتھنیوں میں سے لمبے لمبے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اُن کے جسم رات کی تاریکی میں اِس طرح پوشیدہ تھے کہ نظر باندھ کر اگر نہ دیکھا جائے، تو کچھ پتا نہیں چل سکتا تھا کہ یہ مگر مچھ ہیں یا درختوں کے کٹے ہوئے تنے پڑے ہیں۔ پہلے اُن کی تعداد آٹھ تھی، لیکن ہمارے پہنچنے سے قبل ہی تین مگر مچھ پانی میں اُتر چکے تھے..... یکا یک رابنسن اور وَالٹ نے اپنی ٹارچیں روشن کر دیں اور مگر مچھوں نے فوراً خبردار ہو کر اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل زور سے دھڑکا، کیونکہ روشنی میں وہ اپنی جسامت سے کئی گنا بڑے دکھائی دینے لگے اور جونہی اُنھوں نے بیک وقت پانی کی طرف رینگنے کے لیے حرکت کی، ہماری رائفلیں شعلے اُگلنے لگیں۔ میں نے ٹارچوں کی تیز روشنی میں دیکھا کہ ایک گولی مگر مچھ کی آنکھوں کے عین درمیان میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ خون کی ایک اُبلتی ہوئی دھار اُس کی پیشانی سے برآمد ہو رہی تھی۔ باقی چار مگر مچھ گولیوں کی بوچھار میں سے صاف نکل کر پانی میں کود گئے۔

والٹ کے حلق سے فاتحانہ نعرہ بلند ہوا اور وہ تڑپتے ہوئے مگر مچھ کی طرف بھاگا۔ ہم نے بھی اِس کی تقلید کی۔ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوتی، تو زخمی مگر مچھ پانی میں کود چکا ہوتا۔ اِس موقعے پر ہارپون نے خوب کام دیا۔ رابنسن نے رائفل پھینکی، مگر مچھ کی دُم پکڑ لی اور وَالٹ نے ہارپون اُس کے کھلے ہوئے جبڑے کے اندر اُتار دیا۔ چند ثانیے بعد مگر مچھ نے دَم توڑ دیا۔ ہم نے اُس کی لاش کنارے سے گھسیٹ کر تقریباً پندرہ فٹ پر ڈال دی اور علیحدہ علیحدہ ہو کر ریت پر لیٹ گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ گھنٹے آدھے گھنٹے بعد اِس مگر مچھ کی بُو پا کر دوسرے مگر مچھ کنارے پر ضرور آئیں گے۔ اب انتظار کا ایک ایک لمحہ مجھے کانٹا دو بھر ہو گیا تھا۔ بیس منٹ بعد مَیں نے اُکتا کر اپنی ٹارچ روشن کی، کیا دیکھتا ہوں کہ کنارے پر بہت سی سرخ سرخ آنکھیں پانی کے باہر جھانک رہی ہیں۔ مَیں نے فوراً ٹارچ بجھا دی۔ اتنے میں یوں دکھائی دیا کہ ایک بڑا مگر مچھ آہستہ آہستہ پانی میں سے نکل کر کنارے پر آنے لگا۔ وہ چند فٹ رینگتا اور پھر دَم سادھ کر پڑ جاتا۔ مَیں نے گردن موڑ کر رابنسن اور وَالٹ کی جانب دیکھا، وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پڑے تھے۔ جب یہ مگر مچھ اتنا قریب آ گیا کہ اُس کے جسم سے اُٹھنے والی بدبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی، تو میں نے ٹارچ روشن کی، اِسی لمحے بجلی کی مانند مگر مچھ نے بل کھایا اور پانی کی طرف لپکا، لیکن میں بھی اناڑی نہ تھا۔ مَیں نے رائفل سے بیک وقت دو فائر کیے اور دونوں گولیاں مگر مچھ کی کھال میں پیوست ہو گئیں۔ اُدھر سے رابنسن اور وَالٹ نے تاک کر ہارپون پھینکے اور دُوسرا مگر مچھ بھی آنِ واحد میں ڈھیر ہو چکا تھا۔ اِس فوری کامیابی پر ہمیں جو مسرت ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم دو بڑے مگر مچھ مار چکے تھے۔ ملّاحوں نے اِن دونوں کو رسّوں سے جکڑا اور کشتی کے ساتھ باندھ دیا۔

اِن دونوں کی لمبائی پندرہ فٹ سے زیادہ تھی اور دونوں کھالوں کی قیمت تقریباً پچاس پونڈ۔

اِس رات پَو پھٹنے تک ہم نے تین مگرمچھ اور مارے اور جب ہم واپسی کی تیاریاں کررہے تھے، تو رات بھر جاگنے اور مگرمچھوں سے جنگ کرنے کے باعث ہمارے بدن تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ کشتی کے ساتھ پانچوں مگرمچھوں کی لاشیں بندھی ہوئی تھیں اور کشتی کو پانی میں دھکیلنے کے لیے ہم سب پوری قوت سے چپّو چلا رہے تھے۔ یکا یک ایک ملّاح نے پکار کر کہا: ''کشتی روکو ..... کشتی روکو ..... رسّا ٹوٹ گیا ہے.....''

پانچ وزنی لاشیں تین رسّوں سے بندھی ہوئی تھیں جن میں سے درمیانی رسّا ٹوٹ گیا تھا۔ ابھی ہم کشتی کو سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک بڑے بھنور میں کشتی پھنس کر چکر کھانے لگی۔ مارے دہشت کے ہم سب کے چہرے سپید پڑ گئے۔ دریا کے یہ بھنور کتنے مہلک ہوتے ہیں، ان کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں کبھی ان میں گھر کر قسمت کی یاوری سے نکل جانے کا اتفاق ہوا ہو۔ یہ بھنور دریا کے شرقی حصّے میں صبح کے وقت کثرت سے پڑتے تھے اور شکار مارنے کی خوشی میں میرے ساتھیوں کو ان کا خیال رہا اور نہ ملّاحوں کو ..... رسّا ٹوٹنے کی اصل وجہ بھی یہی بھنور تھا جس کے باعث کشتی کو ایک دم جھٹکا لگا اور رسّا ٹوٹ گیا۔ اِس رسّے سے دو مگرمچھ بندھے ہوئے تھے۔ اگر کشتی بھنور میں گھری ہوئی نہ ہوتی، تو ہم یقیناً انھیں ضائع نہ ہونے دیتے، مگر اب تو خود ہماری جانوں کے لالے پڑ رہے تھے۔ کشتی بچانے کی واحد صورت یہ تھی کہ اِسے ہر ممکن ذریعے سے گردش میں نہ آنے دیا جائے اور اس کے پیچھے جو وزن بندھا ہوا ہے، اسے ضائع کر دیا جائے۔ فوراً باقی دونوں رسّے بھی کاٹ دیے گئے اور ہم نے کشتی کے ایک جانب اپنے جسموں کا پورا وزن ڈال دیا، تاکہ پانی کا تیز بہاؤ کم سے کم اثر انداز ہو۔ ابھی ہم اِسی تگ و دو میں تھے کہ دریا میں سیکڑوں مگرمچھوں نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ کشتی کے چاروں طرف جمع ہونے لگے۔ وہ مردہ مگرمچھوں کو حاصل کرنے کے لیے آپس میں چھینا جھپٹی کرنے لگے، لیکن بھنور کے قریب آنے کی کسی نے جرأت نہ کی۔ رابنسن اور وَالٹ نے رائفلوں سے فائر کر کے اُنھیں خوف زدہ کر دیا اور وہ دُور دُور ہٹ گئے۔ اِتنے میں دریا کے اندر ایک طاقت ور لہر اُٹھی اور کشتی سے ٹکرائی، سنبھلنے کے باوجود ملّاحوں میں سے ایک شخص اچھل کر دریا میں جا پڑا۔ اُس کے ساتھی چلّانے لگے۔ گرنے والا ملّاح بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا، لیکن پانی اُسے ہم سے دُور لے گیا اور ہم نے صرف یہ دیکھا کہ مگرمچھوں نے آناً فاناً اُس کی تکّا بوٹی کر ڈالی۔ یہ ایسا ہولناک منظر تھا جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے اور مَیں دل ہی دل میں اللہ سے اپنی جان کی سلامتی کی دعا مانگنے لگا۔ اپنے ساتھی کی موت کا اثر دونوں ملّاحوں پر ایسا ہوا کہ وہ قطعی بدحواس ہو گئے اور ہمت ہار دی۔ خود رابنسن اور وَالٹ کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اب میں نے ہار پون سنبھالا اور مگرمچھوں پر اندھا دھند وار کرنے لگا۔ مگرمچھ سمٹ کر کشتی کے بائیں جانب آ گئے اور اُنھوں نے اتنی جرأت کی کہ جبڑے کھول کھول کر ہمیں پکڑنے کے لیے اُچھلنے لگے۔ رابنسن اور وَالٹ کشتی سنبھالنے کی فکر میں سب کچھ بھولے ہوئے تھے اور گرداب سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم پر ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے کشتی اِس گرداب سے نکلی اور پانی کے بہاؤ پر تیرنے لگی۔ اِس حادثے نے ہمارے ذہن ماؤف کر دیے تھے۔ جب ہم کنارے پر پہنچے، تو آسمان کے مشرقی کنارے سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔

دریائے شانگو کے مگرمچھوں نے اپنے پانچ ساتھیوں کی جان کا بدلہ آخر ہم سے لے ہی لیا۔

☆☆☆

''ہمارے گھر ہر چیز صاف ستھری اور معیاری آتی ہے۔ گوشت ہو، سبزی، پھل یا پھر دوسرا کھانے پینے کا سامان۔ ہم حفظانِ صحت کے تمام اصولوں پر بھی سختی سے عمل کرتے ہیں، اس کے باوجود نہ جانے کیوں کچھ عرصے سے گھر والوں کی صحت گر رہی ہے۔ ان میں پہلے جیسی چستی اور بشاشت نہیں رہی۔ کسی کو معدے کی تکلیف، کسی کو پیٹ درد اور آئے روز اسہال پیچش جیسی تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم روز تازہ اور سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ کسی قسم کی بد پرہیزی یا باہر کا گندا کھانا نہیں کھاتے۔ اس کے باوجود ہر دوسرے دن گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بیمار ہو جاتا ہے۔ آخر کوتاہی کہاں ہو رہی ہے؟'' میں نے ڈاکٹر صاحب سے اُلجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اُن کا جواب مجھ سمیت سبھی کے لیے انتہائی حیرت انگیز اور انکشافات سے بھرپور تھا۔ آپ بھی استفادہ کیجیے۔

☆☆☆

ڈاکٹر اختر احمد

آپ کی صحت کے دشمن آپ کے باورچی خانے ہی میں چھپے ہوئے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آج کل لوگوں میں یہ مختلف بیماریاں مثلاً ہارمون پرابلم، تھائی رائیڈ اور جگر کی مختلف بیماریاں یہاں تک کہ کینسر اتنی عام کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟ اس کی وجہ ہمارے اپنے باورچی خانے میں چھپے دشمن ہیں جنہیں ہم اپنا دوست سمجھ کر ان پر مکمل بھروسا کرتے ہیں۔ ہم یہاں ایسے پانچ دشمنوں کی بات کریں گے جو ان خطرناک بیماریوں کی وجہ بنتے ہیں۔ اگر آپ اور آپ کی فیملی صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ پانچ دشمن اپنے گھر سے باہر نکالنا ہوں گے۔

سب سے پہلے ہم بات کریں گے Non Stick Cock Ware کی۔ آج کے دور میں تقریباً ننانوے فیصد گھروں میں یہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان برتنوں کے

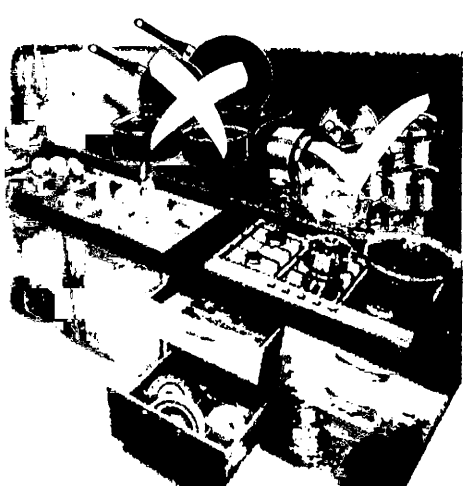

جانی دشمن

اُوپر Polyteraflourethylene (PTFE) کی تہ چڑھی ہوتی ہے جو ہمارے دماغ اور پھیپھڑوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ آپ تجربہ کر سکتے ہیں کہ نان اسٹک برتن کو چولہے پر رکھیں اور آگ تیز کر دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں دھواں (Fumes) اُٹھنے لگے گا۔ اگر اس کو ٹیسٹ کیا جائے تو ان میں مرکری (Mercury) کے

صحت پر خفیہ وار کرنے والے ہتھیار آپ کے اپنے باورچی خانے میں ہی موجود ہیں

اثرات پائے جائیں گے جو صحت کے لیے اچھے نہیں۔ اس دشمن کو کچن سے نکال کر (Cast Iron) کے برتن استعمال کریں۔ کاسٹ آئرن وہ ہوتا ہے جو اپنی حالت تبدیل نہیں کرتا۔

دوسرا دشمن ایلومینیم (Aluminum Uternsils) کے برتن ہیں۔ آپ کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی کہ انگریزوں کے ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ کے دور میں قیدیوں کو ایلومینیم کے برتنوں میں کھانا دیا جاتا تھا کیونکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلومینیم Slow Posion ہے جو آہستہ آہستہ آپ کے گردوں اور پھیپھڑوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ یہ تجربہ کر سکتے ہیں کہ بازار سے ایک ایلومینیم کا برتن لائیں اور اُس کا وزن کریں اور تین سے چار سال لگاتار اسے استعمال کریں۔ جب آپ اُس کا دوبارہ وزن کریں گے تو اس برتن کا وزن بہت کم ہو چکا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ کہ پکانے کے دوران گرم ہونے پر آپ کے کھانے میں ایلومینیم شامل ہو جاتا ہے اور یہ آپ اور آپ کے گھر کے افراد کے جسم میں چلا جاتا ہے اور پھر مختلف تکالیف اور بیماریوں کی وجہ بن جاتا ہے۔ اس دشمن کو بھی کچن سے نکالیں اور اس کی جگہ اسٹین لیس اسٹیل کے برتن استعمال کریں کیونکہ اسٹین لیس اسٹیل میں وہ خطرناک کیمیکل نہیں پائے جاتے ہیں جو ایلومینیم میں پائے جاتے ہیں۔

ہماری صحت کا تیسرا دشمن ایلومینیم فوائل Aluminum Foil ہے۔ آج کل اس کا گھروں اور ہوٹلوں میں بے تحاشا استعمال ہوتا ہے۔ گرم گرم کھانا اس میں پیک کیا جاتا ہے۔ WHO کے مطابق Max Limit for Human body 50mg ہے۔ اگر ہم کھانے کو اس میں پیک کرتے ہیں تو ایک سے دو mg ایلومینیم شامل ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے اچھے سے اچھا کھانا بھی آپ کے جسم کو فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اس لیے اس دشمن صحت کو بھی باورچی خانے سے نکالیں اور اس کی جگہ سوتی کپڑا یا بٹر پیپر (Butter Paper) استعمال کریں۔

اگر ہم چوتھے دشمن کی بات کریں تو وہ پلاسٹک کی مصنوعہ (Plastic box and Plastic Bottles) ہیں۔ پلاسٹک کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ آسانی سے پگھل کر مختلف اشکال اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی بڑی خرابی یہی ہے کہ اگر اس میں گرم کھانا ڈالا جائے تو وہ اس پلاسٹک اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ آج دنیا میں زیادہ تر اشیاء اور برتن پلاسٹک کے استعمال ہوتے ہیں۔ خطرناک بات یہ کہ چھوٹے بچوں کے فیڈر بھی پلاسٹک کے بنے ہوتے ہیں اور ان کو اسکول کے لیے لنچ بھی پلاسٹک کے ڈبے میں دیا جاتا ہے۔

دنیا میں 1980ء کی دہائی میں جب کینسر بڑھنے لگا تو سائنسدانوں کی تحقیق کے بعد پتا چلا کہ پلاسٹک کے برتن اور

مائیکرو ویو کا استعمال اس کی بڑی وجہ ہے۔ جب گرم کھانا کسی پلاسٹک کے برتن میں ڈالا جاتا ہے تو پلاسٹک کا ایک کیمیکل Bishenol-A(BPA) کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ذیابیطس، موٹاپا اور کینسر ہونے کا خطرہ ہو جاتا ہے۔ تحقیق کے مطابق اگر پلاسٹک کے برتنوں کا استعمال ایسے ہی رہا تو آنے والے وقت میں ہر تیسرے شخص کو کینسر جیسا مہلک اور جان لیوا مرض ہونے کا خطرہ ہے۔ آج پاکستان میں ہر سال لاکھوں لوگ ذیابیطس اور کینسر کا شکار ہو رہے ہیں۔

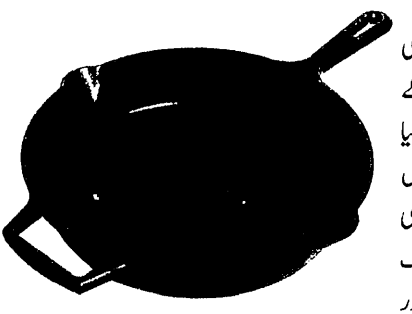

امریکن ڈاکٹرز ایسوسی ایشن نے کینسر کی وجوہ کے بارے میں لوگوں کو خبردار کیا کہ پلاسٹک کے کپ میں چائے نہ پئیں۔ کوئی بھی کھانے کی گرم چیز پلاسٹک بیگ میں نہ ڈالیں (جیسے تندور سے عموماً ہم گرما گرم سالن موی لفافوں میں پیک کروا لیتے ہیں) کیونکہ جو کوئی گرم چیز پلاسٹک کے برتن یا پلاسٹک بیگ میں ڈالی جاتی ہے تو اس میں موجود کیمیکل کھانے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے باون قسم کے کینسر ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اس لیے پلاسٹک سے خود بھی بچیں اور اپنے پیاروں کو بھی بچائیں۔

پلاسٹک ایک کیمیکل BPA سے بنتا ہے عام لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ جن پلاسٹک کے برتنوں پر (BPA Free) لکھا ہوتا ہے وہ BPA کی جگہ (BPS) Bishenoals-S استعمال کرتے ہیں۔ یہ کیمیکل بھی ہمارے لیے خطرناک ہے۔ یہ ہماری قوت مدافعت کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہارمونز میں خرابی اور موٹاپے کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس دشمن کو بھی اپنے گھر سے نکالیں اور پلاسٹک کی جگہ اسٹین لیس سٹیل، شیشے کے برتن اور ڈبے (Boxes) چیزیں رکھنے کے لیے استعمال کریں۔

ہماری صحت کا پانچواں دشمن ریفائنڈ آئل (Refined Oil) ہے جو کھانے پکانے میں ہر گھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ اسے ریفائنڈ آئل کا نام آخر کیوں دیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اسے بنایا جاتا ہے تو اسے ایسڈ سے صاف کیا جاتا ہے۔ محققین کے مطابق اگر آپ اس کا استعمال لمبے عرصے تک کرتے رہیں تو دل کی تکالیف اور کینسر کا خطرہ ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ زیتون اور سرسوں کا تیل استعمال کریں کیونکہ یہ کولیسٹرول کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس میں Antioxidents اور اس میں Low Saturated Fat ہوتے ہیں۔

اگر کسی کو سرسوں کے تیل کی خوشبو اور رنگ پسند نہیں تو وہ ہانڈی میں دو کلو سرسوں کا تیل ڈال کر اُس میں دو عدد پیاز اور سات عدد لہسن کی تریاں، پانچ عدد سبز مرچ، ایک عدد ادرک کا ٹکڑا چھوٹا چھوٹا کاٹ کر اور ایک چمچہ زیرہ ڈالے اور اسے اچھی طرح پکائے۔ جب یہ چیزیں ہلکی بھوری ہو جائیں تو اُسے چھان کر شیشے کی بوتل میں ڈال لیں۔

اگر آپ اپنے خاندان کی صحت کے ان پانچ دشمنوں کو اپنے باورچی خانے سے نکال دیتے ہیں تو آپ کی اور آپ کی فیملی کی صحت میں حیران کن تبدیلی آجائے گی اور سب ہی بہت سی تکالیف اور بیماریوں سے بچ جائیں گے کیونکہ صحت ہزار نعمت ہے اور صحت کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ ◆◆◆

☆شمع محفل☆

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
نہ کر دیں مجھ کو مجبور نوا فردوس میں حوریں
مرا سوز دروں پھر گرمی محفل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غم منزل نہ بن جائے
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خودنگہداری مرا ساحل نہ بن جائے
کہیں اس عالم بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

(کلام: علامہ محمد اقبالؒ)

☆☆☆

☆عصر حاضر کے شعراء کا کلام☆

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں جہاں تک دیکھوں
حسن یزداں سے تجھے حسن بتاں تک دیکھوں
تو نے یوں دیکھا ہے جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں
صرف اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن ترے حسن بیاں تک دیکھوں
میرے ویرانۂ جاں میں تری یادوں کے طفیل
پھول کھلتے نظر آتے ہیں جہاں تک دیکھوں
وقت نے ذہن میں دھندلا دیے تیرے خدوخال
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں
دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں
اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسن انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

(احمد ندیم قاسمی)

☆☆☆

کانچ کے پیچھے چاند بھی تھا اور کانچ کے اوپر کائی بھی
تینوں تھے ہم وہ بھی تھے اور میں بھی تھا تنہائی بھی

یادوں کی بوچھاروں سے جب پلکیں بھیگنے لگتی ہیں
سوندھی سوندھی لگتی ہے تب ماضی کی رسوائی بھی
دو دو شکلیں دکھتی ہیں اس بہکے سے آئینے میں
میرے ساتھ چلا آیا ہے آپ کا اک سودائی بھی
کتنی جلدی میلی کرتا ہے پوشاکیں روز فلک
صبح ہی رات اُتاری تھی اور شام کو شب پہنائی بھی
خاموشی کا حاصل بھی اک لمبی سی خاموشی تھی
ان کی بات سنی بھی ہم نے اپنی بات سنائی بھی
کل ساحل پر لیٹے لیٹے کتنی ساری باتیں کیں
آپ کا ہنکارا نہ آیا چاند نے بات کرائی بھی
(کلام: گلزار)

☆☆☆

دل میں بکھرے ہوئے جالوں سے پریشان نہ ہو
میرے گزرے ہوئے سالوں سے پریشان نہ ہو
میری آواز کی تلخی کو گوارا کر لے
میرے گستاخ سوالوں سے پریشان نہ ہو
میں نے مانا تری آنکھیں نہیں کھلتی ہیں مگر
دن نکلنے دے اجالوں سے پریشان نہ ہو
اپنی زلفوں میں اترتی ہوئی چاندی کو چھپا
میرے بکھرے ہوئے بالوں سے پریشان نہ ہو
اے نئے دوست میں بھرپور ہوا ہوں تیرا
میرے ماضی کے حوالوں سے پریشان نہ ہو
دیکھ یوں دُور نہ ہو مجھ کو لگا لے دل سے
تو مری روح کے چھالوں سے پریشان نہ ہو
خود کو ویران نہ کر میرے لیے جان مری
ان پریشان خیالوں سے پریشان نہ ہو
(کلام: وصی شاہ)

☆☆☆

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے! چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں
بانس کی کھری کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی آدھی جاگی تھکی دوپہری جیسی ماں
چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن علی علی
مرغے کی آواز سے بجتی گھر کی کنڈی جیسی ماں
بیوی بیٹی بہن پڑوسن تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں
بانٹ کے اپنا چہرہ ماتھا آنکھیں جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں
(کلام: ندا فاضلی)

☆☆☆

ایسا ہے کہ سب خواب مسلسل نہیں ہوتے
جو آج تو ہوتے ہیں مگر کل نہیں ہوتے
اندر کی فضاؤں کے کرشمے بھی عجب ہیں
مینہ ٹوٹ کے برسے بھی تو بادل نہیں ہوتے
کچھ مشکلیں ایسی ہیں کہ آساں نہیں ہوتیں
کچھ ایسے معمے ہیں کبھی حل نہیں ہوتے
شائستگیٔ غم کے سبب آنکھوں کے صحرا
نمناک تو ہو جاتے ہیں جل تھل نہیں ہوتے
کیسے ہی تلاطم ہوں مگر قلزم جاں میں
کچھ یاد جزیرے ہیں کہ اوجھل نہیں ہوتے
عشاق کے مانند کئی اہل ہوس بھی
پاگل تو نظر آتے ہیں پاگل نہیں ہوتے
سب خواہشیں پوری ہوں فراز ایسا نہیں ہے
جیسے کئی اشعار مکمل نہیں ہوتے
(کلام: احمد فراز)

☆☆☆

☆ آپ کا کلام ☆

فعولن فعولن فعولن فعولن

مرا دل جلا تو جلا بھی ادھورا
مرا دل کھلا تو کھلا بھی ادھورا

طلب بھی ادھوری غنا بھی ادھورا
وفا بھی ادھوری گلہ بھی ادھورا
کبھی چل پڑا تو کبھی رُک گیا
چلا بھی ادھورا، رُکا بھی ادھورا
بہار و خزاں کے فسانے ادھورے
کہا بھی ادھورا سنا بھی ادھورا
جنوں بھی ادھورا خرد بھی ادھوری
عبادت ادھوری صلہ بھی ادھورا
یقین و گماں کے رہا درمیاں میں
سنا بھی ادھورا کہا بھی ادھورا
ادھورا ہے ساجد ملن کا چلن بھی
رضا بھی ادھوری خفا بھی ادھورا

(کلام: شریف ساجد ورک)

☆☆☆

صد چاک غریبوں کے گریبانوں کو دیکھو
افلاس میں الجھے ہوئے انسانوں کو دیکھو
ہر ایک سہولت سے ہیں محروم یہاں لوگ
حکام کے مہکے ہوئے ایوانوں کو دیکھو
دیتے ہیں شہنشاہی کو جمہور کا یہ نام
موروثی سیاست کے حکمرانوں کو دیکھو
دعوت میں سجے کھانے ہوں ستر سے زیادہ
خانوں کے بنے خان ہیں، مہمانوں کو دیکھو
دن رات کی محنت سے اُگاتے ہیں جو فصلیں
زرداروں سے لٹتے ہوئے دہقانوں کو دیکھو
دھتکارے ہوئے لوگ ہیں غربت کی بدولت
ان مرتے ہوئے لوگوں کے ارمانوں کو دیکھو
بے دردی سے اس وطن کو لوٹا ہے جنہوں نے
ان مخفی لٹیروں کے بہانوں کو دیکھو
یہ روپ میں راہزن کے بنے پھرتے ہیں خدام
لوگوں کے مسائل سے بے گانوں کو دیکھو
جنگل ہی بنا ڈالا درندوں نے وطن کو
قانون کے، انصاف کے ایوانوں کو دیکھو
رہ رہ کے یہ مٹتے ہیں سیاست کی شمع پر
حیرت ہے کہ جلتے ہوئے پروانوں کو دیکھو

(کلام: عبدالستار میاں اٹلانٹک سٹی۔ یو ایس اے)

☆☆☆

کسی کے کہنے سے رسوائی نہیں دیتا
ہر سلیماں کو بادشاہی نہیں دیتا
ہے تو بے جان مگر اتنی طاقت رکھتا ہے
کہ قلم جھوٹی گواہی نہیں دیتا
کتنا بے حس ہے وہ ظالم صنم
خاک چھاننے کی کمائی نہیں دیتا
خلوت کا گلہ اس سے نہ کر
دل کبھی بھی تنہائی نہیں دیتا
گلستانِ ابراہیم کا حال دیکھا تھا اس
عشق ہر ایک کو جگ ہنسائی نہیں دیتا

(کلام: انیسہ زیب)

☆☆☆

تو اپنے لہجے میں تھوڑی تیزاب رکھا کر
وضو سے بھی خود کو ہر دم پاک رکھا کر
تجھے نصیحتوں سے سیکھنا ہو گا یہ فن
بزرگوں میں تو کبھی اشتراک رکھا کر
اگر ہو ہارنے کی بات تو ہو کر پختہ
تو فیصلوں میں خودی کو دراک رکھا کر
نہ جانے کب کوئی مل جائے جان کا دشمن
تو اپنے ہاتھ میں تھوڑی سی خاک رکھا کر
ہے کرنا کوئی بھی منزل کو پار تو عامر
تو مشکلوں میں بھی خود کو بے باک رکھا کر

(کلام: عامر علی)

☆☆☆

(نمکین غزل)

پہلی سی مرے یار کوئی بات نہیں ہے
نوٹوں کی مری میز پہ برسات نہیں ہے
مصروف تھا تو وقتِ ملاقات نہیں تھا
فارغ ہوں تو اب کوئی ملاقات نہیں ہے
افسر تھا تو ہر روز مَیں دعوت تھا اُڑاتا
بے کار ہوں تو کوئی مدارات نہیں ہے
بے پردہ وہ جب آئے کھڑا فتنہ کیا ہے
اور شہر میں کچھ وجہِ فسادات نہیں ہے
تھی گرد پڑی آنکھ میں، جھپکی تو پڑی مار
اب آنکھ وہی ہائے مرے سات نہیں ہے
مانگو تو سہی موت، بآسانی ملے گی
مشکل کوئی بھی صورتِ حالات نہیں ہے
یاسین سبب ترکِ تعلق کا جو پوچھا
دھیرے سے ہنسے، بولے، کوئی بات نہیں ہے

(کلام: ایم یاسین آرزو)

☆☆☆

(ماں کی یاد میں)

اماوسوں کی رات میں
چاندنی کا رُوٹھنا
کوئی نئی بات ہے کیا؟
نہ ہے یہ معاملہ عجب
نئے سِرے سے پھر یوں ہی
کوئی نوید ماہِ نو
ہلال بن کے کِھل اُٹھے
آنگنِ حیات میں
چاندنی کے قافلے
نئی طرح سے چل پڑے
سدا سے ہے یہ سلسلہ
تھما رہا یا چل دیا
مگر یہ اب کے کیا ہوا؟
کیا سانحہ گزر گیا؟
چاندنی دعا تھی جو
چاندنی رِدا تھی جو
زندگی کے رُوپ میں
خدا کی اک عطا تھی جو
اماوسوں کی رات میں
زمیں میں جا کے چھپ گئی
نہ دِکھ سکے گی پھر کبھی
شبِ ہجر طویل ہے
کٹھن بہت ہے مرحلہ
یقیں مگر خدا پہ ہے
خدا کی ہی رضا پہ ہے
شبِ ہجر کا صبر بھی
میری دعا کا اثر بھی
بنے گا ایک روشنی
چھٹے گی غم کی تیرگی
وصالِ رب کے نُور سے
رضائے حق کے رُوپ میں
کِھلے گی پھر سے چاندنی
ہاں چاندنی، وہ چاندنی!

(کلام: اسماء صدیقہ)

☆☆☆

قارئین متوجہ ہوں

آپ بھی اس محفل کا حصہ بن کر اپنی منتخب شاعری، آراء پر مبنی خطوط اور مہذب ادبی لطائف ہمیں ہر مہینے کی ۱۰ تاریخ تک بھجوا سکتے ہیں۔ (شکریہ)

''مباحثِ خطباتِ اقبال'' تشریحات کے ساتھ، کے مصنف ''پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف خان ہیں۔ تیس سے زائد کتب کے مصنف اور اب بھی مختلف علمی جرائد میں مقالات تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کو 'شاعرِ مشرق'' کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادب کے لیے ان کی اور بھی بہت سی خدمات ہیں۔ جنہیں دو صفحات پر لکھنا ناممکن سا کام ہے۔ اقبالؒ کی یہ کتاب ان کے مشہور خطبات پر مشتمل ہے جن کو تشریحات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس تفصیل کو مصنف نے بہت خوبصورتی سے قاری کے سامنے رکھا۔ اقبال جیسی نامور شخصیت پر کام کرنا اور ان پر لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ مصنف نے اس احتیاط سے کام لیتے ہوئے ان کے خطبات ہمارے سامنے رکھے ہیں۔

اقبالؒ کے سات خطبات درج ذیل مختلف عنوانات کے ساتھ ہیں:

خطبۂ اوّل: علم اور مذہبی مشاہدات

اس خطبہ میں اقبالؒ علم کا جائزہ لیتے ہیں۔ مصنف اس کی تشریح کچھ یوں کرتے ہیں:

''خطبۂ اوّل کی بحث کا زیادہ زور عقل کی حد اور اہمیت پر ہے اور ساتھ یہ کہ صوفیانہ مشاہدات یا وجدانی علم بھی ایک مضبوط ذریعۂ علم ہے۔ اس بات کی وضاحت یہاں مفید رہے گی کہ وجدان کی دو طرح کی تعریفیں سامنے آتی ہیں۔ مغرب کے ہاں اس وجدان کو کسی حد تک تسلیم کیا جاتا ہے جو حواس و عقل سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ واضح صورت میں اسے ذریعۂ علم نہیں مانتے، بلکہ عقلی دائرے میں رکھتے ہیں تاکہ ماورائی دائرے سے بچا جاسکے۔''

خطبۂ دوم مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار:

مصنف اقبالؒ کے اس موضوع کی تشریح کچھ یوں کرتے ہیں:

مذہبی واردات کی عقلی یا فلسفیانہ معیار پر میزان و پرکھ اس مقالے کا موضوع ہے۔ جبکہ طبیعات کا موضوع مادہ، حیاتیات کا موضوع زندگی اور نفسیات کا موضوع شعور زیرِ بحث آیا ہے۔ علامہؒ کا اعلیٰ سطح پس منظر جو اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ یہ ''مادہ'' ہے جس نے مذہبی واردات کے علم پر کاری ضرب لگائی ہے جبکہ مادہ خدا کا متبادل ہے۔ مذہبی واردات کی علم میں کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ مادہ کو آغاز میں خدا کا متبادل بنا کر مذہبی علوم کی جڑیں کاٹ دی گئیں۔ یہ مغرب میں ہوا اور مشرق میں خصوصاً مسلم ممالک میں مادہ کی بنیاد پر ترقی یافتہ ہر شکل کو مسترد کر دیا گیا۔''

خطبۂ سوم: ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دُعا

اس خطبہ میں مصنف نے ایک مکمل بحث کے بعد اس کو چھے عنوانات میں تقسیم کیا ہے، جو کچھ یوں ہیں: خدا ہر پہلو سے ایک ہے، منفرد ہے، یکتا ہے، ۲: وہ کائنات اور انسان کا خالق ہے، پیدا کرنے والا ہے۔ ۳: علم کی ہر صورت خدا

ہے۔ قدیم ہو جدید ہو، مستقل ہو اور جاریہ تسلسل ہو۔ ۴: قدرت و طاقت و آزادی کی اوّل و آخر ذات مطلق کا دائرہ ہے۔ ۵: تخلیق کی ابتدائی نوع سے نوعِ انسانی اور اس کا جاریہ سلسلہ خدا کی کن کا سلسلہ ہے۔ ۶: عبادت اور دُعا نوع انسانی کے خدا سے اتصال کا ذریعہ ہے۔

خطبہ چہارم: انسانی خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت:

اقبالؒ کے اس موضوع کو بھی مصنف نے چار مختلف عنوانات دیے ہیں۔ ان عنوانات سے قاری کو بات سمجھنے میں آسانی محسوس ہوگی اور وہ بغیر کسی کشمکش کے اقبالؒ کے پیغام کو سمجھ سکے گا۔ عنوانات کچھ یوں ہیں: انسان وحدت، انفرادیت اور یکتائیت کا حامل ہے۔ ۲: ''خودی'' انسان کا ولولہ انگیز، طاقتور اور بصیرت افروز آلہ و حرکت ہے۔ ۳: انسان کی وحدت، انفرادیت اور یکتائیت اس کے با اختیار ہونے کی دلیل ہے۔ ۴: یہی پہلو انسان کی بقا بعد از موت پر بھی دال ہیں۔

خطبہ پنجم: اسلامی ثقافت کی روح

ثقافت ہمارے ہاں ایک اہم موضوع ہے اور اس مسئلے کو روز ہی زیر بحث بھی لایا جاتا ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہم کتابیں کم کھولتے اور بحث زیادہ کرتے ہیں۔ اگر آپ ثقافت کی اصل روح سے آشنا ہونا چاہتے ہیں تو یہ کتاب آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔ مصنف اس موضوع پر کہتے ہیں کہ:

''اسلامی ثقافت کی رُوح کے بیان میں اقبالؒ کے خیالات کا یہ مختصر سا خاکہ اگرچہ سراسر خطبۂ پنجم پر مبنی ہے لیکن اس میں کہنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اقبالؒ کے خیالات کو کما حقہ سمجھیں۔ خواہ ہمیں ان سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ اسلامی ثقافت کی حقیقی روح جب ہی ہمارے سامنے ہوگی جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ اس نکتۂ نظر سے کریں کہ بحیثیت ایک ثقافتی تحریک کے جیسا کہ اقبال نے لکھا ہے اسلام کی تعلیمات کیا ہیں یہ ہوگا تو ہم اس بحث میں خود آگے بڑھ سکیں گے۔''

خطبۂ ششم: اسلام کی ساخت میں حرکت کا اصول:

مصنف نے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ موضوع ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔ مصنف بھی اس موضوع کو خاصا تفصیل سے بنیادی نکتوں سے سمجھاتے نظر آتے ہیں مثلاً: حرکت، ترقی کا بنیادی اصول ہے۔ کائنات مسلسل حرکت پزیر ہے، ساکن نہیں ہے۔ نوعِ انسان کی وحدت اور مقصدِ تخلیق ایک ہے۔ ختمِ نبوتؐ، توحید، حرکت کے پہلو اور ایسے ہی دوسرے عنوانات کے ذریعے وہ اقبال کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے قاری کے سامنے رکھ رہے ہیں۔

خطبۂ ہفتم: کیا مذہب کا امکان ہے؟:

''مقالے کا خلاصہ میں مصنف لکھتے ہیں کہ کیا مابعد الطبیعات ممکن ہے؟ کانٹ کے اس مؤقف کا جواب ہے علامہؒ نے براہِ راست مذہب کے نکتۂ نظر سے دلائل دے کر کانٹ کے اس مؤقف کو مسترد کیا ہے اور اپنے دلائل کو مذہب کے زیرِ اثر رکھا۔ علامہؒ کے نزدیک مذہب کے تین مراحل ہیں: ایمان، سوچ و فکر، معرفت و ریاضت۔''

اقبالؒ کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے آپ یہ کتاب پڑھیں۔ یقیناً مایوسی نہیں ہوگی۔

پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز جہلم نے نہایت عمدہ کاغذ پر یہ کتاب شائع کی ہے۔ قیمت محض ۱۲۰۰ روپے اور صفحات کی تعداد ۵۸۰ ہے۔ سرورق اقبالؒ کی خوبصورت تصویر سے مزین ہے۔ آپ کو اگر اقبالیات سے خاص دلچسپی ہے تو یہ کتاب آپ کو بے حد پسند آئے گی۔ یہ کتاب براہِ راست اس نمبر 0544614977 پر رابطہ کر کے منگوائی جاسکتی ہے۔ ◆◆◆

دریائے راوی کے کنارے آباد شہر لاہور ایک قدیم شہر ہے۔ یہ دہلی، کلکتہ اور لکھنو کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں تہذیب، ثقافت، تمدن، ادب، فنونِ لطیفہ اور صحافت کا بڑا مرکز رہا ہے۔ اس شہر میں کئی نامور ہستیوں نے جنم لیا یا پھر انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر برس داتا کی نگری میں بسر کیے۔ ایسی مشہور ہستیوں میں علامہ اقبال، علامہ مشرقی، عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا ظفر علی خان، گاما پہلوان، عبدالحفیظ کاردار، شاکر علی، فضل محمود، فیض احمد فیض، اشفاق احمد اور عمران خان شامل ہیں۔ دنیائے ادب کے تین غیر مسلم ستاروں..... راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور کنھیا لال کپور نے بھی کئی برس لاہور میں بیتائے۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ بھارت چلے گئے، مگر بقیہ عمر شہر لاہور میں بیتا عرصہ نہیں بھول سکے۔

یہ تینوں مایہ ناز اُدبا اپنے خطوط، مضامین اور تخلیقات میں گاہے گاہے بڑے جذباتی اور دِلکش انداز میں داتا کی نگری کا ذکر کرتے رہے۔ ان کی تحریروں میں حزن و ملال، خوشیاں، غم، شرارتیں اور شوخیاں سبھی ہم رنگ جذبے مچلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان ادیبوں نے من کی گہرائی میں ڈوب کر لاہور کی جو دلفریب یادیں صفحۂ قرطاس پر بکھیری تھیں، کہنہ مشق قلم کار، محمود الحسن نے زیرِ تبصرہ کتاب میں انھیں جمع کر دیا ہے۔

محمود الحسن علم و ادب سے شغف رکھتے ہیں۔ سیاست کی پُرخار وادی کے بھی مسافر ہیں۔ روزناموں کے سنڈے میگزینوں میں علمی و اَدبی شخصیات سے پُرمغز انٹرویوز کر کے نمایاں ہوئے۔ آج کل روزنامہ ۹۲ کے میگزین سیکشن سے وابستہ ہیں۔ علمی و اَدبی مُوضوعات پر دلچسپ اور معلومات افروز مضامین لکھتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور کنھیا لال کپور جیسے تین قدآور اَدبی شخصیات کے دل آویز تاثرات کا اچھوتا مرقع ہے۔ اِس کتاب کی اہمیت اجاگر کرتے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب ''شاخسار'' میں بتایا ہے:

''شالیمار اسٹوڈیو میں کرشن چندر سے بھی ملاقات ہوئی اور معاً مجھے اکتوبر ۱۹۳۹ء کی ایک اُداس شام یاد آ گئی جب فضا میں دھندلکا چھا رہا تھا اور مَیں بلاکشانِ محبت کی طرح، حسبِ معمول، مال روڈ کو شرقاً غرباً ناپنے کے لیے گھر سے نکلا، تو سڑک پر کرشن چندر مل گئے۔ اُن کے چہرے پر بشاشت کم اور تکدّر زیادہ تھا۔ مَیں نے خیال کیا کہ شاید موسمی بخار کی شکایت ہے۔ مزاج پرسی کے بعد جب تکدّر کی وجہ دریافت کی گئی، تو ایک آہ بھر کر کہنے لگے: 'مَیں ریڈیو میں ملازم ہو گیا ہوں۔'

''مَیں نے ایک خوش عقیدہ مسلمان کی طرح بے اختیار اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا اور اِن کی زندہ لاش کو کندھا دیتے ہوئے گھر تک پہنچا آیا۔ تمام راستہ وہ خاموش رہے۔

میرے لبوں پر بھی قفل لگ چکا تھا۔ جذبات کے اِس طوفان سے تو مَیں واقف نہیں جو کرشن چندر کے سینے میں موج زَن تھا، ہاں میرے دل میں اُس وقت رہ رہ کر یہ خیال سر اُٹھا رہا تھا کہ افسوس آزاد اَدبی زِندگی اچھے سے اچھے ادیبوں کو بھی عزت کی روٹی نہیں دے سکتی اور اِن غریبوں کو جان و جسم کا رشتہ بحال رکھنے کے لیے ادب کا میدان چھوڑ کر حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ وہ دِن اور یہ دن، میرے اور کرشن چندر کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی جس کا پاٹ روز بروز وَسیع ہوتا گیا۔ وہ ریڈیو میں نوکر ہو کر بھی بہت دنوں لاہور میں رہے اور ہم کم و بیش روزانہ ایک دوسرے سے ملتے۔ مولانا صلاح الدّین اَحمد، کرشن چندر اَور رَاقم الحروف تقریباً ہر روز شام کے سات بجے دفتر 'ادبی دنیا' سے نکلتے اور ڈاک خانے کے سامنے سے گھومتے اور اَنارکلی کا چکر کاٹتے ہوئے لوہاری دروازے کے چوک تک بالالتزام جایا کرتے۔ اِس دوران میں قہقہے بھی لگتے، بذلہ سنجی ولطیفہ گوئی بھی ہوتی، لیکن مَیں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ جو کرشن چندر ہمارے ساتھ پہلو بہ پہلو چل رہا ہے، وہ اِس کرشن چندر سے یکسر مختلف ہے جو اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ایک اُداس شام سے پہلے ہمارا یارِ عزیز و محبِ جاں نواز تھا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ میرا اَندازہ غلط ہے یا صحیح، لیکن مَیں اب بھی اِس خیال پر قائم ہوں کہ اُس مہلک شام نے کرشن چندر کی زندگی کو دو حصّوں میں کاٹ کر رکھ دیا۔ پہلا کرشن چندر ..... یاروں کا یار، دوستوں کا دوست، بے فکرا، کھلنڈرا کرشن چندر کہاں ہے؟ مَیں اب تک اُس کی تلاش میں ہوں۔''

راجندر سنگھ بیدی لاہور سے چلے گئے، مگر یہاں کی یادیں ساری زندگی اُن کے ساتھ رہیں۔ پاکستان سے جو بھی ہندوستان جاتا، اِس سے لاہور اَور یارانِ شہر کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتے۔ اِن کے ایک یار جانی ڈاکٹر نذیر احمد تھے جو گورنمنٹ کالج، لاہور کے مقبول ترین پرنسپل تھے۔ تقسیم کے بعد بھی یہ دوستی قائم و دائم رہی۔ بیدی تو کبھی پاکستان نہ آئے، لیکن ڈاکٹر نذیر کا ہندوستان پھیرا لگتا رہا۔ دونوں کے درمیان محبت اور بے تکلفی کی نوعیت کیا تھی؟ اِس کا اندازہ ڈاکٹر نذیر کے بیٹے سیّد گل حمید کی ایک تحریر کے اِس ٹکڑے سے بخوبی ہو جاتا ہے:

''وہ اَپنے دوست راجندر سنگھ بیدی کو جب کبھی موقع ملتا، تلّے والی جوتی بمبئی پارسل کروا دیا کرتے۔ بیدی صاحب خط میں یوں رسید سے مطلع فرماتے: 'ڈاکٹر صاحب آداب، آپ کی جوتی ملی، سرِ تسلیم خم۔'

''بیدی صاحب سکھوں کے بہت سے لطیفے سناتے اور ڈاکٹر صاحب بارود خانہ لاہور کے اڑوس پڑوس میں آباد مراثیوں کے لطائف سے بیدی صاحب کو محظوظ کرتے۔ ایک موقع پر راجندر سنگھ بیدی نے اِن کی دعوت کی۔ ازراہِ تفنّن والد نے بیدی صاحب کو بتایا کہ ہم سب سیّد ہیں، کہیں ایسی ویسی چیز سے خاطر مدارت تو نہیں کر رہے۔ کہنے لگے: 'بھئی مَیں بیدی ہوں، اِس لیے نامعقول چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں۔' اِس پر والد نے بتایا کہ گورونانک صاحب کی اولاد بیدی کہلاتی ہے، اِس لیے یہ سکھوں کے سیّد ہوئے، چنانچہ یہ شریعت سے باہر نہیں جائیں گے۔ کھانے کے بعد والد کہنے لگے کہ ذرا بلراج ساہنی اور مجروح سلطان پوری کو دیکھ آتے ہیں۔ اِس پر بیدی صاحب نے اپنے ملازم کو آواز دی کہ 'میاں، ذرا میری دروپدی تو لانا۔' نوکر تلّے والی جوتی اٹھا لایا جو والد نے لاہور سے بھجوائی تھی۔ اُن کی حیرانی دیکھتے ہوئے بیدی صاحب خود ہی بتانے لگے کہ اُنھوں نے اِس جوتی کا نام دروپدی اِس لیے رکھا کیونکہ نہ صرف وہ بلکہ اِن کے سب برخوردار بڑے شوق سے اِسے زیرِ استعمال رکھتے ہیں۔ مہابھارت کی تاریخ میں دروپدی وہ عورت تھی جس نے ایک ہی وقت میں پانچ پانڈو بھائیوں سے شادی رچا رکھی تھی۔''

کنھیالال کپور نے لکھا ہے:

لاہور کا تصور کرتے ہی دل میں ایک ہوک سے اُٹھتی ہے اور بے اختیار زبان پر ناسخ کا یہ شعر آجاتا ہے ۔

وہ نہیں بھولتا، جہاں جاؤں
ہائے مَیں کیا کروں، کہاں جاؤں؟

تقسیمِ ہند کے بعد وہ موگا (بھارتی پنجاب) جیسی خشک اور علمی فضا کے اعتبار سے بے آب و گیاہ زمین پر آباد ہو گئے۔ اُن سے جب کوئی موگا جیسے بَن میں جا بسرام کرنے کی وجہ پوچھتا، تو وہ یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے:

''جب تک ہندوستان لاہور کا ثانی پیدا نہیں کرتا، میرے لیے ہندوستان کے تمام شہر اور قصبے برابر ہیں۔''

کنھیا لال کپور سے جب کوئی لاہور کا چکر نہ لگانے کی بابت پوچھتا، تو وہ اقبال کا یہ شعر سنا کر بات ٹال جاتے ۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا اِنتظار کر

مجتبیٰ حسین کے مضمون سے بھی اِس محبت کا پتا چلتا ہے جو کنھیا لال کو اِس شہرِ بے مثال سے تھی۔ اُن کے بقول:

''دروغ بر گردنِ راوی، لاہور سے محبت کا یہ عالم ہے کہ رات کو کبھی لاہور کی طرف پیر کر کے نہیں سوتے۔ کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ لاہور میں تھے، تو نہ جانے کس طرح سو جاتے تھے۔ سنا ہے کہ موگا میں بھی لاہور کے خواب دیکھتے ہیں۔ دہلی کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انارکلی کی ایک جھلک پر سینکڑوں کناٹ پلیس قربان کیے جا سکتے ہیں۔''

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور کنھیا لال کپور اگر تادمِ مرگ لاہور کا کلمہ پڑھتے رہے، تو اس کی ایک وجہ تو اس شہر کی فضا اور کھلا ڈُلا ماحول تھا جسے اِنھوں نے دیکھا، برتا اور اِن کی ذہنی پرداخت اِس میں ہوئی۔ دوسرے ادبی طور پر اِن کی شہرت کی بنا اِس شہر میں پڑی، ادیب کی حیثیت سے وہیں پروان چڑھے۔

''لاہور شہر''

(کتاب لاہور شہر کے صفحہ نمبر ۲۰ سے
لیا گیا ایک خوبصورت اقتباس)

اس کتاب سے کرشن، بیدی اور کنھیا لال کے داتا کی نگری سے جذباتی لگاؤ کا پتا تو چلے گا ہی، ساتھ ہی تقسیم سے پہلے کے اس کھلے ڈُلے، روادار اور کشادہ تہذیبی و ادبی ماحول کے نقوش بھی ملیں گے جو اس شہر کا خاصا تھے۔ ان مضامین کا بنیادی مقصد تو ان ناموروں کی لاہور سے محبت کا بیان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ لاہور کی اس منور فضا کا ذکر بھی در آیا ہے جس میں تخلیق کاروں کی بے مثل حوصلہ افزائی اور پزیرائی ہوئی۔ اور وہ تہذیبی تعاون میسر آیا جس کی نظیر برِّصغیر میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس دور کے بارے میں شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آرٹسٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اس کی تصدیق لاہور میں ہوتی ہے۔

یہ کتاب تین بڑے ادبا کی یادداشتوں ہی نہیں، دلچسپ واقعات اور حیرت انگیز معلومات کا خزینہ بھی ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور کاغذ بہترین استعمال ہوا ہے۔ اِس نادر ادبی و علمی دستاویز کو اپنے کتب خانے کی زینت ضرورت بنائیے۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث اِس کا معاوضہ پانچ سو روپے بہت معقول ہے۔ کتاب اِس پتے پر دستیاب ہے: قوسین، ۱-C/۱۲۴، فیصل ٹاؤن، لاہور۔ فون: ۰۴۲_۳۵۱۶۵۳۰۹

◆◆◆

ایک وقت تھا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلہ ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا کیونکہ وہاں کا ماحول، اساتذہ کی قابلیت اور تعلیمی معیار کا کوئی ثانی نہ تھا۔ سرکاری اسکولوں سے فارغ التحصیل طالبعلم جس جگہ جاتے، انھیں عزت اور محبت ملا کرتی۔ ان کا ایک رعب ہوا کرتا کہ فلاں انسان اتنے بڑے سرکاری ادارے سے پڑھا ہے تو یقیناً لائق فائق ہوگا۔ اس کی تعلیمی قابلیت پر کوئی شبہ نہ ہوتا۔ اب حالات انھی اسکولوں کے ایسے ہو چکے کہ رعب دبدبہ درکنار، سرکاری اسکول میں پڑھنے والے کا معاشرے میں نہ کوئی مقام نہ عزت نہ تعلیم کا وہ پہلے جیسا معیار۔ کوتاہی کہاں اور کس سے ہو رہی ہے؟ یہ ایک الگ سنجیدہ موضوع ہے جس پر حکمرانوں کو باقاعدہ سر جوڑ کر ایک ہونا ہوگا لیکن فی الحال ہم اس موضوع کو مصنف کے ہلکے پھلکے طنزیہ اور فکاہیہ انداز میں ان کی کتاب اسکول نگر ۲ میں پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

مصنف نے اس انتہائی سنجیدہ مسئلے پر اربابِ اختیار کی آنکھیں کھولنے کے واسطے انتہائی نرم و پُرلطیف انداز میں ان مسائل کی نشاندہی کی ہے کہ جو واقعتاً سرکاری اسکولوں میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے براجمان ہیں اور کوئی ان کا پُرسانِ حال نہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ زندگی کے حقائق بہت بھیانک ہیں اور مزاح اُمید کی ایک کرن ہے۔ کسی چیز یا انسان کی خامی اس کے سامنے سنجیدگی سے بیان کریں تو وہ ناراض ہوگا لیکن اگر وہی بات مزاح کے پیرائے میں لطافت اور مزاح کے ساتھ اصلاحی انداز اپناتے ہوئے کہی جائے تو اس کا اثر اور طرح سے ہوتا ہے اور بات بگڑتی نہیں بلکہ بعض اوقات بن جاتی ہے۔ سچ ہے جس معاشرے میں حسِ مزاح پائی جائے وہاں عدم برداشت اور نفرتوں کے رویے ماند پڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں جن باتوں کو ہنسی مذاق میں تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے وہاں ان باتوں پر ہتھیار اُٹھا لیے جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ہزار ہا کوششوں کے باوجود تعلیمی میدان میں دنیا سے پیچھے ہیں۔ اس میں حکومت، محکمہ، سرکاری ملازمین، پالیسیاں اور خود عوام سب برابر کے حصہ دار ہیں۔'' پہلے باب کے پہلے صفحے کو پڑھ کر قاری بے ساختہ مسکرا اُٹھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اسکول ایک متعین یا ایک چار دیواری میں محصور چند کمروں، برآمدوں، دفتر، کلاس روم، پلاٹوں اور میدان پر مشتمل جگہ کا نام ہے۔ یہاں چند ادھیڑ عمر اور کچھ نوعمر تقرر شدہ خواتین و حضرات بطور معلم صبح سویرے بادلِ نخواستہ تشریف لاتے ہیں.....''

اس مزیدار کتاب کا باقی حصہ مزید پڑھنے کے لیے ابھی دیا گیا نمبر ملائیں اور کتاب گھر منگوا لیں۔

نمبر برائے رابطہ

03336241960-03336518648

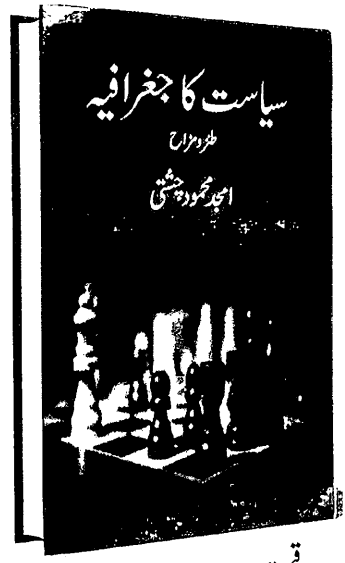

قیمت : -/500روپے

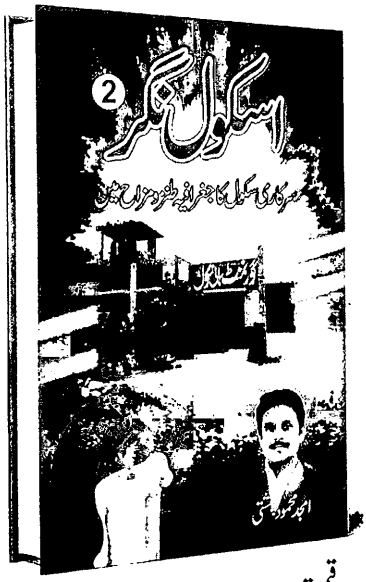

قیمت : -/70 روپے

شاعت : 2020

ناشر : ماورا پبلشرز لاہور

لمپوزنگ : طارق محمود

ابع : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

اپنے خوبصورت اشتہارات انتہائی مناسب قیمت پر **مصنف امجد محمود چشتی**

شائع کروانے کے لیے ابھی رابطہ کریں۔

0333-6241960

0333-6518648

0307-0060707

amjadchishti1237er@gmail.com

روی اور فحاشی کا سیل رواں ٹیلی ویژن، چینل کی نشریات، لچر بازی، مادر پدر آزاد معاشرے کی تعمیر کے معمار یہ ٹیلی ویژن چینل کس طرح نوجوانوں کو گمراہی میں مبتلا کر رہے اور شوشل میڈیا کا بے لگام گھوڑا سرپٹ دوڑتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی لگام ڈالنے کو تیار نہیں۔ نہ انھیں فکر ہے کہ یہ دلدل ہمیں کہاں لے جائے گی؟ اسلامی تعلیمات، نظامِ عدل وانصاف اور شریعت کی حدود سے ہی یہ گندگی صاف ہوگی ورنہ تو روز بہ روز بڑھتی چلی جائے گی۔ شنید ہے دھرنے کے شیدائی بھی فحاشی وعریانی سے نالاں اور اس کا سدّ باب کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ ہو عالم مگر کب اور کیسے؟

ابھی تو مہنگائی کا جن قابو میں نہیں آ رہا۔ سنا ہے ٹائیگر فورس کو یہ کام سونپا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک اس سے فائدے کے بجائے نقصان کا خدشہ ہے۔ اسے کنٹرول کرنے کے لیے حکومتی اداروں کا استعمال قرین انصاف ہے۔ مجموعی طور پر شمارے میں شائع ہونے والی کہانیوں میں کافی حد تک معاشرتی رویوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ہر کہانی اچھی لگی۔ ذوقِ سخن کی محافل منعقد ہوں تو کچھ حد تک معاشرتی رویوں میں مثبت تبدیلی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ شعر شاعری کے صفحات میں ہندوستان کے نامور شاعر راحت اندوری کی شاعری سے لطف بھی اُٹھایا اور بہترین انتخاب نے اپنا حق ادا کر دیا گو کہ شوشل میڈیا پر بھی مشاعروں کو دیکھنے سننے کا اتفاق ہوتا ہے مگر پرنٹ میڈیا کے ایسے مشاعروں میں شرکت کرنے کی اپنی لذت ہے جو اس سے محبت کرنے والے ہی جانتے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ بھی اُردو کی محبت میں مبتلا لوگوں کے لیے ایک نعمت ہے سو اس کے دامن سے وابستہ ہیں۔ شہداء کے ناموں کی فہرست دوبارہ شائع کرنے کا شکریہ۔ یہ نئے قارئین اور بچوں کے لیے مشعلِ راہ ہے اور ان کے لیے تاریخ بھی۔ (شیخ نذیر احمد، اسلام آباد)

☆☆☆

''کثرت نہیں برکت ضروری ہے''

ذرا سوچیں کہ کیا ہوا اگر ہماری زندگی میں کچھ بہت زیادہ نہیں؟ وہ برکتوں کا رب ہے اور زندگی میں برکت کثرت سے زیادہ اہم ہے۔ ہر انسان تخلیق کے ایک ہی طرح کے مراحل سے گزرتا ہے مگر ان میں سے بعض چند سالوں میں ہی کچھ ایسا کر گزرتے ہیں جس سے کئی لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ وہ لوگوں کی سوچ کو نیا رُخ دیتے اور اپنی شخصیت کے مثبت اثرات نہ صرف موجود لوگوں میں بلکہ آنے والی نسلوں میں بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کے سوچنے سمجھنے والے اذہان ان سے اخروٹ توڑنے کا عالمی ریکارڈ نہیں بناتے، بلکہ کچھ ایسا کروا دیتے ہیں جس سے وہ اپنی اور کئی انسانوں کی دنیا اور آخرت بہتر بنا سکیں اور کچھ لوگ ایسا نہیں کر پاتے۔ آپ جانتے ہیں کیوں؟

کیونکہ ان کی زندگیاں برکتوں سے خالی ہوتی ہیں اور ان کا زیادہ زور کثرت پر ہوتا ہے۔ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے بہت کثیر تعداد میں نہیں تھے، محض چند ہی تھے مگر رہتی دنیا کے تمام انسان انھی تھوڑے سے لوگوں میں سے ہی ہیں جو کشتی میں سوار ہوئے، جنھوں نے اپنا ایمان بچایا، جن کو اللہ کی پہچان عطا ہوئی، وہ اکثریت کے پیچھے نہیں چلے بلکہ سچائی کا راستہ اختیار کیا۔ جنھوں نے آخرت کو نتیجہ اور دنیا کو امتحان سمجھا۔ جب اللہ برکت دینے پہ آئے تو تھوڑی چیز میں بھی بڑے فائدے عطا ہو جاتے ہیں جب مویشیوں میں سے کئی فوائد والا دُودھ ملتا ہے تو اللہ سے ڈرنے والے اس میں بھی برکت کا پہلو ڈھونڈتے ہیں۔ غور وفکر کرتے ہیں۔ علم کا بھوکا کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے علم، عمل، الفاظ، مال اور پوری زندگی میں برکت عطا فرمائے۔ ہم اپنی صلاحیتیں ڈھونڈیں اور ان کو کام میں لائیں۔ بے فائدہ چیزوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ ہمیں سوچنے اور غور کرنے والے ذہن عطا ہوں۔ دعائیں دیں اور دعائیں لیں۔ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں۔ آمین۔ (ہادیہ امین، کراچی)

مایوسی کا علاج ہنسی!

بس دو چار سال اور.....

پطرس بخاری ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے۔ ایک بار مولانا ظفر علی خان صاحب کو تقریر کے لیے بلایا۔ تقریر کی ریکارڈنگ کے بعد مولانا پطرس کے دفتر میں آ کر بیٹھ گئے۔ بات شروع کرنے کی غرض سے اچانک مولانا نے پوچھا۔ ''پطرس یہ تانپورے اور تنبورے میں کیا فرق ہوتا ہے۔''

پطرس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر بولے۔ ''مولانا آپ کی عمر کیا ہوگی؟''

اس پر مولانا گڑبڑا گئے اور بولے۔ ''بھئی یہی کوئی پچھتر سال۔''

پطرس کہنے لگے۔ ''مولانا جب آپ نے پچھتر سال یہ فرق جانے بغیر گزار دیے تو دو چار سال اور گزار لیجیے۔''

☆☆☆

''ملک الموت کی چپت''

شوکت تھانوی ایک مرتبہ شدید بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ مرض میں سر کے سارے بال جھڑ گئے۔ دوست احباب عیادت کو آتے تو گنجے سر کو دیکھ کر پوچھتے کہ یہ کیا ہوا۔

شوکت تھانوی اپنے مخصوص انداز میں کہتے: ''ملک الموت آئے تھے، صورت دیکھ کر ترس کھا گئے لیکن جاتے ہوئے سر پر ایک چپت رسید کر کے چلے گئے۔''

☆☆☆

''بنگال میں بنگالیوں کی ہندی''

بنگال میں بنگالیوں کی ہندی اُردو کا جہاں تلفظ غلط ہوتا ہے وہیں جمع واحد اور تذکیر و تانیث کے اصول بھی بالکل الگ ہیں۔ مظفر حنفی کا جب کلکتہ یونیورسٹی میں تقرر ہوا تو کچھ عرصے بعد وائس چانسلر بھاسکر راؤ چودھری نے ان سے پوچھا:

''پروفیسر حنفی! آپ تو بنگلہ بول لیتے ہوں گے۔''

حنفی نے ہنس کر جواب دیا۔ ''جی سر! چائے کھابو اور جول کھابو کی حد تک۔''

''بنگلہ تو بہت آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔'' چودھری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے چودھری صاحب۔'' حنفی صاحب نے کہا:

''لیکن میرے پاس وقت ہی کہاں ہے۔ میں تو چوبیس گھنٹے اپنی اُردو بچانے میں لگا رہتا ہوں۔

☆☆☆

''تراجم کی مزید اردو دنیا''

صحافتی دنیا میں اکثر پُرمزاح واقعات کا تعلق ترجمے سے ہوتا ہے۔ ایسے ہی دو ترجمے دنیا نے بھی دیکھے۔ چارلس ڈکنس کی مشہور کتاب ''اے ٹیل آف ٹو سٹیز'' پر فلم بھی بنی تھی۔ اس کتاب کا ترجمہ اخباروں کے اشتہارات میں کچھ یوں تھا۔

''دو شہروں کی دُم۔''

اسی طرح چند سال پہلے پرویز مشرف کی کتاب ''ان دا لائن آف فائر'' پر بمبئی کے ایک اخبار میں تبصرہ شائع ہوا۔ تبصرہ نگار نے کتاب کے عنوان کا ترجمہ ''آگ کی قطار'' میں کیا تھا۔

کلکتہ کے لوگوں کو ایک وقت بھات نہ ملے تو جی لیں گے مگر ایک دن فٹ بال میچ نہ ہو تو جان دے دیں گے۔ کسی زمانے میں وہاں تین ٹیمیں بہت مضبوط تھیں: مسلمانوں کی محمڈن سپورٹنگ، ہندوؤں کی موہن بگان اور دونوں کی ایسٹ بنگال۔ ایک بار محمڈن کے ایک کھلاڑی نے موہن بگان کے خلاف لگاتار تین گول کر دیے۔ کھیلوں کی اصطلاح میں ایسی انفرادی کامیابی کو ہیٹ ٹرک (Hat Trick) کہا جاتا ہے۔ دوسرے روز ایک موقر روزنامے کے کھیل کے نامہ نگار نے ہیٹ ٹرک کے ترجمہ کے ساتھ خبر دی:

''محمڈن کے کھلاڑی نے ٹوپی کا کرتب دکھایا۔''

☆☆☆

''بروقت لاجواب کیا''

مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کو اپنی بیٹی زیب النساء کے لیے اُستاد درکار تھا۔ یہ خبر سن کر ایران اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بیسیوں قادر الکلام شاعر دہلی آ گئے کہ شاید قسمت یاوری کرے اور وہ شہزادی کے استاد مقرر ہو جائیں۔ ان دنوں دہلی میں اس زمانہ کے نامور شاعر برہمن اور میر ناصر علی سرہندی بھی موجود تھے۔ نواب ذوالفقار علی خان، ناظمِ سرہند کی سفارش پر برہمن اور میر ناصر کو شاہی محل میں اورنگزیب کے رُوبرو پیش کیا گیا۔ سب سے پہلے برہمن کو اپنا کلام سنانے کا حکم ہوا۔ برہمن نے تعمیلِ حکم میں جو غزل پڑھی، اس کا مقطع تھا۔

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازم برہمن آوردم

(میرا دل اس قدر کفر آشنا ہے کہ میں جب بھی کعبہ گیا، برہمن کا برہمن ہی واپس آیا۔)

گو یہ محض شاعرانہ خیال تھا اور تخلص کی رعایت کے تحت کہا گیا تھا لیکن عالمگیر انتہائی پابند شرع اور سخت گیر بادشاہ تھا۔ اس کی تیوری چڑھ گئی اور وہ برہمن کی طرف سے منہ پھیر کے بیٹھ گیا۔ میر ناصر علی نے اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے اُٹھ کر عرض کی کہ جہاں پناہ اگر برہمن مکہ جانے کے باوجود برہمن ہی رہتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ شیخ سعدیؒ بھی تو یہی کہہ گئے ہیں

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

(عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ بھی چلا جائے وہ جب واپس آئے گا، گدھے کا گدھا ہی ہوگا۔)

عالمگیر یہ شعر سن کر خوش ہو گیا اور برہمن کو معاف کر دیا۔

☆☆☆

''منحوس باتیں نہ کریں''

ساس اور بہو دروازے پر کھڑی تھیں۔ بیٹا ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ ساس تشویش سے بولی:

''اے بہو! مجھے تو لگتا ہے اس نے کہیں دوسری شادی نہ کر لی ہو۔''

بہو دہل کر بولی:

اُف اماں! اتنی منحوس باتیں تو نہ کریں۔ ہو سکتا ہے بے چارہ ایکسیڈنٹ میں مر گیا ہو۔''

◆◆◆

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com